آج

۶۸

ذکیہ مشہدی
سنیل گنگوپادھیائے
شنکھ گھوش

نِلنجن ہاجرا
زاہد امروز
انیس اشفاق

اخلاق احمد
معظم شیخ
خالد طور

ترتیب:

اجمل کمال

Scanned with CamScanner

Scanned with CamScanner

ترجمے:

افضال احمد سید

تخمین باجرا

شائستہ فاخری

۶۸

آج

ترتیب: اجمل کمال

آج

ادبی کتابی سلسلہ شمارہ 68

اکتوبر 2010

سالانہ خریداری:

پاکستان: ایک سال (چار شمارے) 600 روپے (بشمول ڈاک خرچ)

بیرون ملک: ایک سال (چار شمارے) 70 امریکی ڈالر (بشمول ڈاک خرچ)

رابطہ:

پاکستان: آج کی کتابیں، 316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400

فون: 35213916 35650623

ای میل: ajmalkamal@gmail.com

دیگر ممالک:

Dr. Baidar Bakht, 21 White Leaf Crescent, Scarborough,
Ontario M1V 3G1, Canada.
Phone: (416) 292 4391Fax: (416) 292 7374
E-mail: bbakht@rogers.com

ترتیب

ذکیہ مشہدی

7

ماں

20

بدّو کا ہاتھی

30

فضلو بابا ٹچ ٹچ

39

تھوڑا سا کاغذ

48

منظوروا

59

محمود و ایاز

87

گلی سرمست میں رمضان

96

لپاگو

سنیل گنگوپادھیائے

109

کیرتی ناشا کے دو کنارے

شنکھ گھوش

147

یہ دریا اکیلا   جسم   زرہ بکتر

بلا عنوان   مدہوش   چھلکے

پانی   بھیڑ   پتھر   جوانی

ایک بیگر دوست کو خط   باؤل

نلنجن ہاجرا

156

نظمیں

❁

زاہد امروز

163

غیر متوقع بچے کی متوقع موت

تم مسجد کے سائے میں سوکھ جاؤ گے

شہری روشنیوں میں وحشی خواب

Scanned with CamScanner

ڈوبتا سورج اور خالی قبر
رات اور چاند کی سنگت میں
قطب شمالی کا موسم سرما

انیس اشفاق
172
اعراف

اخلاق احمد
191
مارش کوارٹرز کا ماسٹر

معظم شیخ
206
بلّو

خالد طور
214
سکائی لیب

Scanned with CamScanner

305
ہاں گمن
320
انتظار خواب

Scanned with CamScanner

ذکیہ مشہدی

ماں

ٹھنڈی ہوا کا جھونکا ہڈیوں کے آر پار ہو گیا۔

کڑاکے کا جاڑا پڑ رہا تھا، اس پر مہاوٹیں بھی برسنے لگیں۔ پتلی ساڑی کو شانوں کے گرد کس کر لپیٹے ہوئے منّی کو خیال آیا کہ اوسارے میں ٹاپے کے نیچے اس کی چاروں مرغیاں جو دبک کر بیٹھی ہوں گی، ان پر ٹاپے کے سانکوں سے پھوار پڑ رہی ہوگی۔ بیمار پڑ کر مر گئیں تو دوبارہ خریدنا بہت مشکل ہوگا۔

کپکپاتے ہاتھوں سے اس نے ٹٹر ہٹایا اور باہر آ گئی۔ بارش نے جیسے ہر طرف باریک ململ کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ سورج پہلے ہی کئی دن سے نہیں نکلا تھا، اس پر یہ چادر۔ پھر اسے اپنی بیوقوفی کا احساس ہوا۔ دن تاریخ مہینے تو ویسے بھی اسے کم ہی یاد رہا کرتے تھے، اب صبح شام بھی بھول چلی تھی کیا؟ اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ سورج نکلا بھی ہوتا تو کیا اب تک بیٹھا رہتا! رات تو آ ہی گئی تھی۔ ہاں پہلے ہی پہر ایسی اندھیری اور اداس نہ ہوتی شاید۔ اس نے ٹاپا اٹھا کر مرغیوں کو دبوچا۔ ڈرے سہمے پرندوں نے کوئی صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔ بازو میں چاروں مرغیاں اور بغل میں ٹاپا دبا کر وہ مڑ ہی رہی تھی کہ اچانک دور پھوار اور اندھیرے کے دوہرے پردے کے پیچھے سے کوئی ہیولا ابھرتا محسوس ہوا۔ اس کے ساتھ ہی ایک چنگاری سی بھی چمکی۔ ذرا سی دیر کو اسے لگا، اگیا بیتال ہے۔ لیکن اگیا بیتال ہندو ہوا تو مرگھٹ میں اور مسلمان ہوا تو قبرستان میں، آنکھیں مٹکاتا، لوگوں کو راستہ بھلاتا گھومتا ہے۔ زندوں کی بستی میں اس کا کیا کام! وہاں اپنے اگیا بیتال بہتیرے ہیں۔ منّی ڈری نہیں، اور ڈرتی وہ تھی بھی نہیں۔ رات کے سناٹے میں ہر ہر کرتی گنگا کے درمیان پھیلے پڑے

ڈیرا[1] کے اس علاقے میں وہ تنہا زندگی گزار رہی تھی۔ اور لوگ رہتے تو تھے لیکن جھونپڑیاں دور دور تھیں؛ درمیان میں کھیت تھے یا سبزیوں کے وسیع و عریض قطعے۔ شام پڑے سیار ہُواں ہُواں کرتے۔ مرغیوں کے فراق میں لومڑیاں دروازے پر کھسر پسر کرتیں۔ کبھی آنگن میں لگے امرود کے درخت سے سل سل کرتا ہرا ہرا سانپ رسی کی طرح نیچے لٹک آتا اور گردن اٹھا کر اپنی ننھی ننھی، چیکیلی، بس بھری آنکھیں منی کی آنکھوں میں ڈال کر اسے گھورتا، لیکن ڈرانے میں کامیاب نہ ہوتا۔ وہ پاس پڑی لکڑی اٹھا کر اسے دھمکاتی، ''ارے اب کیا لے جائے گا رے؟ ہرسیا سے زیادہ زہر ہے کیا تجھ میں؟'' منی کے حساب سے اس کا آٹھ سالہ پولیو زدہ لڑکا اور پانچ پانچ سال کی دونوں جڑواں، مریل لڑکیاں سانپ کے کسی کام کے نہ تھے۔ تینوں بچوں کو چوزوں کی طرح پروں تلے دبا کے وہ بڑی طمانیت سے اپنی اور ان کی روزی روٹی کی فکر میں غلطاں گھومتی رہتی۔

صبح چار بجے تڑکے، جب سورج نکلا بھی نہ ہوتا اور گرمیوں میں سرکتی رات کے ملگجے اندھیرے یا جاڑوں میں کہرے کی دبیز چادر میں لپٹی گنگا سوئی ہوئی ہوتی، مچھوارے اپنا اپنا جال نکالتے تھے اور ان کی ناویں تڑپتی مچھلیوں سے بھر جایا کرتی تھیں۔ تب اور لوگوں کے ساتھ منی بھی اپنا ٹوکرا لیے پہنچتی اور مچھلیاں بھر کر حساب چکتا کرتے، آٹھ بجتے بجتے پار جانے والی ناؤ پکڑ کر شہر پہنچ جاتی۔ سر پر ٹوکرا اٹھائے محلے محلے مچھلی بیچ کر کوئی دو ڈھائی بجے تک لوٹ آتی۔ راستے سے ضرورت کا سودا سلف بھی اٹھا لیتی۔ کبھی کبھار ایک آدھ مچھلی بچ جایا کرتی تھی۔ منافع ہوتے ہو، جمع نکل آئے، یہ سوچ کر وہ اکثر بچی ہوئی مچھلی بہت کم داموں میں ہرسیا کو بیچ دیا کرتی تھی۔ گھاٹ سے اترتے ہی ہرسیا کا چائے کا کھوکھا تھا۔ وہ آتے جاتے اسے چھیڑتا، مفت کی چائے آفر کرتا، لیکن مچھلی کے دام اس نے کبھی پورے نہیں لگائے۔ جانتا تھا، مچھلی ٹکنے والی چیز نہیں اور منی جیسے غریب بیوپاری میں نقصان اٹھانے کا بوتا نہیں ہوتا۔ چائے کے کھوکھے کی آڑ میں پکی کے ساتھ تلی مچھلی بیچنے والا وہ ان پڑھ کسی ملٹی نیشنل کمپنی کے بزنس ایگزیکیٹو سے کم سیانا نہ تھا۔

منی ذات کی ملاح نہیں تھی لیکن پچھلے بارہ تیرہ سال سے ڈیرا میں اپنی اسی جھونپڑی میں

---

[1] ڈیرا کسی دریا کے درمیان ابھر آنے والی خشکی کو کہتے ہیں جو کم و بیش مستقل ہوتی ہے۔ گویا ایک ایسا جزیرہ جو سمندر میں نہ ہو کر دریا میں ہو۔

رتے اور شوہر سے محروم ہو جانے سے پیشانی ابھرے ہوئے رخساروں اور ہاتھوں کی جھریوں نے مدت ہوئی
چہرہ مسخ کر دیا تھا۔ یہ دھندلی آنکھیں ان میں وہ پیار نہیں آتی تھی۔ اسے نگاہوں سے پہلے کی سی
عقیدت اور محبت تھی۔ ان کے [illegible] میں رہتے ہوئے [illegible] اس نے سوچا تھا [illegible]
روزی روٹی کا ذریعہ تھی [illegible] تھی۔ ہتھوڑا اس سے زیادہ [illegible] سے جو پہلے [illegible] خریدی
تھیں [illegible] کا پیشگی کا [illegible] صرف اس لیے [illegible] تھا کہ [illegible]
ساتھ بھی [illegible] تھی۔ اس کی یاد [illegible] میں سو رہی تھی۔ شادی کے پہلے سال ہی پیدا ہوا
تھا۔ زندہ ہوتا تو آج اتنا بڑا ہوتا گیارہ بارہ برس کا ہو جاتا۔

[illegible] ہوا کے [illegible] میں چھید بنا [illegible] کی محسوس ہو [illegible] اسے [illegible]
تھیں ٹھنڈ پر حاوی ہو گئیں۔ [illegible] کرتے [illegible] میں [illegible] کو [illegible] بستہ ہواؤں کے
سیاہ [illegible] میں ایک لے تھے۔ [illegible] تھا جو [illegible] کھٹکھٹا رہا تھا؟

ایک چنگاری بھی چھوٹی۔ [illegible] ''قریب آتی روشنی نے اس کا سامنا کر لیا۔

وہ مڑ بڑی [illegible] بغل میں دبے ناپ اور دوسرے بازو میں [illegible]
باہر نکل آئی اور انہیں دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی۔

''آپ؟ اس وقت یہاں؟ اندر آجائیے مالک، بڑی ٹھنڈ ہے۔''

[illegible] قد اور سلے پتلے جسم پر انھوں نے حسب دستور ڈھیلی پتلون [illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] کی موٹی [illegible] قمیص تھی اور سر پر [illegible] تھا۔ [illegible]
(ورکشاپ میں اس سے زیادہ [illegible] لوگوں کے پاس نہیں تھی)۔

''[illegible] میں رات کاٹنے کی اجازت چاہیے۔ [illegible] صبح نکل جاؤں گا۔'' وہ مسکرائے لیکن
[illegible] مسکراہٹ کی نہیں [illegible] بجتے دانتوں کی آہٹ تھی۔

''اندر آجائیے مالک۔''

''اندر؟'' وہ ذرا سا ہچکچائے۔

''ہاں مالک۔ یہاں برآمدے میں تو بڑی ہوا ہے۔''

وہ پیچھے پیچھے چل پڑے تو اسے محسوس ہوا اس کے گھر میں فرشتوں کے قدم [illegible] میں [illegible]

ماں ایک سائبان کی شکل اختیار کر کے ان کی جھونپڑی میں آ تی تھی... بے نصیب۔ اس نے بانس
ایک کونے میں رکھ کر مرغیوں کو جلدی جلدی ان کے نیچے دھکیلا اور بوری سے امرود کی خشک
ٹہنیاں، پتے اور جھاڑ پٹے نکالے تھی۔

”کچھ درست کر دو منی۔ بس رات کے لیے چھت چاہیے تھی۔ اب اور نہیں چلا جا رہا تھا۔“ وہ
بے حد تھکے ہوئے لگ رہے تھے۔ انھوں نے کندھے سے لٹکا ہوا تھیلا اتار کر طاق میں رکھی،
وہیں مٹی کے فرش پر لٹکے درخت سے دھپ سے بیٹھ گئے۔

”آپ کچھ مت بولیے۔“ منی کا جی بھر آیا۔ ”ہمارے پاس جو ہے وہی تو دے سکیں گے۔ نہ
اس سے کم، نہ اس سے زیادہ۔“ اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ وہ خاموش ہو گئے۔

”مالک، کپڑے بھیگ گئے ہیں۔“ چٹو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہی اس نے کہا۔ اس کی پشت
ان کی طرف تھی۔

منی کے پاس کپڑے کہاں ہوں گے جو وہ بدل سکیں، اس لیے انھوں نے اس کی بات ان سنی
کر دی۔ حالانکہ اس وقت خشک کپڑوں، خشک جسم اور ہوا سے محفوظ خشک جگہ سے زیادہ ایسا کچھ نہ
تھا جسے جنت کا نام دیا جا سکے۔ (ہر شخص کی جنت اس کی اپنی ہوتی ہے، اور موقع محل کے اعتبار سے
ہوتی ہے شاید۔)

”میرے پاس میرے پتی کی ایک دھوتی رکھی ہوئی ہے۔“ ان کی خاموشی کا مطلب بھانپ کر
اس نے کہا۔

”تب تو ٹھیک ہے۔ صبح تک میرے کپڑے سوکھ گئے تو اسے چھوڑ جاؤں گا۔“ انھوں نے
رضامندی ظاہر کی۔ منی خوش ہو گئی۔ اس نے گھر کے واحد کمرے کی کارنس پر رکھا ٹین کا بکس اتارا۔ یہ
بکس اس کا شوہر پٹنہ کے سوموار کی میلے سے لایا تھا، اور اس میں رکھ کر دیا تھا اس کے لیے لال پھولوں
والی ساڑی۔ منی اب لال پھولوں والی ساڑی نہیں پہنتی تھی۔ اسے شوہر کی واحد دھوتی کے ساتھ
سنبھال کر رکھ دیا تھا۔ اسے تو بس پہنے گی لنگڑے سے شادی کرنے کی ہمت کرنے والی اس کی
بہو۔ وہی اس کی اصل حقدار ہوگی۔

اس نے جلدی سے دھوتی نکال کر بڑھا دی۔ انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ دھوتی انھیں تھما کر وہ پھر اندر چلی

ان کے کپڑے اتار کر انھوں نے سکھا دیے۔ خشک دھوتی لا کر دی جو انھوں نے اپنے جسم پر لپیٹ لی۔ اب وہ پہلے جیسے خطرناک نظر نہیں آ رہے تھے۔ دھوتی پہنے ان کے چہرے پر شرمندگی کی مسکراہٹ ابھر آئی۔

گاڑھے کی دھوتی سے بڑی راحت پہنچی۔ گیلے کپڑوں سے نجات پانے کے بعد ان کے چہرے کا شکر الفاظ سے پرے تھا۔

"خدا اس نیک دل عورت کا بھلا کرے۔" انھوں نے دل ہی دل میں دعا کی۔

دعا تو اس کے مجموعے میں سب سے بڑی تھی، ورنہ محبت بھی، لیکن فی الحال پیٹ بھر پانا ... بیماریوں اور بھوک میں ، منی کے شوہر کی وہی بو باقی تھی جسے پولیس پکڑ کر لے گئی تھی کسی کی اس مخبری پر کہ وہ میاں سے کٹے کی اسمگلنگ میں شامل ہے۔ واقعی تو بڑی بات ، ساڑھے پانچ سال کا طویل وقفہ گزر جانے کے بعد بھی تک پتا نہیں چلا تھا کہ وہ کہاں ہے، کس حال میں ہے، ہے بھی یا نہیں۔ منی کبھی سوچتی ہے کہ انھوں نے کس طرح ساڑھے ڈیڑھ سال تک اس کے شوہر کا پتا لگانے کے لیے ان کو دن، دن رات کو رات نہیں سمجھا تھا۔ آخر منی سے ہی ان سے کہنا پڑا تھا، "انھوں، اب ہم نے صبر کر لیا، آپ بھی چھوڑ دیجیے۔ ہمارے جانے میں سب سے بڑا دکھ تو ہو گا آج کل ہے۔ نہیں جو وہ جانتے ہمارا استعداد پوچھتے ہوتا تو کوئی کیا کرے گا۔"

شوہر کی گرفتاری کے پہلے سے ہی اس کا پیٹ بھی کا مسئلہ در پیش رہا کرتا تھا۔ اب شوہر کے جانے سے جو مصیبت آئی، اس میں اس کی بیماری کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ تب منی کہیں زیادہ نہیں جا سکتی تھی۔ ایک دن وہ اس کے دروازے پر آ گئے۔ کسی نے انھیں بتایا کہ اس گھر میں ایک بیمار بچہ ہے۔ بچے کو دیکھ کر وہ کچھ فکر مند ہو گئے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانا بہت ضروری تھا، لیکن ڈاکٹر صرف مدد کو نہیں گئے۔ اس دن تعداد کی تھی۔ اس بچے کو دوا کے ساتھ غذا کی بھی سخت ضرورت تھی۔ خالی دوا سے کچھ نہ ہو گا، انھوں نے تاسف سے سوچا۔ انتہائی کمزور ہوتے ہوئے بچے کو دودھ میں پیسے سو ہاتھ منی ان دنوں دو وقت بھر پیٹ کھانا تک مہیا نہیں کر پاتی تھی۔ جڑواں بچیاں اس سے پیٹ میں تھیں۔ انھوں مصیبت ختم ہو رہا تھا۔ وہ کوئی کام نہ کر پاتی۔ خود سے بھی پہلے غذا کی ضرورت تھی لیکن وہ دونوں بچوں، خاص طور پر بیمار بچی کے بیمار ہونے سے پاگل سی رہتی۔

کسی میں مدد و چار آدمیوں کا شخص نے … محمد سے بچے، ہسپتال سے … کی حالت صورت ہے۔" پھر ہاتھوں سے کندھے سے لٹکا جھولا … (وہی جھولا جو ہمیشہ ان کے کندھے سے لٹکا رہتا تھا اور آج بھی لٹکا ہوا تھا)۔

"یہ رکھو۔" جھولے میں ہاتھ ڈال کر انھوں نے چار نوٹ، دو سکے اور کچھ … ہیں۔ یہ تیرے گاؤں میں دو لوگ ایک ٹوٹوں سے انھیں دیے تھے۔ وہ سب سے سب تمھارے لئے ہوئے ہیں۔ یہ عقیلہ دیکھ کر ان کے زرد چہرے اور بجھی آنکھوں میں جو چمک سی آ گئی تھی اسے منی کبھی نہیں بھول سکی۔ جب بھی اس نے چاہے کا غم ستاتا تو وہ مسرت کی وہ چمک یاد کر لیتی تو دل پر ٹھنڈی ٹھنڈی پھوار پڑ جاتی۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں میں اس کا بچہ بہت خوش تھا۔ وہ اس بات سے خوش خوش رہتا تھا۔ اس نے پیٹ میں کھانا تھا، وہ بھی اچھا کھانا۔ بدھ کے دن جب وہ … آئے تو ان کی رنگت ہوائیں اڑ رہی تھیں اور … جسم خاک کی گرد … پانیوں میں گم ہو چکا تھا۔ لیکن منی نے ان کے قدموں پر اپنا سر رکھ دیا۔" اس نے بڑے چاہت اور ادب سے کہا … اپنا ہاتھ بڑھا کر … چھوٹے کو بھی دیں۔ سب آپ کی کرپا تھی۔ وہ چہرہ جاتا تو ہم جیتے جی مر رہتے، تڑپتے رہتے۔" اس کے آنسوؤں نے ان کے پیر بھگو دیے۔ ایسی سخت گرفت تھی کہ ان سے … چھڑانے پر بھی وہ اس وقت تک نہیں اٹھی جب تک ان کا دل ہلکا نہیں ہو گیا۔

تب ہی انھیں منی کے شوہر کے بارے میں پتا چلا تھا۔ کہیں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مر … سے کی تکرار کے سبب اس نے اس کے خلاف مخبری کی تھی۔ جھوٹی یا سچی، یہ معلوم ہونا مشکل تھا۔ نیپال سے تیندو کی پتیوں اور کتھے کی اسمگلنگ بہت عام تھی۔ ہو سکتا ہے وہ صرف موٹر بوٹ چلاتا رہا ہو اور اسے مال کا علم نہ رہا ہو، ہو سکتا ہے ملوث رہا ہو۔ جو بھی ہو، وہ ایک بہت ہی چھوٹی مچھلی تھا جسے بڑی مچھلیاں نگل گئی تھیں۔ اس سلسلے میں انھیں کامیابی نہیں مل سکی لیکن منی احسان مند تھی۔ کسی نے ان کے بارے میں سوچا تو۔ کچھ کیا تو۔ اس نے دوسرے بچے کو … ہو گیا تھا۔ وہی تھے جو اسے اسپتال لے گئے، آپریشن کرایا۔ اسپتال سے اسے … جوتا … کر دیا گیا جس کا فریم گھٹنے تک تھا۔ وہ لنگڑاتا اب بھی تھا لیکن پہلے سے بہت بہتر ہو گیا تھا۔ پہلے تو وہ جس طرح چلتا تھا اسے دیکھ کر کسی کریہہ صورت، رینگنے والے جانور کی یاد آتی تھی۔ منی کا دل ڈوب جاتا تھا۔ کئی … سے خیال آتا تھا

[illegible] وہ ان کا بیٹا [illegible] تو ان [illegible] بیٹا تھا۔ [illegible] سام چھ [illegible] ان کی کوششوں سے اب وہ اس لائق تھا کہ اپنے سارے کام آسانی سے کر سکے۔ جلد ہی وہ اسے کسی دکان میں بٹھانے کی سوچ رہی تھی۔

لڑکا جب [illegible] ہوتا تھا۔ اس وقت بھی منی نے [illegible] اس زمانے میں نہیں تھے۔ ہوتے بھی تو ان کے متعلق اس کے ذہن میں نہیں تھے۔ [illegible] کسی انسان کو [illegible] کام کرتے ہیں۔ وہ شخص جنہیں [illegible] کا روپ۔

تسلے میں آگ روشن ہو گئی تھی۔ وہ اسے ان کے پاس لے آئی۔ پھر ایک بڑے سے [illegible] میں دو گلاس پانی [illegible] آنگن میں لگے تلسی کے پودے سے [illegible] پتیاں اور [illegible] کالی مرچ [illegible] ڈال کر [illegible]۔ پانی خوب [illegible] تو اس نے [illegible] گلاسوں میں [illegible] اور اپنا گلاس لے کر خود بھی وہیں بیٹھ گئی۔ [illegible] پستہ قد [illegible] شعلوں کی روشنی میں چاندی کی طرح [illegible]۔

مالک بڑا کارساز ہے۔ منی کی [illegible] رستے میں نہ ہوتی تو وہ [illegible] اس وقت [illegible] صرف ایک [illegible] تھی۔ خالی پیٹ میں توانائی [illegible] اور [illegible] میں [illegible] بھری تلسی اور کالی مرچ کی چائے [illegible] ایک نعمت [illegible] تھی۔

"جا کے سو جا منی۔ رات بہت ہو چلی ہے۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔

"سب لوگ آپ کے بارے میں بہت باتیں کرتے ہیں۔ کبھی من ہوتا تھا ہم آپ کے پاس بیٹھیں۔"

"معلوم ہے۔ اور لوگ کیا باتیں کرتے ہیں، یہ بھی معلوم ہے۔" وہ مسکرائے۔

"کیا معلوم ہے؟"

"میں سوالوں کے جواب دیتے دیتے تھک گیا ہوں۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی انسان [illegible] ہوتے ہی سارے [illegible] پوچھنے لگتے ہیں۔ تم بھی سب پوچھنا چاہتی ہو گی کہ میں [illegible] سے آیا ہوں، میرا گھر کہاں ہے، گزارہ کیسے چلتا ہے، یہاں کیوں رہتا ہوں [illegible]"

منی نے سادہ لوحی سے سر ہلایا۔

وہ ہنس پڑے۔ "چھوڑو، تم بھی سن لو۔ میرے ماں باپ اب نہیں رہے۔ جب میں یہاں آیا تو تب تھے۔ بھائی بہن ہیں، دوست احباب تھے۔ لیکن میں ان سب کو بہت دور چھوڑ آیا ہوں۔" انھوں نے قدرے توقف کیا۔ ایک عجیب بات تھی۔ امیدوں کے چراغ روشن ہیں، مستقبل کے خواب بیٹی میں نے اس کی دیا تھا، بیاہ کر دی۔ اسے بھی چھوڑ آیا۔ لیکن یہ انھوں نے کسی سے کہا نہیں اور بات کا سرا پھر پکڑا۔

"دوست باری باری مجھے کچھ پیسے بھیجتے رہتے ہیں۔ ان سے میرا گزر ہو جاتا ہے دوسروں کی مدد کے لیے کچھ بچا لیتا ہوں۔ میں کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتا، پھر بھی کبھی بھوکا نہیں سوتا ہوں۔ تم میں سے بھی جن لوگوں کے پاس کچھ ہے اور وہ مجھے دینا چاہتے ہیں تو لینے سے انکار نہیں کرتا۔ کبھی کوئی گوالا ایک لوٹا دودھ تھما دیتا ہے تو کوئی گرہست کلو آدھ کلو سبزی۔"

"وہ تو آپ دوسروں کو بانٹ دیتے ہیں۔"

"جو مجھے ضرورت سے زیادہ ہوتا ہے یا مجھے درکار نہیں ہوتا، بس وہی۔ اب ابھی تمھاری تسی لی چائے کی سخت ضرورت تھی۔ وہ میں کسی کے ساتھ بانٹتا؟" انھوں نے بچوں جیسی معصوم اور شریر مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ منی نے سر ہلایا۔ اس کی ضرورت سے زیادہ ان کے پاس کیا ہوتا ہے اور کب ہوتا ہے؟ ابھی کوئی آ جائے تو آدھی چائے تو اسے پلا ہی دیں گے۔

"آپ... آپ کا پریوار؟"

"میرا پریوار تم لوگ ہو۔ آس پاس کے چاروں گاؤں میرا پریوار ہیں۔"

"بال بچے پیچھے چھوڑ آئے؟"

"میرا کوئی بال بچہ نہیں۔"

"عورت؟"

"عورت نہیں ہے، اسی لیے بال بچے بھی نہیں ہے۔ مگر ان گاؤں کے، جہاں میں کام کرتا ہوں، سارے بچے میرے بچے ہیں۔ تمھارے بچے بھی منی۔"

منی کے تینوں بچے جھونپڑی میں بیٹھے گہری نیند سو رہے تھے۔ اس کا جی بھر آیا۔ جب وہ خاموش رہی۔ وہ زیادہ پاگل ہو گئی تھی۔ کسی چڑیل کی طرح ہنسیں، بھاگی، باتیں کرتی

ماں کی باتوں میں لہروں کے مختصر وقفے تو رہتے۔ ’’ہاں ٹھنڈی تو ہو گی۔ بڑی ٹھنڈ ہے‘‘ کہہ کر وہ کچھ دیر خاموش رہی۔ اس نے پھر آنکھیں اٹھائیں۔

’’تو آپ نے بیاہ کیا ہی نہیں؟‘‘

’’منی، آج تم اتنے سوال کیوں کر رہی ہو؟‘‘

’’آج ہی تو آپ کے ساتھ بیٹھنے کا موقع ملا ہے، مانک دا۔‘‘

’’منی، مدہوا، مجھے مانک کہہ کر مخاطب نہ کیا کرو،‘‘ وہ قدرے جھنجھلا کر بولے۔ ’’ہاں، میں نے بیاہ نہیں کیا۔‘‘ جواب دے ہی دیا ورنہ یہ بیوقوف مچھوارن باتیں چاٹتی رہتی۔ ان کا لہجہ معمول کے مطابق نرم اور پُرسکون تھا۔

تو عورت کا سکھ انھوں نے کبھی نہیں جانا اور نہ جانے کون وں سے سکھ کہیں جاتے۔ بیوقوف مچھوارن نے سوچا۔ ماسٹر کی ٹوٹی جھونپڑی میں اکیلے رہتے ہیں۔ ایک ٹنکی میں آٹا اور چاول ساتھ باندھ رکھتے ہیں۔ پکی تھوڑی خود ہی بناتے، اپنے کپڑے خود دھوتا۔ سائیکل کو جھاڑ کر صاف رکھتے۔ اچھے دنوں میں ضرور ان کے پاس موٹر ہوگی، صورت سے ہی بڑے گھر کے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہاں تھا ایک بار اکیلے بڑے بخار میں جل رہے تھے۔ مچھلی سے ان کا کیا۔ پورے گاؤں کے مسلمانوں کے یہاں کا لڑکا تھا۔ وہ مچھلی اٹھا لے گیا۔ سنا ہے اس نے کہا تھا اگر میں مر جاؤں تو کوئی پریشان نہ کرنا۔ جو کپڑے پہنے ہوں، انھیں میں لے جا کر میری جھونپڑی میں گاڑ دینا۔ وہاں ایک کاپی پڑی رہتی ہے۔ ہو سکے تو اس میں لکھے پتے پر خبر کرا دینا۔ اور اس کی بیوی کے شوہر نے بھی کسی کو اپنا پتا دیا ہوگا؟

شوہر کو یاد کرتے اس کے دل میں ٹیس اٹھی — ٹیک ہے تم نہیں۔ وہ جب آتا تو منی کھانا تیار کر کے رکھتی، ایک کونے میں پانی نکال کر دیتی۔ اس کے سامنے تو تنگی نہیں تھی۔ روکھا سوکھا ہی، لیکن دونوں وقت بھر پیٹ مل جایا کرتا تھا۔ پھر رات میں دل کے بستر میں موٹی چادر تلے کا سوتی تھی۔ پتا نہیں وہ اب اس دنیا میں ہے بھی یا نہیں۔ اس کی موت کی اطلاع دینے کے لیے کسی کے پاس شاید کوئی پتا نہ تھا۔ مگر جب اس کے پاس تھا، بہت خوش تھا۔ جب دل میں ٹیس اٹھتی ہے تو وہ یاد کر کے سکی دیتی۔ اب جو دلی کر اس نے بڑی خوش و خرم زندگی ... منی نے ... پر رکھ دیا۔ ... ایسے

Scanned with CamScanner

ہی جیسے اسے جب بیٹے کی یاد آتی ہے تو وہ ان کی یادوں میں ایک منظر پاتی ہے ایک عمارت کے زندگی کے آخری دو سال انھوں نے بچوں سے جو اچھا سلوک ... ملے تھے ایسا نہ ہوا ہوتا تو اس کی یادیں صرف بھیڑ بھاڑ تک، کلیجے پر کوئی بوجھ رکھتیں۔ وہ آج بھی بات بات پر روتی ہوتی۔

”آپ کا سر سہلا دوں؟ نیند نہیں آ رہی ہے نا؟“ اس نے چائے کا آخری گھونٹ لے کر خالی گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

”تم خود سو جاؤ۔ سویرے سویرے بچھیا لانے نکل پڑو گی۔ جاؤ یہاں سے۔“ انھوں نے قدرے ڈپٹ کر کہا۔

آپ کس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑی رہی، پھر کچھ چھپیاں تسلے میں ڈال کر اندر جا کر بچوں کے ساتھ گدڑی مڑی ہوئی گدڑی میں گھس گئی۔ ایک آخری تو اس نے اس پر ڈال دی تھی۔ یہاں ایک گدڑی میں چار نفر ہو گئے تھے۔ بچوں کو ڈھکنے کی کوشش میں وہ خود بار بار کھل جاتی۔

کوئی دو بجے ٹھنڈ کے شدید احساس سے وہ پوری طرح جاگ گئی۔ ہوا کچھ ایسے شائیں شائیں کر رہی تھی جیسے ہزاروں جتنیاں اپنے گھر سے سرسراتی گنگا پر سے گزر رہی ہوں یا جیسے مردے جلتی چتاؤں سے اٹھی ناآسودہ روحیں۔ گنگا ماں کے شور میں بھی کچھ ناراضگی تھی جیسے وہ آپ کے میدانوں میں اترنے کے بعد بھی وہ پہاڑی ڈھلانوں سے گزر رہی ہوں تیز، تند، غضبناک۔ کبھی نہ ڈرنے والی منی اس وقت کچھ خوفزدہ ہو گئی تھی۔ کس چیز سے، یہ خود اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ سانپ مرے ہوئے بچوں میں وہ خود ہی ڈرا بیٹھا تھا اور اوسارے میں ایک بہت ہی نیک پاکیزہ انسان سویا ہوا تھا۔ پھر اسے کس چیز کا ڈر تھا؟

وہ چپ چاپ جیسی کی ... ان کے سرہانے آ کر کھڑی ہو گئی۔ ان کی سانسوں کے زیر و بم ان کے گہری نیند کے غماز تھے۔ کچھ لمحوں بعد وہ وہیں بیٹھ گئی۔ تسلے کی آگ بجھ کر بہت کچھ راکھ ہو چکی تھی لیکن راکھ کے اندر انگارے تھے اور راکھ گرم تھی۔ اس نے ایک ٹہنی سے اسے کرید کر چنگاریاں اڑائیں۔

جانے دیر تک وہ کثرت استعمال سے پتلی پڑتی ساری کے پلّے سے خود کو لپیٹ لپیٹ کر بیٹھ

سوچ رہی۔ پھر دھیرے سے ان کے بغل میں سرک آئی۔ سخت محنت سے [illegible] وادیوں میں [illegible] کسان کی طرح تھا اور جب چراغ کی طرف لو دینے لگا۔

آدمی کے ساتھ خدا کا تعلق یہ جاننا چاہا ایسا بے مقصد تو نہ تھا۔

مالک، جانے دیجیے، یہ مت چھوڑیے گا۔ آتما بھٹکے گی۔ [illegible] ہوئے [illegible] مجھے ایک بار...

ان کی آنکھ کھل گئی۔ چمکیلی سیاہ آنکھوں والی رو جو مچھلی جیسی [illegible] سندر عورت ان کے گلے میں ہاتھ ڈالے پڑی تھی۔ چاروں طرف [illegible] خطرے کی، مصیبت کی، [illegible] انہونی پیشین گوئی کی، موسیقی سے بھرپور [illegible] پورا جسم طوفان کی زد میں آئی ناؤ کی طرح ہچکولے کھا رہا تھا۔

مہاتما بدھ ویسے تو احساسات [illegible] تھے لیکن کوئی کشکول میں گوشت ڈال دیتا تو کھا لیتے۔

لیکن کیا جب مار نے انھیں گمراہ کرنے کے لیے اپنی بیٹیوں کو بھیجا تو وہ انھیں شکست دے سکے تھے؟ کیا انھوں نے اپنی خواہشوں پر مکمل قابو نہیں پا لیا تھا؟

میں مہاتما نہیں ہوں۔ میں بدھ بھی نہیں ہوں۔ مجھے عرفان نہیں حاصل ہوا ہے [illegible] کی تلاش میں تو میں نکلا بھی نہیں ہوں۔ ہاں، اگر جی توڑ انسان کی خدمت سے عرفان ملتا ہے تو شاید کبھی مجھے بھی حاصل ہو جائے۔ وہ سوچتے تھے کہ کن پچھلے جنموں کی [illegible] کہ عورت [illegible] جیسا [illegible] میں ختم ہونے کا سکھ۔ مرنے سے پہلے ایک بار اگر جان لوں کہ یہ ہوتا کیا ہے [illegible] شراب کا سرور چڑھتا ہے۔ اچھے بھر پیٹ کھانے، گہری نیند، ماں کی گود، عورت کی محبت [illegible] سے آگاہ ہوں، صرف اس کا جسم ہی نہیں جانتا۔ شاید میں پوری طرح خود پر قابو نہیں پا سکا ہوں ورنہ اس [illegible] میں یہ شعلے نہ بھڑکتے۔ اب تک تو دھکا دے کر اس [illegible] کو [illegible] پھینک دیا ہوتا۔

شعلے پہلے بھی کئی مرتبہ بھڑکے تھے [illegible] آخر وہ انسان ہی تو تھے [illegible] لیکن انھوں نے [illegible] پانی سے انھیں بجھا دیا تھا۔ ہر بار کفارے کے لیے انھوں نے تین دن لگاتار روزے رکھے تھے مسلمانوں کے روزوں سے بھی زیادہ سخت روزے: مسلمانوں سے زیادہ سخت [illegible] دودھ [illegible]

Scanned with CamScanner

تھی وہ جو پیٹ بھر کھانا نہیں کھاتے تھے۔ کبھی کبھی تو محض اُبلے آلو یا کھیرا، ککڑی کھا کے رہ جاتے تھے۔

ابھی حال ہی کی تو بات ہے۔

اس روز دیر تک وہ اس پار والے گاؤں کی ماری تھی۔ وہ ایک بیمار شخص کو ہسپتال میں دکھا کر واپس گھر پہنچ رہے تھے۔ وہاں کنوئیں پر گاؤں میں بیاہ کر آئی نئی بہو کھڑی تھی۔ پانی نکالنے کے لیے اس نے ایک پیر خوب آگے بڑھا کر جسم کو تان رکھا تھا۔ سنہری گیہوں جیسی جلد والے ستھرے سڈول پیر پر اس کا وزن پورا، چاندی کی پائل بہت ہی بھلی لگ رہی تھی۔ بالٹی کھینچتے ہوئے جھٹکے سے پورے جسم میں ارتعاش تھا۔ لگتا تھا، ماں باپ کے گھر وہ کنوئیں سے پانی نکالنے کی عادی نہیں رہی تھی۔ اس کی ساڑی جسم سے سرک سرک گئی تھی۔ گدبدا، قدرے بھاری، گدار جسم بلاؤز میں سے چھلکا پڑ رہا تھا۔ ان کی نظریں اس کے خوبصورت پیر پر ذرا سی رکیں اور پھر سرسراتی سیدھی گردن تک پہنچ گئیں۔ سڈول جسم کا ارتعاش ان کے اپنے جسم میں منتقل ہو گیا۔ انھوں نے خود پر لعنت بھیجتے ہوئے نظریں ہٹا لیں۔ لیکن وہ اچھی طرح سمجھ رہے تھے کہ نظریں جتنی دیر ٹھہری تھیں وہ وقفہ مناسب سے بہت زیادہ تھا اور جو وقفہ گزرا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ وہ نظریں محض خدا کی ایک حسین تخلیق کی ستائش کرتی نظریں نہیں تھیں۔ وہ ایک مرد کی نظریں تھیں جو ایک عورت کی ستائش کر رہی تھیں۔ انھوں نے خود پر قابو پا لیا، کیونکہ ان کا ضمیر ان سے جو سوال کر رہا تھا اس کے لیے ان کے پاس حسبِ منشا جواب نہیں تھا۔

مجھلی نے اپنی کانی چیکیلی، کاجل بھری آنکھوں سے انھیں پھر دیکھا۔ ترشائے کر دنیا سے مت جاؤ سیاں جی ... جب تک تم مانتے نہیں جاتے۔ یہ تسلی بھی کرلو کہ جس نفس کو تم نے قابو میں کیا ہے وہ بار بار ... بعد میں بس چھٹ پٹھوکتے رہنا۔ مگر ایک بار ۔ صرف اس بار...

اس نے انھیں مزید کچھ سوچنے کا موقع نہیں دیا۔ وہ ان پر حملہ کر بیٹھی، جیسے نیپال میں برف پگھلنے کے بعد طغیانی پر آئی ندی بے پناہ خونخوار ہو کر طاقتور گنگا پر چڑھ دوڑتی ہے اور گنگا اپنی تمام تر عظمت کے باوجود اسے اپنے اندر ضم کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

لیکن جب ان کی آنکھ کھلی تو پہلے تو سمجھ میں نہیں آیا کہ جو ہوا وہ کیا تھا۔ وہ ایک برا خواب تھا یا ایک حسین خواب۔ بڑی دہشت کے ساتھ ان کی عقل و فہم نے بتایا کہ وہ خواب نہیں تھا، حقیقت تھی، اور

مزید وحشت ناک بات یہ تھی کہ تعلیم حاصل کرنے سے صاف ہو جانے سے قلب و ذہن پر ...
... ہوئی تھی کہ ایک پر ... ہاتھ دونوں ...
ان کا ذہن پھٹنے کا۔ ساری وحشت مٹی میں مل گئی تھی اور کہیں بہ نہ سکا رہا تھا۔

مٹی اس سے پہلے اٹھ چکی تھی۔ اس نے ٹھنڈے کنویں سے پانی کھینچ کر وضو کیا تھا ... مٹی سے ... پہلے ... چائے بنا چکی تھی۔ ... آنکھوں میں وہ پشیمانی نہیں تھی ... احساس نہیں تھا۔ بس ایک طمانیت تھی، ایک سکون تھا۔ ان کا محبوب ... اس کے ... کے شعلوں میں ... ان کے پاس تھا ... ان سے ... مٹی کی ... ہوٹل میں بھی شکر قند اور المونیم کے گلاس میں چائے ... انھوں نے شکر قند سرکا کر چائے کا گلاس اٹھا لیا۔

چائے پی کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

جھونپڑی کے دروازے پر وہ روبرو ہوئے۔

مٹی نے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔ "آپ کبھی رکے نہیں ... بھول ... نہیں۔"

"باقی ساری زندگی صرف ایک وقت کی ... کر آج کی رات کا ... " انھوں نے دھیرے سے کہا۔ "مگر تمھارا شکر گزار ہوں مٹی ... ہمیشہ ... " انھوں نے ... کے پیچھے ... روکنے کی ضرورت نہیں ہوگی ... جا رہا ہوں۔"

وہ ٹھنڈے سے ... تاریک ... میں ... گم ہو گئے۔

* *

ذکیہ مشہدی

ہدّو کا ہاتھی

ہدّو نے پیپل کے پتوں کے بڑے بڑے چمکدار کٹے اتارے۔ کثیف کرتے کی جیب سے چند مڑے تڑے نوٹ اور کچھ ریزگاری برآمد کی، احتیاط سے گن کر رکھنے والے [illegible] رقم [illegible] رکھی، پھر بڑی محبت سے موٹی موٹی ڈالیاں کاٹ کر انھیں احاطے کے اندر [illegible]۔

ہاتھی نے [illegible] سونڈ اٹھائی، بائیں ہلائی، پھر قدرے تکلف سے [illegible] قدم پاؤں آگے بڑھائے۔

میرے پیارے اس سے قبل کہ لوگ تیرا حصہ کھا جائیں، یہ لے لے۔ ہدّو نے بڑی محبت سے ہاتھی کو مخاطب کیا اور کندھے پر لٹکے انگوچھے کے سرے پر بندھی پوٹلی کھولی۔ پوٹلی میں چار عدد موٹی موٹی روٹیاں اور کوئی پانچ سات حلوے کی قتلیاں [illegible] میں صرف ایک چنے کی تھی اور باقی سوجی یا میدے کی۔

ہاتھی نے قریب آکر [illegible] منھ کھول دیا۔ ہدّو نے چاروں روٹیاں اور حلوہ ایک ساتھ [illegible] اس میں ڈال دیے تو اونٹ کے منھ میں زیرہ [illegible] محاورے میں ذرا سی ترمیم کر [illegible] کوئی چاہے۔ ہاتھی نے پیپل کے تازہ پتوں جیسے بڑے بڑے کان ہلائے اور [illegible] کے چہرے جیسی ننھی ننھی آنکھوں سے [illegible] معصومیت اور محبت کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا۔ ہدّو نہال ہو گئے۔ ساتھ ہی ان کے من میں ایک ہوک سی اٹھی۔ [illegible]

ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے بیوی چلائیں۔

[illegible] محبت کا ڈھالی [illegible] پڑھ لیتے تو وہ روٹی [illegible] سے پیٹ [illegible] ہندو کا کوئی بھلا نہ ہو اور بچے گھر [illegible] روتے ہیں۔"

"سب بچے [illegible] کی فوج" [illegible] بچے [illegible] گر ہے۔

"[illegible] چاہتی ہیں" بیوی نے منہ [illegible] کی نقل کی۔ شاید انھیں [illegible] جواب نہیں سوجھا، اس لیے منہ چڑا [illegible]۔

"ایک بات [illegible] اوقات میں رہ کر [illegible] پڑتی ہے" جہنم [illegible] چاہے [illegible] سب [illegible] ہم [illegible] ایک [illegible] صاحب [illegible] ان کی [illegible] خدا انھیں جنت نصیب کرے [illegible] تو تم انھیں [illegible] ہم نے [illegible] کا [illegible]"

[illegible] بیوی [illegible] انھیں [illegible] بیوی [illegible] جنت [illegible] تو [illegible] غصہ بھی بھول گئیں۔

[illegible] بے نیازی سے ہاتھ [illegible] عورت۔ زندگی میں ہی [illegible] میں کیا رکھا ہے [illegible] بھی [illegible] کہ [illegible] جنت نصیب کرے [illegible] پیٹ بھر کھانا بھی نہ [illegible]"

[illegible] بھی [illegible] میں [illegible] وہ [illegible]۔

بیوی [illegible] پیٹ [illegible] ہاتھی کی [illegible] شب برات [illegible] بھی [illegible] اور [illegible] کوئی بھی [illegible] میں [illegible]

صحن میں ہاتھی بندھوایا جائے تو تم بندھوا سکتے ہو۔"

"کیسے کریں ہم بچہ؟ ادھر دادا پردادا کے وقت سے یہی فیملی کرتے آ رہے ہیں۔ دادی کی بیاہ کی بچی میں کرتے ہیں ہمارے لوگوں میں عزت ہے، سید ہیں ہم۔ دادا پچھ کے فیصلے ہیں کچھ بھی ہو سب فاتحہ کے لیے لے دیتے ہیں۔" بکتے جھکتے ہوئے ٹاٹ کا پردہ ہٹا کر اندر داخل ہوئے۔

"تمھارے دادا پردادا کو بھی کچھ ورثے میں ملا تھا کرنے کے لیے؟ جھوٹ بتاؤ میرے دادا اور بیگم بیوی نے پھر جل کر منہ مارا۔ "خیر، خود ہی کیا تمھیں پتہ اور بچہ سکتا ہے۔ ہم تو یہیں اب تک ... بڑے بڑے ثبوت تو دیں گی" ... اور ... یہ تو سمجھے ... کہ میں چاہیے تھے۔"

ہاتھی ہندوستان میں کئی قسم کی کشتی پر دولت کا بڑا حصہ ہوتا تھا۔ ہاتھی سے دولتی شاہی جلوس کا ایک حصہ تھے۔ ان سے جلوس میں سے ایک بڑی سلطنت کو بڑے تیس سے سلطان اور شاہ شرقی کے زمانے میں جانے کے مشہور ہوا کرتے تھے۔ تاریخ کے وقتوں میں یہ ایک ... ہوتا تھا۔ ہوا کے ... کے بہاں جانوں میں ہاتھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ گھومتے پھرتے تھے۔ وہ ان سب کو گومتی کے پانیوں میں نہلاتے، ان کے لیے میوہ اور خاص ... تیار کراتے، ... کی پیچیدہ یاں اتروائے اور پیار سے ان کے سوپ جیسے کانوں میں محبت سے نرم نرم ... کہتے۔ ... ذیل سے ازیل ہاتھی بھی پالتو کتے کی طرح کھڑا ہوتا۔

یہ ہاتھی کے اٹھ کھڑے ہونے کا ایک ایک قصہ تھا۔

بیسویں صدی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ جونپور دہلی کے تخت سے رشتے کمزور ہوتے جا رہے تھے (کہ وہاں ... کی وقت ... تھی)۔ کمزور ... جہاں ... مقرر ... فیروز شاہ ... میں تھا ... سلطنت جونپور کی اور چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی طرح وجود میں آ گئی۔ ... سلطان الشرق ... خواجہ جہاں، جو فیروز شاہ کے وقت میں ہی مشرقی علاقوں کے گورنر بنائے گئے تھے اور باوجود اس کے کہ خود ... تھے ... تب سے ... پانچ برس ... حکومت میں (کہ ... قدرے ...) ...

جونپور کو دارالسرور بنا گئے۔ آگے چل کر شاہجہاں نے اسے شیراز ہند کا لقب دیا۔

اس وقت قصبہ فیروز شاہی میں ہاتھی گھوڑوں کی ریل پیل ہو رہی تھی۔ نوبت نقارہ بجنے پر فوجیں کوچ کیا کرتی تھیں: دمادم، دمادم۔ شفاف سڑک پر صبح شام جب چھڑکاؤ ہوتا اور سقے مشکوں سے چھڑکاؤ کرتے۔ سوندھی سوندھی خوشبو اڑتی تو عاموں کی ٹولیاں نکلتیں۔ ڈھال گرٹولہ میں لوہار ڈھالیں بنانے میں مصروف ہوتے اور ... دین کو جلا بخشتے۔ درسگاہوں نے اتنی شہرت حاصل کی کہ ایک صدی بعد شیر شاہ جیسا مد بر ... اور رعایا پرور بادشاہ یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا۔ (ڈھال گرٹولے میں اب غریب مسلمان جولاہے ... اور دلی میں جمع ہو کر قتل اور وقت مرجایا کرتے ہیں۔ جونپور کے کسی مدرسے میں سے دلی تک ... پڑھنے نہیں آتا۔)

دلی میں طوائف الملوکی کے اس دور میں جناب ... تیمور ... سے تھی ... نگاہیں ہندوستان کی طرف پھیر ... بڑے بڑے شہر ... ویران ہوئے ... تخت ... ہو گیا ... صاحب علم و اوصاف لوگ عزت اور جان و مال کی حفاظت کے لیے ... نسبتاً پر امن علاقوں میں اکٹھا ہوئے، جن میں جونپور بھی تھا جو دارالسرور کے بعد دارالامان بھی قرار دیا گیا تھا۔ ان ہی دنوں ... سے ہجرت کر کے، ... وقت دلی ... سے جانا جاتا تھا، ایک باریش بزرگ ایک مسیں بھیگتے نوجوان ... ہاتھی ... جونپور سے تیس میل دور موضع فیروز شاہ پور میں وارد ہوئے۔ (جونپور پر انگریزوں کے قبضے کے بعد یہ موضع ان کے کاغذات میں "فروشی پور" درج ہوا، جسے بعد میں عوام نے ... ان مسلمانوں میں سے تھے جنھوں نے بھٹنیر کے قلعے کے ... ہندوؤں کے شانہ بشانہ ... تیموری سپاہ سے جنگ کی تھی اور شکست یقینی جان کر زن و بچہ قتل کرنے ... باقی تھی، خود بھی بچ گئے ... بھی جو ان کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو کر جنگ میں شریک تھا۔

سید، عالم دین اور بجائے ... کے سبب بزرگ جونپور میں ... اس وقت سلطنت کا ... نصب کر کے خواجہ جہاں ... بیٹے ... مبارک شاہ تخت پر تھا۔ بزرگ کو مبارک شاہ نے ایک قطعہ اراضی ... سے ...

یہ جونپور کے بعد سید صاحب کا ہاتھی مر گیا تو سلطان نے ہاتھی بھی عنایت کیا۔ اطراف کا ایک چیخ دوق
راجپوت زرپرست بھی قدرت متأثر ہوا کہ اسلام قبول کیا اور اپنی لڑکی ان کے پوتے سے نکاح میں دی۔
بزرگ ہاتھی اس سید صاحب مشہور ہو گئے، اس لیے کہ فیروز شاہ پور سے جونپور آتے تو ہاتھی پر سوار
ہو کر ہی آیا کرتے۔ جونپور جب شرقی سلطنت کا صدر مقام تھا۔

سید صاحب کا ہاتھی ایک دن جونپور میں رُک گیا۔ شاہ چوک پر بیٹھ تو بس بیٹھے بیٹھے تھوڑوں کا
حلوہ اور نمکتے کا نام نہ لے۔ دکھ بہت سے تعلّق کے شہو کے دیے۔ پکّا امتحان آ رہا ہے،
ریش سعد آ دین محمد، صدر کل سید۔ تب ان کے پوتے کے پانچ سالہ بیٹے نے، جس کی ماں راجپوتنی
راجپوتنی اور مذہباً مسلمان تھی اور جو پردادا کے ساتھ ہاتھی پر بیٹھ کر سیر کرنے چلا آیا تھا، ہاتھی کے
میں ننھے ننھے ہاتھ ڈال کے اس کے کان میں کچھ کہا۔ ہاتھی فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ یہ قصہ کھا ایسا ہوا کہ
خوش ہو کے اور جب وہ بڑا ہوا تو سلطان ابراہیم شاہ شرقی نے اس کے پردادا کی زمینوں میں اضافہ
کر کے نیل جانے کا تمغہ مقرر کیا۔ سید ہادی حسن عرف ہد میاں کے کرم خوردہ شجرے میں سب
سے پہلے تمغے والے پردادا، سید سید منجھو حسین کا نام بالکل صاف لکھا نظر آتا ہے۔

ہاتھی کے پیٹ میں اتنا سارا حلوہ اور اصلی گھی کی دو دو روٹیاں اپنی آنکھوں کے سامنے جاتے
دیکھ کر بدو کی ہمیشہ سے چیٹے میں ہوس تو تھا اور اب تک نظر جا رہا تھا۔ خالی برتن کھڑکا کھڑکا کر وہ
مسلسل اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھیں۔ بدو پر کوئی اثر نہ ہوتے دیکھ کر انھوں نے پیر پٹخے۔ ''اب
غور میں گے پڑوسی پر اور اس کلموہے اللہ مارے ہاتھی کو چھوڑ آئیں گے وہاں۔ کوئی کوس کے حساب
سے مر گئی تھیں۔ اب جب وہاں سفیدے کے درخت روند دے۔ اس موئے راجہ کے سیدوں کا
کیڑے لگیں، سوکھا مار جائے۔''

یہ سفیدے کے درختوں کا بھی ایک قصہ تھا۔

بدو کی پیدائش سفیدے کے درختوں سے سخت چڑ تھی جس میں وہ حق بجانب تھیں۔ ان کی
زمین سے متصل سامنے پر سفیدے کے درخت لگنے جانے سے پہلے زندگی اتنی بے ہنگم اور تاریک نہیں
تھی۔ پڑوسی پردے میں رنجیت سنگھ کے یہاں ایک خستہ حویلی، کچھ زمینیں اور ایک عدد ہاتھی ہوا کرتا
زمینداری کے ختم ہونے تک برقرار تھے۔ راجہ صاحب کا ٹھاٹ بھی برقرار تھا جو بیوقوف...

سے انگریزوں نے [illegible] میں ان کے بزرگوں کے ہاتھ رسید دی [illegible] آنے پر انہیں [illegible] دیا تھا۔ اس وقت حویلی میں بہت [illegible] اور بارونق ہوا کرتی تھی۔ ڈیوڑھی پر تین تین ہاتھی جھومتے تھے جن پر آٹھ [illegible] مقرر تھے۔ [illegible] کی سفارش پر ایک نوکر ملازم مقرر کیا گیا جو ہڈو کے والد تھے۔

سید محمد حسین، محمد نبیل خانہ شاہی اور مختلف تین ہاتھیوں پر مشتمل معمولی سے فیل خانے سے ایک معمولی [illegible] درمیان موقع میں بہت سارا پانی بہہ چکا تھا۔

راجہ صاحب نے اپنے بچپن سے دوست گیا کے نواب احمد علی خان سے خاصا سبق سیکھا تھا۔ ان کے ہاں ہاتھی نے ساتھ [illegible] بھی تھی۔ بچپن میں نواب صاحب سے بیٹے انگریز گورنس ہو گئی تھی۔ محل میں [illegible] سے تین [illegible] مرے تھے لیکن وہ مرے تو ان کا [illegible] ایک [illegible] پر مشتمل رہ گیا تھا۔ ہاتھی اور [illegible] نہ جانے کن لوگوں کی جیبوں میں جاتے تھے۔ انگریز گورنس کی جگہ ایک چندہ جی بڑی بی تھیں جو پرانے وقتوں کے احسانات جتانے کے لیے [illegible] جایا کرتی تھیں۔ [illegible] اوقات کافی نہیں ہوتی تھی۔ نواب صاحب اپنے [illegible] سے روٹی [illegible] یا صرف چادر پر قناعت کیا کرتے۔

راجہ صاحب نے بیٹوں کو اعلیٰ تعلیم دلوائی۔ دو تو امریکہ میں جا بسے اور ایک [illegible] سے فلم سازی کی تربیت لے کر بمبئی میں مقیم ہو۔ شہباز اشتہاری فلمیں بنانے والا [illegible] اپنے پیشے میں کافی کامیاب [illegible] چند سال پہلے گاؤں آیا تو [illegible] باپ کو اپنے ساتھ [illegible] ۔ [illegible] چاروں طرف [illegible] زمین سے [illegible] اور وہاں [illegible] درخت [illegible] کہ یہ بہت منفعت بخش سودا ہے۔ [illegible] دو کوٹھریاں رہنے دیں۔ ان میں اپنی پسند اور بھروسے کے مطابق دو جوان صحت مند کارندے مقرر کیے۔ باقی لوگوں کو ہڈو اور ہاتھی سمیت نکال باہر کیا۔ راجہ صاحب کو ہاتھی سے بے حد لگاؤ تھا اور ہڈو کو اس سے جو محبت تھی اس کے بھی معترف تھے۔ [illegible] ہاتھی کو بیچنے کی تجویز پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ ہاتھی ہڈو کو سونپ کر [illegible] میں ایک غیر مقیم ہندوستانی دوست کے بنگلہ نما مکان کے احاطے میں اس کی رہائش کا انتظام کر دیا [illegible] رقم بھیجتے تاکہ وہ [illegible] ہاتھی اور ہڈو کی [illegible] ضروریات پوری کر سکے۔

اب قصبے کے گاؤں میں حویلی کے شاگرد پیشے میں رہنے کے بہت فائدے تھے۔ پھل پھلواری، سبزی ترکاری کی بہتات تھی، جو چھوٹی رانی صاحبہ فراخ دلی سے ملازموں میں تقسیم کرتی رہتی تھیں۔ بدرو کے بچوں کے لیے عید بقرعید میں نئے کپڑے بن جاتے تھے۔ مداخل پر بنائی ورداییں میں مدد کر دیتے تو بہت سا غلہ مل جایا کرتا تھا۔ نقدی زیادہ ہاتھ میں نہ آنے پر بھی فراغت کی زندگی تھی۔ جو تین بچے اس دور میں پیدا ہوئے وہ نہایت صحت مند تھے۔ جو پورا آ کر پیدا ہونے والے باقی تین نہایت مریل۔ اب تو تینوں بڑے بچوں کے گال بھی پچک گئے تھے۔ وہ الا مسجد کے پاس کے اتنیق دو رہے کے چھٹی کے اوقات میں چہار دیواری پھلانگ کر اندر گھس جاتے اور کویاں اور تاڑ جیسے۔ گھر آتے تو ایسے بھوکے ہوتے کہ بس چلتا تو ہنڈیاں برتن توڑ کے کھا جائیں۔ اس وقت بدرو کی بیوی کا دل چاہتا کہ وہ سفیدے کے درختوں میں آگ لگا آئیں یا ہاتھی کی بکابوٹی کر ڈالیں جو مسکی سے آنے والی قلیل سی رقم کا بیشتر حصہ کھا جاتا تھا۔

ایک دن تو بیوی نے تجویز رکھی: "ہم ذرا حال گڑوال جا کے دیکھ آتے ہیں۔ شاید کہیں بیڑی بنانے کا کام مل جائے۔"

بدرو بے حد ناراض ہوئے: "اب تم برقع اوڑھ کے گلی محلے کے لونڈوں کے بیچ سر پٹر کرتی گھوموگی؟ سیدانی ہو، ذرا یہ تو سوچو۔"

ایک بار بیوی پھر تنتنے سے کھڑی ہوئیں: "ہم تمھاری طرح عرب سے سید نہیں ہیں۔ ہماری اماں پٹھانی تھیں۔ اور پھر کام کرنے میں ذلت کیسی؟" انھوں نے اسی قدر چمک پڑ کے، اکڑ کر جواب دیا تھا۔

"سید کی بیٹی ہو نا، اور سید کی بیوی بھی۔ بس، بات ختم۔ اماں سے کیا ہوتا ہے؟ اماں سے نسل نہیں چلا کرتی۔"

اماں سے نسل چلتی ہوتی تو بیچ کو تیوں کی بیٹی سے کب کا سیدوں کا تہجیت بنا یا ہوتا اور آگے چل کر معلوم کوئی بیوی نے حلوہ روٹی کے لیے زیادہ ضد کی تو بدرو نے اس دریدہ دہن عورت سے پنڈ فوراً حاصل کرنے میں ہی عافیت جانی اور گھر سے نکل لیے۔ جاتے جاتے ایک نظر ہاتھی پر ڈالی جو مزے سے کر کر کے پیپل کی ٹہنیاں چبا رہا تھا۔ حسب دستور بچے دیکھ کر مچلے کی وہ چیخ پیاں تیں بگی تھیں اور بیتوں پر مٹھ مار رہی تھیں۔ ہاتھی اس سے بھی ناراض نہ ہوتا تھا

بے نیازی سے یوں دیکھتے جیسے وہ [illegible] ایک دوسرے [illegible] سے
مشینی جھریوں میں سے دو ایک جھریاں ہاتھی کو دیکھتی تھیں تب بھی وہ برافروختہ نہ ہوتا۔ اس [illegible]
[illegible] قدموں والے [illegible] کو بھی [illegible]۔ اس وقت بھی ایک چھوٹی سی بچی اس کے موٹے موٹے ستون
جیسے پاؤں سے [illegible] کی جلدی جلدی [illegible] پر منہ مار رہی تھی۔ بدھ کا ہاتھی [illegible]۔

بھاری [illegible] اور بھاری قدموں کے ساتھ چلتے ہوئے [illegible] چوک پر آ کے کھڑے ہوئے [illegible]
[illegible] مسجد [illegible] تھی [illegible] بلکہ نہیں بدمست ہاتھی کی طرح مہیب، بھاری رعب [illegible] مسجد
[illegible] تھا [illegible] ابھی [illegible] اور اس کے ساتھ چل پڑے [illegible]
[illegible] کا وقت [illegible] لوٹ آتے تھا۔

[illegible] چوک پر ایک راستہ [illegible] تھا [illegible] کہیں [illegible] تھا۔ [illegible]
[illegible] سے [illegible] اور کہیں [illegible]
[illegible] ایک [illegible] عورت [illegible]
[illegible]۔

[illegible] بدھ کا ہاتھی [illegible]
[illegible]۔

"[illegible] ہاتھی [illegible]
[illegible]
[illegible] ہاتھی [illegible] نہیں جانتے [illegible] ہمارے ہاتھی کو بھی [illegible]
یہاں [illegible] ہوتا ہے۔"

عورت [illegible] مسلسل [illegible] معلوم ہوا [illegible]
قدموں سے سنک لینے میں ہی عافیت سمجھی۔

[illegible] عورتوں [illegible] کا [illegible]
[illegible] ہاتھی [illegible] وقت [illegible] صدمہ [illegible]
[illegible] عورت [illegible]

سکی جو دری ہوئی ہمیں رکھنے والا مجبوری تھی۔ اور ہمارے پاس رشتہ ٹوٹا تھا تو مر نہ جاتے ہو گئے؟ ارے ہم فیلبان ہیں فیلبان۔"

ہاتھی نے بڑے بڑے کان جھل کر مکھیاں اڑائیں۔

دیکھا ہمارا بیٹا کیا کہہ رہا ہے۔ وہ کہیں تو پیاسی نہیں، پوری پاگل ہو رہی ہوگی۔ چل بیٹا موتی جھیل کے نہلا لائیں تجھے۔ گرمی بہت ہے۔"

بوڑھے ہاتھی نے ساتھی ہوئی آنکھیں بند کیں اور پھر کھولیں، جیسے کہہ رہا ہو۔ اب تمہارا جی چاہ رہا ہے تو لے چلو، چلتے ہیں۔"

تیکھے نقوش والی حسن کی رنگت والے ہدو نے اپنے کچھ دور فیلبان شاہی قلعے کی پڑھائی۔ باپ کا پیشہ رکھتے آگے بڑھایا تو انھیں سب تماشہ وہ عورت یاد آئی جس سے ہدو عرصے پہلے انھیں رکھنے والا مجبور کر کے ہمدرد سے چلتے کے لیے کہا تھا۔ وہ یقیناً کوئی پاگل پری تھی یا اس کی روح تھا۔ یہ تھا۔ ویسے کام بات تو ہدو کی بیوی کی بھی سمجھ میں آئی جو ہاتھی یوں کھڑا کھڑا مر گیا تھا بچا ہوا یہی موت کا۔ تقدیر مرنے والی روح کو پچھتاتے، ہاتھی ہوا ہو گئی، اور مرنے کے سے صرف ایک وجہ کافی تھے۔ پیدا ہونا۔ اور موت اور پیدائش ان دونوں کے علاوہ دنیا میں تو کچھ حق ہے اور تقطعی۔ مزید یہ کہ ہاتھی، جو خاصا بوڑھا ہو چلا تھا، "دھا پیٹ کھا کے زندہ رہنے والے انسانوں کی طرح زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ لیکن ہدو کی تسلی کے لیے ان میں سے کوئی حقیقت کافی نہیں تھی۔ وہ بہت بعد تک یاد کرتے رہے۔ ایک قبیلے کی آمدنی کا ذریعہ ختم ہو جانے کی وجہ سے نہیں، بلکہ ہاتھی سے قربت میں۔ نہایت بے مدد ری سے ساتھ انھوں نے راجہ صاحب کو ایک پوسٹ کارڈ لکھوا کے اس کی خبر دے دی تھی۔ انھوں نے ہدو کو کچھ یکمشت رقم بھیجی اور ایک جوڑ کپڑے — یہ ان کے لیے خلعت کا قائم مقام تھے اور ہاتھی کا آخری تحفہ۔

ساری رقم ختم ہوئی تو ہدو حاجی رضا علی کے یہاں گئے۔ ان کے یہاں رشتے چلا کرتے تھے۔ تعلق سے ایک کا م پڑا، ان کی بیوی سے مرغی رشتہ لے کر انھوں نے دوسری جگہ میں جھٹی دی تھی۔ اس بار شہ انھوں نے مدد کو کہا یہ تم سے۔ اور رنجیدہ وہ بہت پہلے ان دنوں جھڑتے تھے تائے نے رشتہ

سینہ پر خط ۔۔۔ تو ان کا دل بالکل اچاٹ تھا۔ لیکن تب جس نے یہ دیکھا کہ ابھی وہ دن پہلے ان کے پاس ہاتھی تھا [illegible] کا ہاتھی [illegible] اور اس کے حجرے میں تھیں سید محمد حسین تھے جو شاہی وقتوں میں فیل خانے کے مہتمم ہوا کرتے تھے (وہ شیراز سدھوں پور کے مصنف سید اقبال حسین کا کہنا تھا کہ اس وقت شاہی فیل خانے میں ہاتھیوں کی تعداد کم از کم چھ سو سے اوپر تھی)۔

ثبوت کے طور پر ہاتھی سے متعلق [illegible] دستاویزات تھے وہ شجرہ [illegible] میں محفوظ تھا۔

❁ ❁

ذکیہ مشہدی

فضلو بابا ٹخ ٹخ

صدیوں پہلے کی بات ہے یا شاید ایسا لگتا ہے کہ بیچ میں گزرے صدیاں بیت گئیں۔ تب میں سب بزرگوں کی گود میں گھس کر کہانیاں سنا کرتی تھی۔ والد کے پرانے دوست مرکا ہی فضلو شمسی چچا پرنسپل طبیہ کالج لکھنؤ (اب مرحوم و مغفور) ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ میں ان کے سر ہو گئی۔ ”چچا کہانی“

وہ ابھی روودستانے میں مشغول تھے، جھنجھلا کر بولے، ”دفع ہو، شیطان کی خالہ، وقت بے وقت کہانی...“

شمسی چچا ہنسنے لگے۔ بولے، ”تمھاری بچی نے بات سوال بغیر لٹائے سنی۔ اس کی فرمائش پوری کر دیتا ہوں، پھر اطمینان سے گپ ہوگی۔“

میں ان کی داڑھی چوڑی میدان جیسی گود میں، باقاعدہ پھیل کر بیٹھ گئی۔

”سنو، ایک پہلوان تھا۔ نام امیر وخاں ظمیر وخاں لنگڑ چھم چاخ خاں، ربی ولی ولی۔ اب اگر تم نے نام دہرا دیا تب تو کہانی آگے سناؤں گا ورنہ تم فیل اور کہانی ختم۔“

میں نے جلدی جلدی ہونٹ ہلاتے ہوئے دہرایا۔ ”امیر وخاں ظمیر وخاں لنگڑ چھم چاخ خاں، ربی ولی ولی۔“

وہ تھی شیطان کی خالہ ہے، دوڑ دوڑ کے گودی میں جو پہلا آ گیا۔ مجھے یاد ہے میں فضلو بابا ٹخ ٹخ نے ایسے میں بیٹھ کر شرافت بچانے کا ان چاہی ہوں اور ایک بار دیا ہے۔

''اچھا بھئی چلو، ہم ہار گئے۔ اب آگے کی کہانی سناتے ہیں۔

ایک بہت بڑا میدان تھا ہرا بھرا اور شاداب۔ اس کے بیچوں بیچ ایک نیلی چوڑی ندی بہتی تھی۔ ندی کا پانی شفاف تھا۔ اس میں بہت سی مچھلیاں تھیں۔ کنارے کے درختوں میں رنگ برنگی چڑیاں رہا کرتی تھیں۔ چھوٹے بڑے ہر طرح کے جانور بستے پھرتے تھے۔ اس ندی کے ایک کنارے وہ رہا کرتا تھا، ارے وہی۔۔ میرو خاں ظمیرو خاں۔ غلاموں کی بہت بڑی فوج اس کے پاس تھی۔ ندی کے دوسرے کنارے پر ایک اور پہلوان رہا کرتا تھا۔ اس کا نام تھا لتو خاں فتو خاں۔ بڑے تیس مار خاں، دونوں خاں بے دھڑک۔'' ''بے دھڑک'' لفظوں پر زور دے کر کہا۔

میں نے قدرے مسکرا کر بابا کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر بیزاری کے آثار تھے۔ کہانی جاری تھی:

''میرو خاں ظمیرو خاں رات کو اپنی روٹی خود پکاتا تھا۔ جب وہ ہاتھوں پر روٹی بجاتا تو اس کی تھاپ ایک مٹیالی چوڑی ندی کے پانیوں سے گزر کر لتو خاں فتو خاں کے گھر پہنچتی تو اطراف میں سے کوؤں کے دل دہل جاتے۔ پیڑوں پر بسیرا کرتی چڑیاں بے چین ہو کر اڑنے لگتیں اور ننھے چوہے ماندوں میں دبک کر بیٹھ جاتے۔''

''پھر؟'' میں نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔

''پھر اس کے جواب میں لتو خاں فتو خاں اپنی رانوں پر ہاتھ مارتا اور دوسرا ہاتھ بھرے پیٹ پر پھیر کر ڈکار لیتا۔ اوں اوں اوں۔ اس کی رانیں پیٹنے اور ڈکار لینے کی آواز ایک مٹیالی چوڑی ندی کے پانیوں سے گزر کر دوسرے کنارے پہنچتی اور راستے میں ملنے والے سارے پنکھ پکھیرو اور سبھی جانور بے چین ہو جاتے۔ کئی سو سالوں سے یہی ہوتا چلا آ رہا تھا۔''

''یہ دونوں کشتی لڑ کر خود فیصلہ کیوں نہیں کر لیتے؟'' گاؤں کے ایک نیک بزرگوں جیسے پکھیرو اور چھوٹے چھوٹے جانوروں سے کہا۔ ''ہمارے دل کیوں دہلتے رہتے ہیں؟''

''جب جی چاہتا ہے اپنے غلاموں کو بھیج کر ہمیں پکڑوا لیتے ہیں۔'' ایک سفید بالوں والے خرگوش نے کہا۔

''ہمارے گھروں سے میدانوں میں آگ لگا کر اپنی روٹیوں سے پیٹ بھر لیتے ہیں۔

ہرن کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔

"بزرگوں نے تاسف سے سر ہلایا۔ "ہم سمجھا بجھا کر ہار گئے، ہمارا ان پر کوئی بس نہیں۔""

اور شاید حالات پر بھی کسی کا زور نہیں ہوتا۔ اسی وقت چچی اور حسن تارا ... ہوئے اور میں نے دل ہی دل میں سوچا کہ ضرور ... بے دھڑک ان ہی کی صورت کا رہا ہوگا۔ بابا اور شمسی چچی ان کی طرف متوجہ ہو گئے اور میں شدید کوفت کے ساتھ اندر کھسک گئی، جہاں چچازاد حسن ... ہاتھ مار کر پلنگ سے چھینٹے اڑا کر پھر وہی پرانا قصہ شروع کر دیا جس نے ... میں ... بجتی۔

"رانی خیا تو پھر قتل کر کے کلاس میں فرسٹ آ گئی؟"

اس وقت کہانی میں یہ نکتہ نکلا کہ کہانی ادھوری رہی تو رہ ہی گئی، کیونکہ شمسی چچی دوسرے دن واپس لکھنؤ چلے گئے تھے۔ میں نے اپنی ٹیڑھی میڑھی تحریر میں انہیں خط لکھا کہ وہ کہانی پوری کر دیں۔

"کہانی کہیں خط میں لکھی جاتی ہے بیوقوف، کہانی تو آس پاس گھومتی رہتی ہے۔ آ کے پکڑوں تو سناؤں،" انھوں نے جواب دیا۔

بعض اوقات کتنی گہری کسک چھوڑ جاتے ہیں، جیسے یہ کہانی کا ادھورا پن، جو آج بھی پھانس بن کر دماغ میں گڑا ہوا ہے۔ اور اب جب کہ میں خود آس پاس گھومتی کہانیوں کو پکڑ پکڑ کر دوسروں کو سناتی رہتی ہوں تو سوچ رہی ہوں کہ اس کہانی کو بھی خود ہی مکمل کر کے آپ کو سنا دوں تاکہ میرے اندر جو ننھی بچی چھپی بیٹھی ہے وہ مجھے تنگ کرنا چھوڑ دے۔

بچی ابھی تک ... بچائے بیٹھے ہوئے گنے چوسنے میں مصروف ہے۔

"فضلو ... فضلو ہمیں ایک چکر دکھا کر لاؤ۔" گنا ختم کر کے وہ فضلو بابا کی دھوتی پکڑ کر اچھلنے لگتی ہے جو گھوڑے کی لگام پکڑے اس کا رخ موڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"ارے نہیں سوجھے (سیدھی طرح) بیٹھو۔ ابھی جاتے کو ہے پانچوں ... ذرا ... کی ماتا جی منت مانے رہیں، سو حاجت ہی چڑھانے لے کے۔"

"ہم بھی چلیں فضلو بابا؟"

"بٹیا موٹی موٹی بھیڑ رہوئیں سب جوڑے کے۔ تم کہاں پنچھو بٹیا؟" وہ ... سے شرمندگی ہو کر

[illegible] تھی۔ [illegible]
[illegible] (شکر قند) کی میٹھی سوت ہے۔ [illegible]

"فسو [illegible]" [illegible] چاول [illegible]
[illegible] پریم چند [illegible] سب سے [illegible]
کہلاتا ہے اسے ٹھوکا دے رہا ہے۔

"اچھا چچو [illegible]" فسو پریم چند کی طرف [illegible]
جیو سکراے کے میلہ!"

پریم چند [illegible] پیچھے ہٹ جاتا ہے۔ شہر سے پانچ میل [illegible]
[illegible] کا [illegible]
[illegible] شہر [illegible] استعمال
[illegible] تھے۔ فسو [illegible] ہمیشہ [illegible] چودھری [illegible]
[illegible] کا حلقہ شہر [illegible] پر مشتمل تھا۔

"[illegible] سکراے کے میلے [illegible]
[illegible]۔ "فسو [illegible]"

"اس کمبخت فسو [illegible] ہے۔ [تائی اماں Mania [illegible]
[illegible] خراب ہوتا ہے۔ [illegible]
[illegible] بیماری سے [illegible] ہی ہوتا ہے۔"

بڑی اماں، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"

"طبیعت کمبخت کیا ٹھیک رہے گی۔ اس بڈھے [illegible] ستیاناس [illegible]
اماں [illegible] کے پیچھے سے تفصیل بتانے لگتی ہیں کہ [illegible] ضروری تھا ورنہ [illegible]
بھی سر بھاری ہو رہا ہے۔"

"کا ہو، آج [illegible] سیر [illegible] کھاس [illegible] کھائے رہیو ٹھیک ہے۔"

"ارے کمبخت فسو، میں کھاس کھاتی ہوں؟" ستیاناس [illegible] تائی اماں [illegible]

اکھاڑ تی تھیں۔

"ہم تو رام پیاری کو بہت رہیں بڑی اماں۔" فصّو بغیر شرمندہ ہوئے آرام سے جواب دیتے ہیں اور ایک ایک کر دوڑ کر اتر جاتے ہیں۔

"ہتیا ناس اب کیا ہوا؟ اس رام پیاری کی ٹانگ ٹوٹ گئی کیا؟"

"دیکھو بڑی اماں، رام پیاری کو کچھو نا کہو۔ ہم کا بڑیا سہی جتنا سن ہوئے۔"

"ارے مرو ۔۔۔ میں کیا گالیاں بکتی ہوں جو تجھے گالیاں دوں گی؟ اور یہ تیری گھوڑی نہ سہی ہے اتنی نہ کیا جو اسے کچھو نہ کہوں؟ کیسے چل رہی ہے جیسے آدھی مری ہو۔"

"کہہ جانے دیجئے اس کی شکل خود گھوڑی جیسی ہوتی جا رہی ہے۔" ایک بار کسی بات پر فصّو سے جو کچھ جیسا منہ لٹکایا تو تم ہی کی ہے، بے اختیار بول پڑی تھیں۔ اس وقت تائی ماں کی سرزنش پر اس نے پھر ویسا ہی منہ بنایا۔ رام پیاری کے لیے تحقیر آمیز الفاظ اس کی برداشت سے قطعی باہر تھے۔

"ہم صدوں کا کاہے کہے رہیں۔ کہے لگیں کہ بیٹا کا بیوہ نا کرے وہ ہوتا ہوتا ہی تھیں۔ کھول کر دیکھتیں تو آنکھوں میں آنسو۔ بولیں کہ بیٹا سمجھو تو تو اسی کا نام بدل دیہو۔ تمہار کا بڑے پریم سے رکھے رہیں۔ رام پیاری۔ ہمری پہلوٹھی کی بٹیا کوئی دو مہینے کی ہوئے کے گذر گئی رہی، او ہو کا نام رہے رام پیاری۔ تو بڑی اماں ہم کیسن کہ ہم نام کاہے بدلیں گے؟ کون ضرورت ہے نام بدلے کی؟ نام تو بڑا نیک ہے۔"

"دون تمہاری یہ داستان کبھی ختم بھی ہوگی۔ نوسو دیں بار ہر رہے ہو۔ ذرا دو چار چابک رسید کرو میاں اور دیکھو رام پیاری کو تا کہ ذرا تیز چلے۔"

"چابک مارن ہیں کا؟" فصّو کا لہجہ ریشم کی طرح نرم تھا۔

"تو میں مار اس کی ہوں مگر" بڑی ماں چڑچڑا گئیں۔

"آپ کا جیسن کہت رہے بڑی اماں، رام پیاری سے پوچھت رہیں۔ پانچ ٹھو دیدیے گا؟"

تم تائی ماں کی بھتیجیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ مارے غصے کے خاموش ہو گئیں ویسے بھی فصّو وغیرہ سے پوری طرح پڑتی نہیں تھی۔ وہ مرادآبادی تھیں۔ "بڑی ماں پانچ ٹھو دیجیے؟"

Scanned with CamScanner

دیکھیں؟ کون بڑی بات ہے آپ کے لیے؟"

"ارے تجھ سے کہہ رہا ہے، تم چپ! مجھے کیا پتا کہ مجھ سے مانگ رہا تھا یا وہ بھی اس کھاری سے ہی کہہ رہا تھا۔"

"آپ سے مت رہیں بڑی ماں" نہایت ملائمیت اور سادگی سے فضلو نے جواب دیا۔

"کیا کرو گے پانچ روپے؟"

اس زمانے میں پانچ روپے ایک غریب آدمی کے لیے اچھی خاصی رقم تھی۔

"ابھی تو ہم تیں گائی لوگن سے پانچ پانچ روپیہ"

"ایک اور شادی کر رہا ہے کیا؟"

"ہاہا" فضلو دوسری شادی کے مذاق پر کھل کر ہنسے۔ پھر انھوں نے بتایا کہ دیوالی آ رہی تھی اور بڑے پٹاخوں کی ضد کر رہے تھے۔ دیوالی، پٹاخے، کھیلیں تو کی جھوٹ دیے سب سیٹھ پٹاخوں کے لیے تو پیسہ چاہیے۔

"چھوٹے بیٹا بیٹی، پھلجھڑی، انار پٹاخے۔ مگر کل ذرا ایک سے ضرور چلے آنا۔ شرافت نے گاؤں جانا ہے۔ سب لوگ چلیں گے۔"

فضلو سے تائی ماں کی کچھ ہمیشہ چپقلش رہی لیکن پھر بھی کہیں جانا ہوتا تو ایسی وہ تھیں۔ تو اول تائی ماں، جب کہیں جانا ہوتا تو ڈھینگ کے ڈھینگ لڑکوں کی خوشامد کرتیں۔ اے بیٹا، ذرا فضلو کے ساتھ چلے چلو۔ کبھی دیہاتی بہانے کر دیتے کے بڑے نخرے دکھاتے۔ کبھی راضی ہو جاتے، کبھی اس کے باوجود نہیں ہوتے۔ فضلو سے کہہ دیا وہ آ گیا وقت سے۔ اب کی سب سامان ضرورت کے ساتھ چلے۔ اسٹیشن سے ادھر دیکھ، جہاں جا ہو جاؤ۔ فضلو یہاں گھنٹوں انتظار کرتے۔ اس وقت بھی تو یہ رہا جب وہ بیماری مر گئی اور فضلو بابا کہے جانے لگے۔ ان کے لیے رشتہ بھی بھی سینڈ پر جانا نہیں لگا۔ وہ کہتے کہتے ہوئے تائی ماں کے یہاں کام کرتے تھے۔ وہ شہر میں آئے بڑی چیز کا کرایہ، وہاں لگے ہوئے گھروں نے بچوں کو اسکول بھی بھیجنا تھا۔ بال بچے اسکول والے کام کرنے کی وجہ سے بھی کبھی تائی اماں وقت بے جا کیا کرتی تھی۔ پچھلی مرتبہ جب ظلم نے حد پار کی تو وہ جب پچاس کا بچہ بار ہو گئے تو تائی اماں کا غصہ پر شدت کا ہو گیا تھا۔

بیٹے بھی [illegible] پہنچے ہوئے ہیں۔

''[illegible] لڑکی ماں، ہم کی واسطہ نا ہے۔ بولت جات ہیں، بولت جات ہیں۔'' وہ [illegible] سے [illegible] نظروں سے [illegible] سنائی کہ [illegible] کے رشتے پر شہر میں [illegible] سوال [illegible] اسپتال [illegible] بیٹی کی [illegible] حالی تھی۔ وہ ان کے گھر پہنچے تو دیکھا گھر میں تالا [illegible] میں جا پہنچی تھیں اور وہیں [illegible] کہ بچے کو [illegible] فضلو [illegible] کی طرح وہاں جا کر بیٹھ گئے اگرچہ باہر [illegible] چھوٹا سا بچہ تھا [illegible] سے صاف کر رہا تھا۔ بچی کی ماں واپس آئیں تو بچی کو انھیں سونپ کر [illegible] فضلو اٹھے [illegible] گھر پہنچے۔ چلتے وقت [illegible] کی بیوی کو لپٹ کر [illegible] طرح [illegible] علاوہ [illegible] بچی کو چھوڑیں۔ انھوں کے [illegible] اوقات [illegible] دوڑتے ہوئے [illegible] بعد فضلو بابا اور تالی [illegible] دونوں میں اور بھی [illegible] تالی [illegible] اور چڑچڑی ہوتی تھیں اور فضلو [illegible] ناراض ہو گئیں۔ [illegible] غصے کے بنا [illegible] دیا۔

پھر [illegible] کی طرح ایک دن وہ بھی فضلو بابا کی زندگی سے [illegible] ہو گئیں۔

پہلے [illegible] سب نے [illegible] کیا، لیکن فضلو [illegible] آنسوؤں کا گول نشان دیر تک گیلا رہا۔

پھر فضلو [illegible] اور بھی [illegible] گئے اور قوی کمزور ہو گئے۔ [illegible] کشتی میں [illegible] گردن جھکائے چپ چاپ [illegible] بیٹا تھا جو [illegible] بھاگ چکا تھا۔ [illegible] وہاں درزی کا کام کرتا تھا۔ [illegible] بیٹیاں تھیں، [illegible] بیوی تب کی اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں۔ ایک [illegible] بیٹے [illegible] وقت [illegible] اور ان کی بیوی کو [illegible] انھوں نے گھر چھوڑ [illegible] بچیاں [illegible] تھی، پھر بھی انتہائی [illegible] میں [illegible] تھی [illegible] ہاتھ [illegible] میں [illegible] تھے اور [illegible] '' [illegible] سمجھ [illegible] ''شاید وہ اس عہد رفتہ میں واپس لوٹ جانا چاہتے تھے جب [illegible]

سے قوی مضبوط تھے جن سے وہاں بچے ان کے ساتھ میں محفوظ تھے اور میری پیاری بیٹا ماں بن کر ان کی کفالت کر رہی تھی۔

یا وہ محض سنیاسی تھے؟

لیکن مجھے یہ کیوں نہیں؟ میں تو فضلو بابا جتنی بوڑھی نہیں ہوں۔ نہ میرے بال سفید ہوئے ہیں نہ دانت ٹوٹے ہیں اور نہ ہی میری مت ماری گئی ہے۔ میں تو امیر خان، خطیر خان اور [illegible] کی کہانی سنانے جا رہی تھی جو خوف و دہشت پیدا کرتے اور قبروں پر ایسا راج کرتے تھے۔ یہ فضلو بابا کہاں سے درمیان میں آ گئے؟ میں بھی سٹھیا گئی ہوں کیا؟

بات دراصل یہ ہے کہ مجھے عادت ہے ان لوگوں کی کہانی سنانے کی جنہیں میں بہت قریب سے جانتی ہوں اور جن سے مجھے دلچسپی لگتی اور جن کی کہانیوں کو میں فقط متکلم بن کر لکھتی ہوں۔ میرے امیر خان خطیر خان تو ابھی بھی ختم ہونے والی داستان کے کردار ہیں۔ شاید اسی لیے کسی پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہوں۔

لیکن مجبوری ہے۔ فضلو بابا کی کہانی میں بھی کیسے ختم کروں؟ ان سے میرا رشتہ ہی ایسا ہے۔ [illegible] میں ابھی تک نہیں گئی ہوں۔ وطن چھوڑے عورتیں اپنی زبان میں دیکھتی ہیں اور ان میں بہت مزہ ہوتا ہے۔ لیکن کہانی تو مکمل کرنی ہے۔ میں نے رات کو رات کو ان کا فون [illegible]۔ تبھی فون بجتا تھا اور تیز رات کو میری آواز سن کر وہ اسے اٹھاتا ہے۔

"پھپھو کیا بات ہے؟ سب خیریت ہے نا؟"

"ہاں بیٹا! ابھی تک تو ہے۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جو آج کل خیریت سے ہیں۔"

"فون کیوں کیا پھپھو؟"

"سنو، وہ جو تھے فضلو بابا ٹچ ٹچ، میرا مطلب جنہیں بچے ٹچ ٹچ کہہ کر چڑاتے تھے، وہ آج کل کہاں ہیں، کس حال میں ہیں؟"

وہ اچانک خاموش ہو جاتا ہے، پھر ذرا رک کر کہتا ہے: "یہ رات کے بارہ بجے آپ نے فضلو بابا کا حال جاننے کے لیے فون کیا ہے؟"

"ارے کوئی سوال مت کرو، میرے سوال کا جواب دو۔"

وہ ایک طویل سانس کھینچتا ہے۔ ''آپ کو معلوم ہے پھپھو، اس کی سب سے چھوٹی بیٹی مدراس میں تھی۔ وہ اسے سب سے زیادہ چاہتا تھا۔ پچھلے سال رانچی میں وہ شدید بیمار پڑ گئی۔ [illegible] فصیح یوسف قریشی دوسرے رشتہ داروں کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ فسادات کی وجہ سے [illegible] بھی خراب تھی۔ بہار کے اسٹیشن پر جو مسافر اردو کے نام پر ٹرین سے کھینچ کر مار دیے گئے، ان میں فصیح بھی تھا۔ لاش بھی گھر نہ آ سکی۔ اور کچھ پوچھنا ہے، بڑی پھپھو؟''

میں بنا جواب دیے خاموشی سے ریسیور رکھ دیتی ہوں۔ ایک دبلا پتلا، جھکے ہوئے شانوں اور جھریوں بھرے شفیق اور مہربان چہرے والا بوڑھا نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ [illegible] پریشان [illegible] کانوں کے درمیان حیرانی کھوجتی ہوئی [illegible] پوچھتی ہوں: ''[illegible] تازے [illegible] تیار؟''

[illegible] کے ساتھ برش اٹھا کر میں ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہو جاتی ہوں۔ [illegible] سے پہلے [illegible] ایک چوٹی گوندھ لینا میری عادتوں میں شامل ہے۔ لیکن یہ کیا؟ [illegible] سے [illegible] ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ فصیح بابا کا چہرہ ابھر آتا ہے۔ [illegible] ہو جاتی ہے اور برش ہاتھ سے گر جاتا ہے۔

ندی کے پانی میں تلاطم ہے۔ بگلے [illegible] سب چھپ گئے ہیں اور خرگوش [illegible]۔

❀❀

ذکیہ مشہدی

تھوڑا سا کاغذ

ممدو ہاڑی نے اپنا ٹھیلا [illegible] صدر دروازے کے پاس لگایا تو معظم و معصومہ [illegible]
تھے، کیونکہ ممدو اتوار کو ہی آیا کرتا تھا۔

''آ گئے ممدو؟'' اندر سے معظم کی بیوی ناجور نے ذرا دور سے پکار [illegible]
آ گئی۔

''دیر لگے گی۔''

''معصومہ [illegible]'' ممدو کے لہجے میں سنجیدگی تھی [illegible] موت کے [illegible] سنجیدگی۔ وہ معظم کے والدین کے وقت میں ایک نوجوان، مسیں بھیگتا ہوا [illegible] ریشماں سلطان عرف ریشم کے ساتھ ساتھ بوڑھا ہوا تھا۔ [illegible] ہوتا۔ ناجور ان دونوں مہینوں کی ردی نکالتے وقت اچھی طرح [illegible] پھوپی کا کوئی پرچہ اس میں نہ چلا جائے۔ پھر بھی ممدو کی آواز سن کر پھوپی [illegible] اور ایک ایک کر کے ساری ردی کھنگالتیں کہ کہیں ان کا کوئی رسالہ، کوئی کتاب یا مطلب کی کوئی اور چیز ان میں نہ چلی گئی ہو۔ کبھی کبھی وہ اخبار کے تراشے بھی نکال کر رکھ لیا کرتی تھیں۔ [illegible] موقع نہ ملتا تو [illegible] تہہ کر کے الگ رکھ دیتیں۔ ایسے تراشوں کی [illegible] وہ ردی کے پاس [illegible] بیٹھ جاتیں تو [illegible] ممدو سمجھ جاتا [illegible] لیکن جب تک پھوپی ساری ردی دیکھ کر اطمینان نہ کر لیں تب تک وہ ممدو [illegible]

شمع ... تھیں۔

علاوہ دونوں میں سے ایک بھاری بوجھ سے گرا یا دونوں ایک روز دھیمی آواز سے ہاتھ رکھتی پر تھیں۔ تہذیب الاخلاق۔ معظم وہاں آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہیں سے ایک دستاویز سامنے ... مستور دو زور سے۔ ہاں ایک کتاب ان کا دامن سے ملحوق ہوا۔

دوسرا گھر: آج کل۔

تیسرا: بیسویں صدی۔

چوتھا: شمع۔

پانچواں: نقوش۔

مختلف عنوانات کا میوں کے ذریعے نکالے جانے والے پرچے، خواتین ڈائجسٹ، مذہبی سالوں کی ڈائجسٹ، دین و دنیا، آستانہ، الحسنات۔

یہ سب ان کے کھلونا کی میں پچیس سال کی مکمل فائل، ایک دو بڑے شمارے۔

"پھوپھی آپ ان ردی بیچے تو ہم دونوں کا یہاں سے دلی تک کا ہوائی جہاز کا کرایہ نکل آئے۔"

معظم کی چھوٹی بیٹی تسنیم نے، جو پھپھو کی لاڈلی تھی، ایک مرتبہ کہا تھا۔

پھپھو ناراض نہیں ہوئیں، مسکرا کر بولیں: "دلی جا کر کیا کرو گی بیٹی؟"

"کچھ بھی کریں۔ ہوائی جہاز پر مفت میں چڑھ تو لیں گے۔ ردی تو کر یاد سے رہیں۔"

"میری ساری دولت ردی لگتی ہو؟" پھوپی کبھی کبھی سنجیدہ بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

"ویسے تو یہ سب ... ہم کے وقت کی کتابیں۔ سنہ چھیالیس تک میں چھپے ہوئے رسالے۔ جیسے سب دو سال پرانے رکھ بھی لیے، لیکن سنہ چھیالیس!"

"یہ سب کے وقت کے ہیں بیٹا۔ وہ پابندی سے لیا کرتے تھے۔ ہم نے سنبھال کر رکھا ہے۔"

"اٹھارہ سو چھیالیس کے پھوپی؟" بڑی بیٹی نوشین نے لقمہ دیا اور دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

"اٹھارہ سو چھیالیس میں ہماری پھپھو نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہ پہلی کی پہلی مسلم خاتون تھیں جنہوں نے ... تعلیم حاصل کی۔" نوشین نے بالکل کسی نیوز ریڈر کے انداز میں بیان کیا۔

"اٹھارہ سو چھیالیس ... ارے میں اتنی پرانی لگ رہی ہوں؟ انسان ہوں یا بھوت پریت؟" وہ

... سے نہیں۔

"آپ اردو [illegible] پڑھتی ہیں، [illegible] میں [illegible]" [illegible] آپ

سے [illegible]۔

"چیپ [illegible] سوالات تو [illegible] نہیں [illegible]"

"یہ بات [illegible] لگتی ہے؟ [illegible]"

"اردو کیوں نہیں پڑھتیں؟"

"پڑھتے تو تھے!"

"پڑھتے تو تھے، [illegible] ایک ہفتے تک [illegible] صاحب سے ساتھ رہے [illegible] تھی۔ میرے [illegible] پڑھو [illegible] اتنی اچھی اچھی کتابیں [illegible] میں [illegible] تمہارے [illegible] چھوڑی ہوئی، اچھی خاصی لائبریری ہے۔"

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف آنکھوں ہی آنکھوں میں دیکھا [illegible] سے

"چلو ہو گئی پھوپھو!"

"[illegible] درست ہے، لیکن اب یہ سب کون پڑھتا؟" ایک مرتبہ معظم نے [illegible] تھے۔ داستان امیر حمزہ، قصہ چہار درویش، فسانہ آزاد، سیر کہسار، شریف زادہ، ابن الوقت، امراؤ جان ادا، علامہ راشد الخیری [illegible] اردو [illegible] صدیقی [illegible] تصنیف [illegible] مصنفین کے اردو ترجمے [illegible] کتابیں خریدتے تھے [illegible] ادب، تاریخ، فلسفہ، حکمت [illegible] ملازمت کے سلسلے میں کافی دن پنجاب رہ چکے تھے۔ وہاں ان کے ایک بزرگ دوست تھے [illegible] جو اردو کے عاشق تھے۔ سینکڑوں کتابیں جمع کر رکھی تھیں۔ [illegible] بولے، "خاندان میں میرے بعد ان کتابوں کا کوئی قدردان نہ ہوگا۔ صدیقی تم مجھ سے عمر میں چھوٹے ہو، تم انہیں لے جاؤ [illegible] سوچ کے افسوس ہوتا ہے [illegible] ردی میں بکیں گی۔"

"آپ سمجھتے ہیں میرے بعد میرے یہاں قدرداں ہوگی؟"

Scanned with CamScanner

"امید تو ہے۔"

"امید فضول ہے آپ کی۔"

اماں سے جو چیدہ کتابیں آئے تھے، بمشکل ایک فیصد، پھر بھی ایک بڑا ڈھیر تھیں۔

کاٹھ کباڑ اکٹھا کرنے کی عادت ٹھہری۔ اعظم نے دل ہی دل میں کہا تھا۔ اب وہاں عمر رہے ہیں، پہلی جیسی جگہیں کہاں۔ تاہم اعظم کی نسل اور ماؤں میں برملا گستاخی سے پرہیز برتتی تھیں۔ اس نے ناک بھوں تو چڑھائی لیکن بولا کچھ نہیں۔

اماں کی کتابوں میں ان کتابوں کا اضافہ کر کے وراثت کو سنبھالا تو رشمہ پھوپی نے۔ جب یونان، فلسفہ، ویدوں اور گیتا کے اردو فارسی ترجمے۔ ابا کسی وقت تصنیفات پڑھتے رہتے تھے۔

"آپ یہ پڑھتی رہتی ہیں؟" اعظم اپنی زیرِ لب مسکراہٹ کے ساتھ کہتے۔

"پھپھو، گرد دیمک چاٹی کتابوں والی الماری خالی کر دیں تو اس میں شیشے لگوا کر ڈرائنگ روم میں رکھوا دیں۔ بیوی نے تو سارے ڈیکوریشن پیس اکٹھا کر رکھے ہیں۔" اعظم کے بیٹے نے کئی بار تجویز پیش کی تھی۔

کتابیں بے شک دیمک چاٹی تھیں اور بڑی ہی غیر دلکش جلدوں والی، لیکن دادا کی چھوڑی ہوئی الماری تو آبنوس کی لکڑی کی تھی۔ پرانے طرز کی نقاشی والے بھاری فرنیچر کا عمدہ نمونہ۔ وہ تو بذاتِ خود ایک آرائش تھی۔

"اب کی آموں کی فصل بک کر میرے حصے کے روپے آئیں تو میں ان سب کتابوں پر خوبصورت چمڑے کی جلدیں چڑھوا دوں گی اور الماری کے درمیانی حصے میں شیشے لگوا دوں گی۔ پھر تم اسے ڈرائنگ روم میں رکھوا لینا۔" پھوپی نے پیشکش کی۔

"پھپھو کی تو بات ہی وہ نرالی۔" اعظم نے منہ بچکا لیا۔ "بھلا ان کتابوں پر مزید پیسے پھینکنے کی کیا ضرورت ہے! اسے کہتے ہیں، گوبر میں گھی سکھانا۔"

پھپھو کو اس گوبر میں گھی سکھانے والے محاورے سے قلبی اذیت پہنچی۔ دل میں قیمت لگانے والے یہ آج کے نوجوان گوہر کو گوبر سے تشبیہ دے رہے ہیں۔ انھوں نے گلے میں پھنستے گولے کو نگلا۔

'ایں چہ شوریست کہ در دورِ قمر می بینم'

ان میں تو شاید ضابطے یہ بھی رہا تھا کہ لڑکیاں ماں کی بات نہیں مانتیں اور بڑے بزرگوں سے ساتھ بے ادبی سے پیش آتے ہیں۔ پرانی اور نئی نسلوں کا ٹکراؤ تو صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ مگر پھوپی اور ان کی ماں نے جو ٹکراؤ تھا وہ بادی النظر میں نظر نہیں دیتا تھا، اس لیے کہ اس وقت کی قدامت پرستی خواہ کتنی تھیں لیکن وہ رنجیدہ اس کی جرأت نہیں دیتی تھیں۔ اور یہ بھی تھا کہ اماں [illegible] حال تھیں۔ پھوپی سوچتی تھیں وہ پڑھی لکھی ہیں۔ وہ جب ماں بنیں گی یا بڑی ہوں گی تو ان کے اور اگلی نسل کے درمیان خیالات و افکار کا یہ بعد نہیں رہے گا۔

لیکن خیالات و افکار کا بعد یا محض تعلیم کے ہونے نہ ہونے سے پیدا ہوتا ہے یا زمانہ خود بخود پیدا کرتا ہے۔ رسم و رواج، زبان، تو اس میں نئے الفاظ آجاتے ہیں، طرز میں تبدیلی آئے لیکن زبان نہیں مرتی ہے۔ جیسے [illegible] ہی معظم کی دلہن کا ہو تھا [illegible] کہ بچوں کو اردو پڑھوائیں۔ وہ [illegible] نہیں۔ آپ ریشم، سب آج کل ریڈیو ٹی وی فرصت کہاں ہے۔ اور کورس دیکھیے۔ [illegible] کورس میں تنا سائنس پڑھ رہے ہیں [illegible] میٹرک میں بھی نہیں پڑھا تھا۔ جب یہ تینوں بچے پروفیشنل کورسز کے [illegible] کی تیاریوں میں لگے ہیں۔ اس [illegible] تھکن کی محنت [illegible] اسٹیٹیوٹ [illegible] تاجور [illegible] تھی۔

مگر پھوپی نے [illegible] کا ارادہ ترک کر دیا کہ اپنی تہذیب، روایات اور زبان کی اہمیت کی [illegible] اور جس زبان کو بولنا آتا ہے، اسے لکھنا پڑھنا سیکھنے میں کتنا [illegible] صرف کرنا ہے [illegible] دیکھ کر صرف آدھ گھنٹہ [illegible] کافی ہوتا۔ مگر یہ تینوں جب کورس کی پڑھائی ختم کر لیتے ہیں تو کوئی انگریزی ناول لے کر ٹی وی کے سامنے بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ ناول اردو کا بھی ہو سکتا ہے۔

تاجور کی [illegible] کتنا بھی جھنجھلائیں لیکن شوہر کی ماں جیسی بزرگ، بڑی بہن سے بھی مدینہ کی سے بات نہیں کی تھی۔ پھوپی کو اس کا خیال تھا۔

مدینہ کی تو اپنی بچی مریم ہی کرلیا کرتی تھی۔ وہ تقریباً معظم کی عمر کی تھی۔ ریشم پھوپی بھری جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں۔ مریم اس وقت بہت چھوٹی تھی۔ ماموں جانی ساتھ کھیل کر بڑے ہوئے تھے۔ جب ماں کا جلدی انتقال ہوگیا تو ریشم پھوپی نے معظم کو ماں کی کمی کا احساس کبھی نہیں ہونے دیا

تھا۔ پھوپھی کے شوہر بھی سرکاری ملازمت میں تھے۔ ان کے بعد پنشن ملتی رہی۔ آبائی جائیداد میں بھی پھوپھی کا حصہ تھا۔ اس لیے جب معظم کا اپنا سب ہوا اپنے ہو گئے تب بھی پھوپھی نے ہاتھ سے پیسہ خرچ نہیں کیا۔ وہ کسی پر بوجھ نہیں تھیں۔ ریشم کی شادی میں بہت وقت پیش آئی۔ مگر جس کا چہرہ دیکھ دیکھ کر انھوں نے جوانی کاٹ دی تھی وہ بچی شادی ہونے کے چند ہی سال بعد امریکہ روانہ ہو گئی اور اس میں اس کے شوہر سے زیادہ اس کی اپنی خواہش کا دخل تھا اور اب وہ چکا چوند کا، ڈالر کے بے پناہ پیسہ کمانے کے امکانات کا۔ تب سے وہ بے حد بدلی بدلی رہا کرتی تھیں۔

دل بہلانے کے لیے انھوں نے محلے کی بچیوں کو مفت اردو پڑھانی شروع کر دی تھی۔ وہ چند دن آتیں، پھر غائب ہو جاتیں۔

اردو کی بجائے، انگریزی، میتھس وغیرہ پڑھاؤ تو بیٹیاں آئیں گی، معظم کی تجویز تھی

ان مضمونوں کے لیے وہ پیسہ خرچ کریں گے، اردو مفت پڑھاتی ہوں اس لیے وہ چھوڑ جاتی ہیں۔" ان کی دلیل تھی۔ "اردو سے نہ سکھا کر نوکری نہیں ملتی۔"

مریم نے ان سے کئی بار کہا کہ وہ امریکہ آ جائیں۔ ایک بار گئی تھیں۔ ایسا لگتا ہے کہ ویزے کی مدت پوری ہونے سے پہلے بھاگ آئیں۔ پھر انھیں یہ بھی احساس ہوا کہ مریم کے اصرار میں شدت اس وقت آئی تھی جب اس کے یہاں بچہ ہونے والا تھا۔ پھر اس کی ایک سسرالی عزیزہ خاتون نے، جو عمر دراز، کنواری اور بھائیوں پر بھاری تھیں، امریکہ جانا منظور کر لیا اور اس کے یکے بعد دیگرے ہونے والے تینوں بچوں کو سنبھال دیا، تب مریم نے ان کو امریکہ بلانے کی ضد چھوڑ دی۔ وہ تین سال میں ایک بار خود ہی پندرہ دن کو آ جاتی تھی۔ ہفتہ بھر سسرال رہتی اور ہفتہ بھر ماں کے پاس۔

"تنہائی بہت ہے۔" ریشم پھوپھی ٹھنڈی سانس لے کر کہتیں۔

وہ چلی جاتی تو اس کا انتظار شروع ہو جاتا۔ ایک ایک دن گنا کرتی تھیں۔ کبھی دو سال تک تیرہ سو تیس دن اور کبھی تین سال کے ایک ہزار پچانوے تیس تھوڑے سے اور تب مریم اور اس کے بچوں کی صورتیں دکھائی دیتیں۔

مریم نہیں تھیں، دوست تا بعد مت رکھنا اردو شعر پڑھنا۔ انھوں نے ہمیشہ کہا تھا۔

[illegible]

[illegible] جائیں گی کوئی چھوٹا سا۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible] اور کاغذ قلم

[illegible] ساتھ صفحات پر ہو گئے۔

دو مہینے بعد پھوپی کو دوسرا دورہ پڑا جو ان کے لیے مہلک ثابت ہوا۔

مریہ کو فون کیا گیا تھا لیکن اس کی فلائٹ سات گھنٹے لیٹ ہو گئی تھی۔ پھوپی وہ سات گھنٹے نہیں جھیل سکیں۔ ان کا پورا وجود تنے ہوئے اعصاب کا گچھا بن چکا تھا۔ ان کی آنکھیں دروازے پر تھیں اور لب "مریہ" کا ورد کر رہے تھے۔

مریہ پہنچی تو وہ ابدی نیند سو چکی تھیں۔

"کتنی بار کہی ہے کہ میرے ساتھ چل کر رہیں، نہیں مانیں۔ نواسے نواسیوں کا منہ بھی دیکھ لیتیں،" مریہ نے دل گرفتہ آواز میں دوسری بار کہا تو تاجور بے حال ہو گئیں۔

"یہاں انھیں کوئی تکلیف نہیں تھی مریہ۔ سچ میں بھی ہم نے کوئی کوتاہی نہیں کی،" تاجور نے لہجے کو نارمل رکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"میرا مطلب یہ نہیں تھا ممانی۔ میری صورت نہیں دیکھ سکیں۔ تاسف تو یہی، بس اس کا ملال ہے۔"

تاجور شرمندہ سی ہو گئیں۔

چالیسویں کے بعد مریہ نے واپس جانے کی تیاریاں شروع کیں تو تاجور نے واضح الفاظ میں کہا، "مریہ اپنی امی کا سامان دیکھ لو۔ اب نہ جانے کب آؤ گی۔ آگے چل کر کوئی تنگی نہ ہو۔"

"آپ جیسا چاہیں،" مریہ نے مختصر سا جواب دیا۔

رشمہ سلطان المعروف بہ رشم پھوپی نے باقاعدہ وصیت تیار کر رکھی تھی۔ غلاف میں سے نکلا۔ دو چار کچی زری کی بھاری ساڑیاں اب بھی موجود تھیں۔ ان کے حصے کا آموں کا باغ تھا، وہ مریہ کے بچوں کا تھا۔ معظم کے بیٹے کے لیے انھوں نے اپنی پوری نقد رقم چھوڑی تھی جو اچھی خاصی تھی۔ باقی چیزوں کے لیے بھی واضح ہدایات موجود تھیں، مثلاً ہاتھی دانت کا بیش قیمت فوٹو فریم، حمیدہ کا قلمدان، وغیرہ وغیرہ۔ کتابوں کے لیے انھوں نے لکھا تھا، "جو ان کی قدر کر سکے وہ انھیں رکھے۔"

"لے جانا چاہو تو یہ کتابیں دیکھ لو،" تاجور نے سرسری طور پر کہا تھا کہ کتابیں آخر مریہ کی ماں کی ملکیت تھیں۔ جواب تو انھیں معلوم ہی تھا۔

وہ پھیکی سی ہنسی ہنس پڑی۔ "کیا بات کرتی ہیں ممانی! میں کیا کروں گی ان کا؟ اور اب انھیں لے جانا ممکن ہے؟"

''مریم، تمھارے ماموں یہ پرانا مکان بیچ کر کسی اچھے علاقے میں فلیٹ لینے کی بات کر رہے ہیں۔ دراصل پہلے ہوا اور پھر ان کے بعد ریشم آپا کے جذبات کا خیال کر کے ہی خاموش تھے۔ تم سمجھ سکتی ہو، فلیٹ میں اتنی گنجائش کہاں۔ تمھاری بی بی کے کئی ٹرنک کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ پھر یہ بڑی سی لوہے کی الماری ہے، دو، سٹیل کی چھوٹی الماریاں ہیں'' وہ بولتے بولتے یکدم خاموش ہو گئیں۔

''اس سلسلے میں آپ جو چاہیں کریں، میں بھی کوئی جواب نہیں طلب کروں گی۔'' مریم نے ان سے بجھے دل سے کہا اور اگلے ہفتے واپس چلی گئی۔

معظم سے کوئی دس بیس کتابیں، جو نایاب تھیں اور جن پر پھوپی نے خوبصورت جلدیں بندھوا رکھی تھیں، شیشے کی الماری میں آرائشی سامان کے ساتھ رکھنے کے لیے الگ کر لیں۔ ویسے ان سے ان کی یادیں بھی وابستہ تھیں۔ ریشم دو انگریزی رسالے بھی لیا کرتی تھیں، نیشنل جیوگرافک اور ریڈرز ڈائجسٹ۔ ان کے پانچ سات شمارے تاجور نے رکھ لیے۔ ردّی کے لیے انھوں نے محمود کو بلا بھیجا۔

آنکھیں پونچھتا محمود ٹرک تو نہیں، ہاں بڑا سا ٹھیلا ضرور لایا تھا۔ ساتھ میں اس کا بیٹا بھی تھا۔ دونوں باپ بیٹا لنگی چڑھائے صبح سے دوپہر تک ردّی چھانٹ کر الگ کرتے رہے۔ مجلد کتابوں کی جلد علیحدہ کر کے تولا گیا۔ ان کتابوں اور پرانے رسالوں کے دام سوا روپے فی کلو لگائے گئے۔ تاجور کے احتجاج پر محمود نے کہا، ''پانچ روپے کلو اخبار بکتے ہیں دلہن بی بی، وہ بھی اس لیے کہ ان سے لفافے بن جاتے ہیں۔ ان کتابوں کا کیا مصرف ہے؟ ہاتھ لگاؤ تو کاغذ جھڑتے ہیں۔''

تاجور جھینپ مٹانے کو پوچھ بیٹھیں، ''وہ ان کا کیا ہوگا؟ آخر خرید کر تم کیا کرتے ہو؟''

''وہ اب ہم آپ کو بتائیں گے؟ ان سب کی لگدی بناتے ہیں، دوبارہ کاغذ بنتا ہے۔''

قبر میں ریشم پھوپی نے کروٹ بدلی۔

ہاں، انھیں ری سائیکل کیا جائے گا۔ اس پر لکھے سارے حروف مٹ جائیں گے۔ لگدی بن کر ان کا کاغذ بنے گا   کورا کاغذ   لیکن کیا کوئی تھوڑا سا کاغذ اردو لکھنے کے لیے بھی مانگے گا؟

کوئی میر، کوئی غالب، کوئی فیض، کوئی عصمت، کوئی قرۃ العین؟

ان کی بے چین روح چکراتی پھر رہی تھی۔

※※

ذکیہ مشہدی

منظورروا

پٹنہ والی چچی اسے منظورا کہتی تھیں، امرود والی ممانی 'میاں' اور محلے کی عورتیں منظور رے۔ یہ تینوں القاب ہم معنی تھے۔ جہاں کام دھندے سے فارغ ہوا، ان عورتوں کے درمیان آ بیٹھا اور ان کے منہ لگ کے بیٹھیں ہانکی شادی کہیں۔ "ارے منظور ذرا سنیو" [illegible] والی قسم ہم نہیں [illegible] ہائے دیکھو چچی [illegible] سوٹ سے سید [illegible] وہم رنگ دیتے ہیں۔"

"[illegible] سب بڑے بہت گنجلک [illegible] یہ میرا دوپٹہ رنگے گا!" باہر اگر یہ مرد ہو یا عورت لیکن گھر کے اندر ان کی آنکھوں کے سامنے ایک جوان مرد ان کا دوپٹہ رنگے، چچی کی حیثیت سے ذرا جھک جاتی تھیں۔ [illegible] مرد [illegible] گھر [illegible] تھا۔ [illegible] ہمیشہ سوکھے پڑے رہتے [illegible] کی کارکردگی کا موجب بڑھتے رہتے۔ [illegible] پر لگے نل میں پانی آتا تھا۔ غریب غربا ان کا پانی بھر دیتے اور اپنی [illegible] کے پیچھے رہ جاتے۔ جو منظور مسجد روانہ ہوتا تو گھر میں [illegible] سویرے ہی [illegible] کرتا تھا۔ جیسوں [illegible] پانی بھرنے کے بعد بھی تر و تازہ [illegible] سب ہنسنا، مذاق کرتے۔ [illegible] کی [illegible] محنت کشی کی گواہ تھیں ورنہ پھٹے کپڑے [illegible] حالی [illegible] اس قدر نیت اور [illegible] کا [illegible] تھی کہ گھر کی جوان بہوئیں تک [illegible] بے تکلف چھیڑ [illegible] تھی۔ [illegible] کی [illegible] زیادہ [illegible] تو [illegible] حصہ [illegible] تو ان [illegible] اماں کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ "کاہے چچی" وہ ان سے [illegible] [illegible] کی ترکاری، روٹی اور ایک بڑا مگ بھر کے چائے۔" [illegible] چچی [illegible] میٹھی ہے کھاری؟ ابھی تک ہے۔ میٹھی نہیں ڈالیو کا؟"

’’... ٹھیک، اب لگتا ہے نا عجیب کا سا ...؟‘‘

’’عجیب نہیں [illegible] سی لگتی

’’[illegible] اور [illegible] کا‘‘

منظور کی [illegible] تھی۔ سب سے زیادہ [illegible] کرتی تھیں۔ [illegible] بہت [illegible] پانی [illegible] ہوتی۔

آج بھی منظورو [illegible] پڑھ رہی تھیں [illegible] خدا [illegible] منظورو [illegible] اسے چپ چاپ بیٹھیاں اٹھاتے [illegible]۔

منظورو [illegible] ہوئے نہیں [illegible] ہوا ہے؟ سانپ کیوں سونگھ گیا؟‘‘ نور بیگم نے [illegible] چھیڑا۔

وہ [illegible] اٹھاتے [illegible] آنکھوں میں خوف تھا [illegible] عمل کر [illegible] ہیں۔

’’جو بی [illegible]‘‘ نور میاں نے [illegible] ان کی [illegible] سے مخاطب [illegible] تھیں اور [illegible] رہے تھے۔ [illegible] معلوم ہوا کہ [illegible] بڑی بی بی کو کسی نے مار دیا ہے۔‘‘

’’اے ہے [illegible] ہو؟‘‘ اماں جو [illegible] میں [illegible] یکلخت پلٹ آئیں۔

Scanned with CamScanner

"ہاں بیچاری امو بوا، بوڑھی آدمی، سو برس کی عمر، کچھ دنوں میں خود ہی مر جاتیں۔ ان سے کیسی دشمنی! جان سے مار دیا بیچی۔"

"ارے، سو برس تو تو جیے گا قیامت کے بورے بیٹھے کو۔ ساٹھ ستر کی ہوں گی، کہہ رہا ہے سو برس کی!" انور بھیا نے لقمہ دیا۔

منظور کو سخت حیرت ہوئی — بھیا کو مطلق افسوس نہیں۔ "بیچاری... بڑی بھلی مانس تھیں۔" اس نے اتنا ہی کہا۔

"تھیں تو بھلی مانس، مگر تو وہاں کیا کر رہا تھا؟"

"ہم وہاں کھڑے افسوس کر رہے تھے۔"

"کر چکا افسوس؟ جا اب پانی بھر۔"

"پانی تو ہم بھر ہی دیں گے، ہمارا کام ٹھہرا، مگر شیاما دیوی کی موت کا افسوس تو ہمیشہ رہے گا۔"

"یہ اُلو کا پٹھا ایک ہندو بوڑھی عورت کے قتل کا افسوس کر رہا ہے جو بقول اس کے چند دنوں میں خود ہی مر جاتی۔ اچھا ہے جو نرا جاہل ہے، اخبار نہیں پڑھتا، ورنہ اب تک افسوس کرتے کرتے مر چکا ہوتا۔"

"افسوس کی بات تو ہے میاں،" اماں رسان سے بولیں۔ "جائیداد کا جھگڑا بہت دنوں سے سننے میں آ رہا تھا۔ سنتا ہے، سوتیلے بیٹوں پوتوں میں سے کسی نے..."

"انھوں نے بھی کم نہیں ستایا تھا سوتیلی اولادوں کو۔ نگوڑی، ناٹھی، اکیلی، اپنی تو کوئی اولاد تھی نہیں۔ دولت مندی پر دوسری شادی بھی اسی لیے کی تھی۔ مگر جائیداد کی ہوس میں سب سے کڑی تھی۔ اب یہ جائیداد ساتھ لے گئیں؟" بھیا کا لہجہ بے رحم تھا۔

"پھر بھی اماں، تھیں وہ دادی جیسی۔ کیا زمانہ آن لگا ہے،" منظورا نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

دراصل منظورا کو سن گن کی خبر نہیں ہے، اپنی دنیا میں رہتا ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ کیسے کیسے ہائی فائی دماغ لوگوں نے مارنے کی اعلیٰ درجے کی تکنیکیں، نسل کشی کے منصوبے، اور پھر نسل کشی کو سب اقرار واجب کر چکے تھے۔ بے منظورا، احمق الذی، پانی بھر، تیرے میرے گھر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ دریں اثنا ہمیں تمام وحشیوں کی خبر دو، تم کسی اندھیری گلی میں مار جاتے تو دیوی کی مندر یا بولی مذہبی دلی

کے قتل پر افسوس کرنا بند کردے گا۔

منظورو کے گلے چار پانچ دنوں تک گاندھی جی کی تعریف ہوتی رہی۔ پھر وہ بی بی کے اوصاف حمیدہ اور ان کے سوتیلے بیٹے پوتوں کے اوصاف خبیثہ کا ذکر کرنے لگ گیا اور ساتھ ساتھ انور بھیا کی بے حسی پر حیرت بھی کرتا رہا۔ پھر وہ اپنی اصلی جون میں واپس آ گیا۔

ان کا دل سب سے زیادہ اسی گھر میں لگتا تھا۔ یہیں ڈھیر سارے لڑکے بالے تھے، ڈالی جو جیالیاں اور ... آخری ہفتے کی شفاف اور نرم دھوپ میں وہ سارے بچوں کو اکٹھا کر کے آنگن میں گھوم گھوم کر ناچتی رہتی اور تالیوں کی تال پر کہہ رہی تھی: "کل انگریزوں کا نام مٹا دیا ہے" پھر وہ چیخ پڑی: "پاکستان زندہ باد" اور سکھ سے پڑھائے بچے کورس میں بولے: "ہندوستان چھوڑ دو۔"

دوسرے کمرے میں بیٹھے انور بھیا کو جیسے کسی نے گالی دے دی۔ وہ تلملا کر باہر نکل آئے اور سیدھے منظورو کی گردن میں ہاتھ دیا۔

"کیوں بے یہ کیا کہہ رہا ہے اور کب سے سیکھ کر آیا ہے؟"

بھیا کا لہجہ اتنا درشت تھا اور گردن پر گرفت اتنی سخت کہ منظورو بالکل بدحواس ہو گیا۔ "سونیا بھیا ہو؟" وہ تو فرصت کے اوقات میں لڑکے بالوں کو سمیٹ کر ہمیشہ یہی کرتا آیا ہے۔ "اتنی بار بالکل بچے تمہیں ... " ... "برسوں رام دھن کے بڑھیا گھر کی ... سے" ... دین محمد بڑی ... بہت "محمد دین" ... ہیں" ... اسی نے محلے کے ... دین محمد نے بھیا سے شکایت کی تھی تو بھی بھیا اتنے ناراض نہیں ہوئے ... بھی ناراض نہیں ہوئے تھے، جیسے اب ہو گئے تھے۔

"یہ تم سب کہاں سے سیکھ کر آئے ہو؟" بھیا نے آنکھیں تریریں۔ وہ واقعی خفا تھے۔

"تیرا چھٹی سے ... مکان کی بغل میں جو بڑا میدان ہے وہاں بہت سے لونڈے کھیل رہے تھے اور نعرے لگا رہے تھے۔ ہمیں بڑا مزہ آیا۔ کوئی بری بات ہے کیا بھیا؟"

"یہ ... بہت بڑا بادشاہ تھا، ... یہاں کا نام ... تو پاکستان کے یہاں کام کیوں کرتا ہے؟"

"بھیا! ہمیں جو پیسہ دے گا ہم اسی کے یہاں کام کریں گے۔ ... آپ کا گھر چھوڑ دیں ..."

[illegible] کا [illegible] نہیں ہے۔ [illegible] لوگوں نے سب گھر پمپ لگوائے ہیں۔ اب وہ ایک [illegible] سے پیٹ کیسے بھرے گا؟"

[illegible] ہاں [illegible] کا [illegible] اس طرح کی باتیں [illegible] بھیا سے [illegible]

[illegible] بھیا [illegible]

[illegible] ایک [illegible] [illegible] کھینچ [illegible] وہاں [illegible]

[illegible]

"[illegible] استاد کا نام [illegible] عبدالرحمٰن۔"

"[illegible] کا پورا نام [illegible] رحمت [illegible]؟"

[illegible] بھیا [illegible] غصہ ضبط کرتے ہوئے [illegible]

[illegible] رحمت اللہ [illegible] ناموں میں لگایا جاتا ہے۔"

[illegible] تھے، اور [illegible] تھے، تمام [illegible] بڑی [illegible]

[illegible] کی طرف [illegible]

[illegible] ہاتھ چومے۔

بھیا [illegible] غصہ ضبط کرنا پڑا۔ "[illegible] فقیر نہیں تھے، بادشاہ تھے۔ بڑے [illegible]

[illegible] پڑھنے لکھنے کے شوقین، عالموں کے قدردان۔"

[illegible] بھی کرتے ہوں گے تب تو [illegible] "منظور [illegible]" [illegible] اچھا ہوتا جو ہم

[illegible] وقت میں پیدا ہوئے ہوتے۔ [illegible] شادی بھی ہوگئی ہوتی۔"

[illegible] جب بھی [illegible] رہتا۔ [illegible] کی مشک میں پانی بھر کر [illegible] گلیوں میں

[illegible] جاتا [illegible] میں [illegible] میں [illegible] تو پھر [illegible]

فوج میں سب سے آگے [illegible] ہوتا۔"

منظور [illegible] ہوگیا۔ وہ یہ سوچ سوچ کر سارے دن [illegible] بادشاہ کے

وقت میں [illegible] بادشاہ سلامت بھی [illegible] قسمت [illegible] بگاڑ [illegible] کچھ بھی [illegible] بادشاہ

تم سے [illegible] سب سے لینا ضروری ہے۔ [illegible] پوچھتی [illegible]

الرحمٰن اور خیر دار جو [illegible] شادی نام [illegible] بات [illegible]

منظورو ابھی [illegible] منظورو تو جنت میں ہوگا [illegible] ساتھ [illegible]

لے جائے گا رام لیلا دکھانے؟"

تایا جی کی بہو [illegible] کان کھڑے ہوتے۔ "ارے منظورو، [illegible]

[illegible] مندر [illegible] کتنے ہندوؤں [illegible]

[illegible] میاں [illegible] گھر میں [illegible]

[illegible] تمہارا [illegible] کام کر رہا ہے۔ [illegible] گھر میں تمہارے [illegible]

نہیں [illegible] اعتراض ہے؟ [illegible] مسئلے [illegible]

ایک وقت میں [illegible] تھے، اس پر بھی کام چھوڑی۔ [illegible] تو نہیں [illegible]

[illegible] ہندو مسلمان [illegible] اب [illegible] جو بچوں [illegible]

[illegible] کا"

[illegible] پر ہاتھ رکھ کر کھانستی [illegible] تو سمجھا [illegible]

دیکھو رے منظورو، ایسی [illegible] باتیں کرے گا تو نکال باہر [illegible] بھیا [illegible]

تجھ پڑھا [illegible] ہمارے مندر [illegible] تھے۔"

منظورو [illegible] ٹوٹ پڑا۔ "تب بھوجی؟"

"تب" [illegible] جی کی بہو کے چہرے پر [illegible] تھی۔

لیکن تب [illegible] کیوں کہہ رہے تھے؟ بھیا بھی پڑھے لکھے ہیں اور بھوجی بھی پڑھی

لکھی ہیں۔ منظورو کے دماغ میں [illegible] پڑ گئے۔ یہ تو اچھی بات نہیں ہوئی۔ [illegible]

بھی [illegible] آئی۔ مندر بھی کیوں [illegible] جائے؟ وہاں تو [illegible] کرتے ہیں۔ [illegible]

چاہیے۔ یہ خیال تو ابھی منظورو کے ذہن کے آس پاس بھی نہیں پھٹکا تھا۔

"اچھا چل۔ یہ پکڑ راشن کارڈ اور گیہوں پسوا لے آ۔" بھوجی کا چہرہ [illegible]

خیال آیا کہ [illegible] رہا ہے مکار [illegible] مسلمان [illegible]

ہی مکار ہے، مکار اور دغا باز۔

راشن کا ڈبہ تھام کر منظورو وہیں اطمینان سے بیٹھ گیا اور چھوٹی نکال کر کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ "ابھی اذان نہیں ہوئی ہوگی۔" تھیلا ٹٹولتے ہوئے اس نے اعلان کیا۔ "ہم تھوڑی دیر بعد جائیں گے۔"

بھوجی کا پارہ دو درجے چڑھنے لگا۔ "منظورو! یہ تیرے بابر نے مسجد ہی نہیں توڑا بلکہ ہمارا مندر توڑ کر وہاں اپنی مسجد بھی بنوائی۔"

"ہائے اللہ بھوجی، کہاں؟"

"اجودھیا جی میں۔ خیر، ہم اپنا مندر تو واپس لے ہی لیں گے مگر کان کھول کر سن لے۔ یہاں کام کرنا ہے تو خبردار جو اس چنڈال کا نام لیا۔ لٹیرا کہیں کا۔"

"بابر کا نام تو آپ ہی کے گھر سنا بھوجی۔ ہم تو جانتے ہی نہیں تھے اللہ قسم۔"

"جھوٹا، ملنگا! ابھی کیا کہہ رہا تھا کہ بابر صوفی پیر تھا؟ جوتے مار کر باہر کر دوں گی۔ جھوٹ بولتا ہے!"

تجاوز تو منظورو کو کئی سال سے بھی پڑتی رہی تھی لیکن آج بھوجی کے لہجے میں جو تحقیر اور چہرے پر جو خشونت تھی وہ اسے کہیں اندر تک چبھ گئی۔ پہلی ساری ڈانٹیں وہ شربت کے گھونٹ کی طرح پی جاتا تھا۔ ان میں نہ ایسی تحقیر تھی، نہ ایسی دھمکی، نہ ایسی نفرت، بلکہ وہ ساری جھڑکیاں ایک اپنائیت کے ساتھ دی جاتی تھیں کہ اسے محسوس ہوتا تھا وہ اس گھر کا ایک ناگزیر حصہ ہے؛ لیکن آج بھوجی کا سخت چہرہ ایسا دھاردار خنجر تھا جس نے اس گھر سے اس کی ڈور کاٹ دی تھی۔ باتونی خوش مزاج، ہر وقت مسخرہ پن کر کے سب کو ہنسانے والا منظورو بہت اداس ہو گیا تھا۔

اس کی زندگی غربت میں کٹ رہی تھی۔ کوئی قریبی رشتے دار آس پاس نہیں تھا۔ کوئی ایسا ساتھی نہ تھا جسے وہ اپنا کہہ سکے۔ شدید آرزو کے باوجود ابھی تک بیوی بھی نہیں ملی تھی۔ پھر بھی وہ خوش تھا۔ کوئی دکھ اس کی زندگی میں نہیں تھا، نہ کوئی بڑی آرزو۔ اب یہ بابر نہ جانے کہاں سے پیدا ہو گیا تھا۔ آسمان سے ٹپکا تھا یا زمین سے اُگا تھا، یا تاریخ کے ان صفحات سے چھلانگ مار کر نکل آیا تھا جنھیں منظورو نے کبھی نہیں پڑھا تھا۔ یہ مصیبت تو بیچ ... بڑی مصیبت نہیں، بابر علیہ الرحمۃ۔

نور بھیا تو کہیں باہر نکلے ہوئے تھے۔ دل کا دکھ ماں سے کہہ کر اس نے بھڑاس نکالی چاہی۔ وہ بہت ہی پریشان تھا۔

”ارے منظوروا، پالی صرف میرا دماغ کا ہے کو خراب کر رہا ہے۔ ارے ہاں، یاد آیا۔ ارے تھی وہ ترپاٹھی کی بہو؟ مسجد توڑنے گئی؟“ ارے ان سب کا کیا ہے۔ تعداد پر اترتے ہیں۔ کہیں دور دراز کی تو نہیں مسجد۔ مگر مسلمان بھی ہیں یہ نمبر دو بر نہیں ہیں۔ ارے بھیا تو درزن بچوں کو ساتھ لے جا کے خریدواوے ان سے۔ منتھان نے دماغ خراب کر رکھا ہے مگر انھوں دلتے ہیں کہ روٹی کی فرق نہیں۔ ہاتھ میں دم ہے۔ کتابوں کا بوجھ اتنا کہ روز بستے بیٹھیں۔ ارے یہ ترپاٹھی کی بہو بڑا پیر دکھ دیا جاتی ہے۔ ایک دن تو چندی جمعرات کے روز لی تھی۔ اندر سے یکی فرقہ پرست لیڈر سب اے کی ہیں منافق، اندر سے کچھ اور باہر سے کچھ۔ ان کی رگ رگ میں منافقت ہے۔ ارے منظوروا تو بالتی۔ کھڑا کھڑا سر کھجائے جا رہا ہے۔“

”نہیں چچی، ترپاٹھی جی کی بی بی کو چھوڑ نہ کہنا۔ بڑی نیک ہیں۔ اور ترپاٹھی ماں صاحب نے ہمیں سال جاڑوں میں گرم چادر دینے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ کے گھر آتے ہی ڈالنے کا کہا ہے۔ سی گرم چادر نہ ملا چچی۔“

”ہاں، دونوں میاں بیوی ہیں تو نیک۔“ اور گرم کپڑے کی بات سن کر منظورو نے کہیں۔ ”ہم لوگ ان کے گھروں میں کھیل لگایا کرتے تھے۔“ پھر وہ سر کھجانے لگیں۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہندو نیک ہوتے ہیں یا بد۔ پھر انھوں نے فیصلہ کیا کہ زیادہ تر تو کچھ بدمعاش ہیں۔ مگر ترپاٹھی جی اور ان کی بیوی نیک ہیں۔ اور ایک وہ تھیں بیچاری دیوکی نندن کی مقتول اہلیہ۔

منظوروا کے دماغ میں کوئی مسلسل ڈنک مار رہا تھا۔ اس نے اس کی وجہ جاننی تو کئی سب سے پہلے دادی نے یہ بڑبڑایا اور جانے کیا کیا بڑبڑاتی رہیں۔ اس لیے بھیا آئے تو وہ ان سے سوال کرنے کے تجسس میں جٹ گیا۔

”بے، پیچھے کی پڑھیا تو سن، اچھا سن بابر 1526 میں ہندوستان آیا تھا۔“

منظوروا کی سمجھ میں 1526 قطعی نہیں آیا لیکن یہ آ گیا کہ بابر باہر سے آیا تھا۔ اسے ایک ہندو راجہ نے ہی اسے بلایا تھا اور ایک مسلمان راجہ کے خلاف لڑنے میں اس سے مدد چاہی تھی۔

"آزادی کے بعد تو مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کا تعصب بہت بڑھ آیا" منظورو نے ایجاد سا کیا۔

"تب سے مسلمانوں کی تاریخ میں نہ کوئی ہندو تھا۔ مسلمان صرف فرمانروا تھے اور بادشاہ اور جس کی لاٹھی تھی بھینس بھی اسی کی تھی۔ اتفاق سے لاٹھی ان کے ہاتھ میں آ گئی اور وہ بھینسوں کی طرح ان سے کام لے۔ بھینسیں بھی نہ ہندو ہوتی ہیں نہ مسلمان۔ وہ بس بھینسیں ہوتی ہیں۔ مگر وہ مندر اور نہیں توڑ رہے۔ یہ سمجھتے ہیں جو ایسا کہہ رہے ہیں۔ دراصل اب وہ لاٹھی مکمل طور پر ان کے ہاتھ میں..."

ترپاٹھی جی کی سہمی ہوئی سی تھیں۔ "منظورو بھیا کی بات کاٹ کر ٹوکا۔

"ثبوت۔ یہی نا ترپاٹھی جی کی عام قابل ہوا" بھیا نے زور سے میز پر مکہ مارا اور منظورو ڈر کے مارے اچھل پڑے۔ بہت تیزی بابر کی ... دار علیہ الرحمۃ۔

"ارے میاں، ان کے ساتھ دماغ کھپا رہے ہو اور یہاں؟" ابا پہلی مرتبہ دخل انداز ہوئے تھے۔

"دراصل ہم تو دیت جگانی ضروری ہے، ورنہ یہ حال ان لوگوں کے ساتھ ہو جائے گا اور مسلمانوں کے غرور کا لئے میں یہ دو مسجد ٹوٹ جائے گی۔"

"میاں، ابھی جو تم بول رہے تھے۔۔ وہی جس کی لاٹھی اس کی بھینس تو یہ معاملہ تو رونا ہی ہے۔ زمان ومکاں سے پرے والے کیوں بھول رہے ہو؟ مسجد تو میاں اللہ کی سمجھو۔ اور ذرا ای ٹھیک کر لو۔ لاٹھی یہ ہاتھ میں لینا نہیں چاہ رہے، وہ ان کے ہاتھ میں عرصہ ہوا کہ آ چکی ہے۔"

"ہماری مسجد کوئی کیوں توڑے گا؟" سیدھے سادے، کبھی ناراض نہ ہونے والے منظور کو سخت غصہ آیا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ غصہ اسے جب آیا جب اسے بابر کی ولدیت کہا گیا۔ بابر بادشاہ ہوں یا ولی علیہ الرحمۃ منظورو تو صاف اپنے باپ کی اولاد تھا۔

ترپاٹھی جی کے گاؤں سے ایک لمبا تڑنگا، کالا کلوٹا، مہیش آ کر ان کے گھر آتا رہتا تھا۔ رشتے میں ان کا بھائی لگتا تھا۔ ملازموں کی طرح منظورو کو تمیز بھی پیار کرتا تھا۔ لیکن اس بار جو آیا تو اس کی نظریں ذرا ٹیڑھی ٹیڑھی سی تھیں۔

وہ وہیں کی قدر کی آ رہی تھیں۔ یہ پہلا ہفتہ گزر رہا تھا۔ اس کی شادی ہوئے تھی۔ [illegible] ہوا
تھا۔

مجیش سمجھ رہا تھا۔ یہ رانی نے اپنے کارندوں کی مدد سے [illegible] تھیں اور وہ
[illegible] سے زمین کی طرف گامزن ہو چکے تھے۔

"جہاں تم کام کرتے ہو وہاں تو کافی کام پڑا ہوگا" مجیش نے منظورہ سے پوچھا۔

"کون کوئی نے گھر کا کام پڑے۔ کام پڑے پانچوں سے گھر [illegible] یہ صاحب کی ناک
سے چھ بجے تک آتے ہو؟ کیا یہ کام ہے تمہارا؟"

منظورہ چپ سی رہ گیا تھا۔ جہاں تک اس مجیش کا مطلب؟

"سب بڑی اور وہ چپ ایسا بڑھ بڑھ کے بولتی ہے"

"ہمارے وہ صاحب کا نام بینکن مستری تھا۔ خبردار جو کسی [illegible] بتایا۔"

منظورہ ناخوش محسوس کر رہا تھا۔ زندگی میں پہلی بار کسی نے اس طرح آنکھیں نکال کر بات
کی تھی۔ وہ تو بہت سیدھا سادہ، کم پسند انسان تھا۔ اکثر بیٹے تو ان کی جگہ سے بھی پیار سے بات کرتے
تھے۔

"بی بی جی [illegible] کیا کرے گا تو؟" مجیش کے لہجے میں تضحیک تھی۔

منظورہ دم بخود تھا۔ وہ کیا کرے گا؟ اس پر تو اس نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ نصیب کی بات تھی
بڑے مالک نے کہا جیسے تو آج بھی اس کی جیب کی ہی تھی۔ وہ تنخواہ، جیب خرچ [illegible] کے
لیے جوڑے جوتے کا کیا بنے گا؟ بے بسی کے شدید احساس کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنسو
آ گئے۔

"کریں گے کیا بھیا جی مگر یہ شرافت نہیں ہے۔"

"ہمیں شرافت کا سبق پڑھائے گا؟" یکایک وہ چٹان کی طرح [illegible] اور منظورہ سے
[illegible] گیا۔ بس پھر کر دو تھپڑ رسید کیے اسے۔

ثریا بھی بی بی جی ہمیں [illegible] کرتی دوڑیں۔ "کیا کرتے ہو چھوٹے [illegible]
آدمی۔" وہ ہاتھ پکڑ کر منظورہ کو الگ لے گئیں۔ "جا بیٹا آج گھر جا اور [illegible]"

مت آئیو۔" ان کے لہجے میں سرد کار تھا۔

منظور وا چھوٹن کیا پھر بھی نہیں آیا۔ ایک تنگ گلی میں اس کی گردن کٹی لاش پائی گئی۔ مرتے وقت بھی اس کے دماغ میں جالے لگے ہوئے تھے۔ اس کی سمجھ میں قطعی نہیں آیا تھا کہ بابر سے اس کا کیا رشتہ تھا اور کیوں تھا، اور اس کا باپ زمانہ قبل مسیح میں پیدا ہونے والا ٹھکن مستری تھا یا 1526 میں ہندوستان آنے والا ظہیرالدین محمد بابر۔ زماں و مکاں سے اوپر اٹھ چکا تھا گردن کٹا منظور وا۔

❀❀

ذکیہ مشہدی

محمود و ایاز

بی بی جی گاڑی کو ذرا آگے بڑھا کر سڑک کے سامنے کے اس پرانے جھاڑدار پیپل سے پیچھے لاتے وقت اکثر رکتا تھا جہاں سے مسجد کے صحن پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالی۔ یہ نظارہ کوئی نیا نہیں تھا۔ بچپن ہی سے وہ صاحب کو بڑی باقاعدگی سے مسجد جایا کرتا تھا۔ کوئی منظر نہیں، کوئی بات نظر نہیں، جس کو جہاں جگہ ملی وہ وہاں کھڑا ہو گیا۔ صفیں خود بخود آراستہ ہو گئیں۔ زیادہ تر لوگ سفید کرتے پاجامے میں ملبوس ہوتے۔ وہ ایک ساتھ جھکتے سجدہ ریز ہوتے، پھر اٹھ جاتے۔ گرمی بے حد تیز ہوتا۔ اکثر اتنی تیز ہو جاتی تھی کہ نمازی سڑک پر آ جاتے تھے۔ پرانے پیپل کے بے حد قریب جس کے نیچے ایک چبوترہ بنا کر سیندور لگی مورتیاں رکھی ہوئی تھیں اور جس سے ہوتے گزرتے گروہ ان نے اپنے خوابوں کی طویل عمر اور دولت کی خواہش کے لیے گہرے نارنجی رنگ کا موٹا سوت لپیٹ رکھا تھا۔ پیپل سے فوراً پہلے ایک خستہ حال مکان تھا — خستہ حال اور بہت ہی کم چوڑائی میں بنا ہوا۔ اس کم چوڑائی میں بھی دروازے سے لگا کر مالک مکان نے بشکل ایک دکان نکال دی تھی۔ نانبائی سو بھی ... لطیف ... بمشکل تمام اس میں آ پاتا تھا۔ جس میں اس نے ایک ... کی مشینیں اور ... رکھی تھی جو پنکچر بنانے میں کام آتا تھا۔ دکان کے باہر کچھ پرانے تار بکھرے رہتے تھے جنھیں رات کو گھر جانے سے پہلے لطیف اکٹھا کرتا، پھر کے اندر ڈال دیتا اور ایک زنگ آلود تالا لگا کر اس سے بھی زیادہ زنگ آلود کھڑکھڑاتی سائیکل پر گھر کی طرف روانہ ہو جاتا۔ مگر اس کا ... شناسا تھا، گرچہ دونوں کے تعلقات سلام کے محتاج ہونے والی اس مختصر سی ملاقات سے

زیادہ نہیں تھے۔ لطیف اکثر نماز میں پیچھے رہ جایا کرتا تھا۔

کر اکثر محسوس کرتا کہ وہ جھٹکے ان میں سے تو خوب دیتا۔

''کاش وہ آج پھر نہ چڑھتا۔'' ٹھنڈی ہوا میں وہ دل سے بولتے وال مرجھائی سی بیل وادی میں

پر اتر آتا۔

''نہیں یار ایم ایل اے صاحب کی گاڑی ہے۔ بیٹی کا جہیز جیتنا ہے۔ جلدی بنانے

دینی ہے۔ ان کا جہیز بڑی گاڑی آئے گا۔ جار بجے تک دے دو۔ یہ نا رہیں تیار جی

بنانے کو ہے۔''

''ٹھہرے اللہ میاں ناراض نہ ہوں۔'' پھر میاں جو جلو آئے ہاں'' اس کے لہجے میں

شرارت ہوتی۔

ارے تجھے کیا؟ اللہ میاں سے کیا تجھے کیا بات کان لگاتے ہو؟ اباں کی ہاں نہیں

جاتی۔'' اس نے بکھی ڈانٹ کے ساتھ اس میں ہاتھ ہلایا۔ پھر قدرے غصے سے بڑبڑایا۔ ''چھت

ٹپک رہی ہے۔ برسات آنے کو ہے۔ پورے سے بعد وضو تختہ بنایا ہے۔ رات مستری نے۔''

ادھر نماز سے بے توکلی تو لطیف کو نہ یادہ ہی شرمندگی ہوتی تھی۔ شرمندہ ہوتا تو جمعہ کو

مولوی صاحب تو تھے ہی ڈرانے اور گناہ کا احساس پیدا کرنے کے لیے۔ ایک مرتبہ خطبے میں بتا رہے

تھے کہ نماز قضا کرنا سب سے زیادہ بڑا کوئی گناہ تو ہے ہی نہیں۔ جہنم کے تندوں کی راکھ آگ میں جل

جل کر گناہ گاروں کی کھال جب جھڑنے لگے گی تو اللہ میاں نئی کھال بنائیں گے اور اسے پھر سے

آگ میں ڈالیں گے۔ یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ پھر کہیں جا کر کبھی روز قیامت جب اللہ کے رسول کی

شفاعت نصیب ہوگی تب نجات ملے گی۔

''قیامت کب ہوگی؟ عذاب کا یہ لامتناہی سلسلہ کے سو سالوں تک چلے گا؟ اللہ میاں کو دوسرا

کام نہیں ہے؟ دنیا کی حالت کیسی خراب ہو رہی ہے۔ بنا کے بھول گئے۔ ذرا اسے بھی دیکھیں'' وہ

جل کے بڑبڑایا تھا۔

لطیف کو معلوم تھا، ذرا سی کھال تھوڑی سی دیر کو بھی جل جائے تو کتنی تکلیف ہوتی ہے۔

وہ اکثر داتا پیر کی درگاہ پر حاضری دینے جایا کرتا تھا۔ عرس یا کسی تہوار کے موقعے پر وہاں

[illegible]

[illegible] کی خلش بے چین کرتی۔

[illegible]

"اب جا رہا ہوں [illegible] ابھی ذرا سا وقت ہے [illegible] آگئے تھے۔

[illegible] مخصوص شرارت بھرے لہجے میں کہا۔

[illegible]

صاف ستھرے [illegible] سید محمود علی ایڈووکیٹ، ایم اے ایل ایل بی [illegible]

Scanned with CamScanner

گاڑی کے تاروں میں ہو بھر رہا تھا۔ پھر جلدی جلدی چائے ختم کر کے اس نے اذان میں نام دل پہ رومال کو تہہ کیا اور تیزی سے گلے میں ڈالتا ہوا جھپٹ پڑا تھا مسجد کی طرف۔

جمعہ نماز ختم ہوتے ہی کود کے پھاندتے بھاگ پائیں گے۔ ذرا رکیے۔ ضروری بات بتانی ہے۔" چلتے چلتے اس نے کہا تھا۔ "ہوئی چھوڑنے کے بعد گئی تھی۔"

گردھر کو پتا تھا لطیف کی شادی کی بات چل رہی تھی۔ لگتا ہے طے ہو گئی۔ چائے کا گلاس ہاتھ میں پکڑے گردھر نے سر کھجایا۔ لوگ بہت یاد آ رہے تھے۔ لطیف بھی۔

یہ بات تو ہے لطیف کے دھرم میں کوئی چھوا چھوت نہیں۔ یہاں شہر میں تو نہیں پتا لیکن گاؤں کے مندر میں جب سب ایک دوسرے کو جانتے ہیں گردھر مندر کے اندر نہیں جا سکتا تھا باہر سے پرنام کر کے چلا جانا پڑتا تھا۔ یوں پرنام تو وہ مسجد کو بھی کر لیا کرتا تھا۔ اندر چھوٹو ن کا نام ہی تو لیا جاتا ہے اب نام لینے والے جیسے بھی ہوں۔ ویسے صاحب بہت اچھے ہیں اور چھوٹے تکلیں ... ذات پات کے اس کا تلفظ درست کر دیا تھا جہاں اس نے "جو..." ... بڑی بڑی آنکھیں نکالیں "پھر"" وہ تو سب سے اچھی ہیں۔ میٹھی مسکراہٹ، میٹھا چہرہ۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا زہرہ کیسی لگتی ہے۔ اسے دیکھ کر بہت سی چیزیں ذہن میں آتی تھیں کھیت میں لہلہاتے پکے گیہوں کی سنہری بالیاں، رہٹ سے گرتا شفاف ٹھنڈا پانی، یا پھر بور سے لدا خوشبو بکھیرتا آم کا درخت۔ اور سب سے عجب بات یہ کہ زہرا کو دیکھ کر کبھی کبھی گردھر کے ذہن میں اس کی دیہاتی ماں در آتی تھی جس کا رنگ کالا تھا اور چہرے میں ہوائیاں بھی ہوئی تھیں۔ زہرہ اور وہ واقعی مختلف تھیں جتنی ہمیں سوچنا چاہیے تھا۔ پھر وہ کیا بات تھی ... آنکھوں میں، کچھ چہرے پر، جو گرفت سے باہر ہی رہتی تھی۔ ویسے تھی تو ضرور۔ ورنہ ایسا کیسے ہوتا۔ گردھر سوچتا تو ذہن کے تار یوں الجھ جاتے جیسے ماں کا اون کا گولا حویلی کے بچے بچوں میں سے کسی نے الجھا دیا تھا کہ ماں روتے لگی تھی۔

زہرہ کا خیال آنے پر گردھر ہولے سے مسکرایا۔ اپنے ذہن کے سارے گنجلک تاروں کے باوجود وہ زہرا کا راز دار تھا۔

اس نے زہرا کو ایاز کے ساتھ دیکھ لیا تھا۔

یوں تو زہرہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ بی اے ... سے چھوڑنے گیا تھا۔ وہاں نہ ... گئے

لڑکے اِدھر اُدھر گھومتے دکھائی دیے تھے۔ زہرا کی بڑی بہن عائشہ کی شادی ہوئی تھی تو لڑکیوں کے ساتھ کئی لڑکے بھی آئے تھے۔ یہ سب ساتھ پڑھتے تھے۔ لیکن ایاز کے ساتھ دیکھ لیے جانے پر زہرا کی کیفیت کچھ ایسی ہی ہوئی تھی جیسے کسی چور کے سیندھ کاٹتے وقت دیکھ لیے جانے پر ہو جائے۔

''پاپا سے نہیں کہو گے نا؟'' اس نے صرف اتنا ہی کہا تھا اور اس کے ہونٹ لرزنے لگے تھے۔ مگر ایاز کے چہرے پر اعتماد تھا۔ وہ جلدی سے یوں زہرا کے سامنے آ گیا تھا جیسے اسے سب کی نظروں سے بچا لینا چاہتا ہو جیسے کہہ رہا ہو، ''اتنا مت ڈرو زہرا۔ میں ہوں نا۔''

''نہیں کہیں گے بٹیا!'' گردھر کے لہجے میں اس کا خلوص نیت تھا، وہ ساری گونگی عزت اور محبت تھی جو وہ زہرا کے لیے دل میں لیے گھومتا تھا، وہ نمک تھا جو کئی پشتوں سے گردھر کی رگوں میں خون بن کر دوڑتا چلا آیا تھا۔

کئی پشتیں

زہرا کی ننھیال سے گردھر کا رشتہ کئی پشتوں سے چلا آ رہا تھا۔ سنہ سینتالیس میں زہرا کی امی پیدا ہوئی تھیں۔ ان کی والدہ کا دودھ خشک ہو گیا تھا۔ قصبے میں زبردست کشیدگی تھی۔ جب فساد ہوا تھا۔ جب ہوا، گردھر کا باپ ہواری اس وقت کوئی سال بھر کا تھا۔ گردھر کے دادا پربھو نے کئی بکریاں پال رکھی تھیں۔ وہ زہرا کے ننھیال میں کھیت مزدور تھا اور دوسرے کام بھی نمٹا دیا کرتا تھا، جیسے گھر سے متصل باغ میں باغ کی دیکھ بھال اور رکھوالی سے درخت لگانا، پودوں کی نگرانی کرنا، موسمی پھول اگانا۔ وہ ذات کا مالی نہیں تھا لیکن پھلوں اور پھولوں کا زبردست شوق تھا۔ گھر میں جب بھی آتا، ہر طرف سے ''پربھو، پربھو!'' آوازیں لگتی رہتیں۔ پربھو نہ ہوتا تو پتا نہیں زہرا کی امی کا کیا ہوتا۔ ان دنوں اس نے دونوں وقت لٹیا میں بکری کا دودھ پہنچایا۔ کئی لوگوں نے سمجھایا۔ ''معلوم نہیں کہ کھاں میں ان مسلمانوں نے کیا آفت ڈھائی ہے؟ اسے ذات سے باہر پھینک دیا جائے گا۔ مسلمانوں کے محلے میں جاتا ہے۔ سانپ کو دودھ پلا رہا ہے۔ اس بار تو ہمیں ذات سے باہر پھینک دیں گے۔'' پربھو اس بات کی طرف پربھو پر اس آخری دھمکی کا بھی اثر نہیں ہوا۔ گلیوں گلیوں چھپتا چھپاتا پربھو کسی طرح پہنچ ہی جاتا۔ بچی کو گود میں لے کر دودھ پلاتا اور چپ چاپ بہت سے کام

Scanned with CamScanner

کی مدد کرتا، جس جوہو تا۔ رحمن کے حصے بچا کا خاندان چلا گیا۔ بچے چچیرے بچ گئے، دور کی حیثیت سے رشتے دار۔ پرمود نے ایک دن ہاتھ جوڑ کر کہا: "اب وقت ہی کچھ ایسا ہے میں نے دیا" رحمن اس وقت دو دن تھیں اور ننھے ننھے تین چار بچوں کی ماں۔ آنکھوں میں آنسو بھر کے بولیں "پرمود ہم اپنی زمین کیسے چھوڑ رہے۔ جانے والے تو جا رہے ہیں۔" اس کے بعد سے پرمود نے جیسی بنا دو بڑوں کے ساتھ پرجا اور بچوں کے لیے پرمود چاچا بن گیا تھا۔ مالکوں نے اس کے نام بیگھہ زمین کر دی۔ رحمن بی بی نے گردھر کو تعلیم کے لیے ماہانہ خرچ بھیجی لیکن تعلیم جیسی جان لیوا اور بیکار شغل اسے قطعی ناپسند ہوا اور رو دھو کے پانچ سات جماعتیں پڑھیں، پھر گھر سے بھاگ گیا۔ بڑی مشکل سے پکڑ دھکڑ کر لایا گیا تو رحمن بی بی نے اسے اپنے ساتھ ہی رکھ لیا۔ ذرا ہوش سنبھالا تو رحمن بی بی نے کہا، گردھر، اگر کہیں اور جانا چاہتے ہو تو چلے جاؤ ورنہ تمھیں یہاں رہنا چاہو تو رہو۔ گردھر کہاں جانے والا تھا۔ یہاں کھانا پینا، گھر سب مفت تھا۔ کبھی گاڑی نکلی تو چلا لی، ورنہ گھر کے سارے کام نمٹاتا رہتا تھا۔ جب وہ سو جاتے تھے تو پورے کے پورے دن جاتے تھے۔ تیس برس کا ہو چکا تھا اور گاؤں کے حساب سے ادھیڑ ہو چلا تھا۔ اس کی ماں جیسے بی بی کی طرح لڑکی ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ دستور کے مطابق لڑکی والوں نے، جنھیں اس کے گھر آنا تھا، آنا بند کر دیا تھا۔ گردھر کے جوڑ کی ساری لڑکیاں بیاہی جا چکی تھیں اور کئی کئی بچوں کی ماں تھیں۔ گردھر بڑی رعونت سے ہنس کر کہتا تھا: "ارے کسی بیٹی والے کی مت ماری گئی ہے جو ہم سے بیٹی بیاہے گا۔" لیکن جب سے ٹھیوا بی بی نسبت کی بات کرنے لگا تھا، گردھر کے دل میں بھی کچھ دو بھوٹنے لگے تھے، ورنہ آج اس نے رہبر کو یاور کے ساتھ دیکھ کر سر کھجا کر سوچا تھا کہ کیسے جچتے لگ رہے ہیں دونوں، جیسے رام سیتا کی جوڑی۔ مگر صاحب، صاحب اور مالکن ... رہبر بٹیا کی ... گردھر اس گھر کو یوں ہی تاکتا تھا جیسے چکور چاند کو تاکے

سید محمود علی اور سید مسعود علی نے اپنے والد سے یہ مکان ورثے میں پایا تھا۔ وسیع و عریض لیکن خاصی بری حالت میں تھا۔ زیادہ تر حصے میں کھپریل کی چھت، دیواریں بوسیدہ۔ دونوں کی شادیاں جن لڑکیوں سے ہوئیں، وہ حقیقی بہنیں تھیں۔ محمود علی اور مسعود علی کی والدہ سیدانی بی بی کہلاتی

تھیں۔ خاندان کی بزرگ خواتین نے انھیں مشورہ دیا کہ وہ ایک گھر کی دو بیٹیاں بہو بنائیں، مگر انھیں بہنیں
بنانے سے خوف آتا تھا۔ بہناپے میں حسب معاملہ ہونے والے جھگڑے اور دوستی ختم ہونے کا ڈر
ہے۔ لیکن سیدانی بی بی کی دلیل دوسری تھی۔ "ہمارے دونوں بیٹوں میں بڑی محبت ہے۔ ہم چاہتے ہیں
محبت برقرار رہے۔ دیکھا گیا ہے کہ شادی ہوئی نہیں کہ نگاہیں بدل لیں۔ وجہ بیویاں۔ ہم نے خود دیکھا
ہے۔ ہمارے ابا اور چچا جان جھگڑتے تھے، شادی ہوتے ہی نظریں پھیر لیں۔ ہم نے بہت چاہا تھا اپنی
بھتیجی بہو بنا لیں مگر خدا بخشے ہماری ساس نے ایک نہ چلنے دی۔ اب جو آئیں ان میں سمجھ داری ان کی
ساتھ اپنی بڑی بہن کی بیٹی سیدانی چلتی ہوئی آئیں۔ ہم تو اپنے بیٹوں کے لیے دو بہنیں ہی لائیں
گے۔ بیویوں میں پیار ہوگا تو بیٹے بھی پیار اور محبت سے دیوار کی طرح مضبوط بنے رہیں گے۔"

سیدانی بی بی کو دو ایسی بہنیں مل گئیں تو انھوں نے جھٹ اپنی بہو بنانے کی ٹھان لی۔ دونوں طرح سے
بیٹے کی گود دونوں مشترکہ خاندان میں پیدا ہو کر ساتھ ساتھ پلی بڑھی تھیں۔ مرتے دم تک سیدانی بی بی نے
اپنے فیصلے کی کامیابی پر خدا کی بیحد خوب شکر کی۔ گھر میں چولھا ایک رہتا۔ بچے ایسے کہ پتا نہ
چلتا کون کس کا ہے۔ ہر نماز میں وہ ایک فاضل سجدہ شکر کا ضرور ادا کرتیں۔ مگر

مگر ایسا ہوا کہ سید محمود علی رفتہ رفتہ پیسے والے ہوتے گئے۔ وہ محکمہ تعمیرات میں اوورسیر تھے۔ ترقی
پا کر اسسٹنٹ انجینئر ہو گئے۔ پچھواڑے کی آمدنی بھی آ رہی تھی۔ سب مرتبہ اور عہدہ آ گیا۔ پہلے تو
تک باپ دادا کی قدروں کو سنبھالے رکھا تھا لیکن اب وہ چھوڑنے لگے تھے۔ بیوی نے زیور بنوائے۔ بچوں کے
نام پرانے اسکولوں سے کٹوا کر شہر کے بہتر اداروں میں لکھوا دیے گئے۔ یہاں بھی جوڑ توڑ اور پیسوں کی
فراوانی نے اپنی افادیت منوالی۔ جن کمروں میں محمود علی اور ان کا کنبہ رہتا تھا ان میں تبدیلیاں
آنے لگیں۔ مسعود علی اپنے محکمے میں اسسٹنٹ تھے جہاں نہ مستقبل قریب میں کوئی ترقی
ہوتی تھی نہ ہی بالائی آمدنی کی گنجائش تھی، ورنہ ایمان ان کا بھی ایسا پختہ نہیں تھا۔ موقع ملتے پر تاک
قدم بڑھ گئیں۔ مرتبے میں فرق آیا تو حسد اور رقابت نے اپنے پر پھیلائے۔

پہلا اختلاف مکان کی مرمت اور رنگ و روغن کے سوال پر پیدا ہوا۔

"بھائی جان انجینئر ہیں، دوسرے پیسوں کی فراوانی ہے۔ وہ درست کرائیں مکان۔ ہمارا
ٹوٹا پھوٹا بھی ہماری اوقات کے عین مطابق رہے گا۔" مسعود علی کی بیوی نے نتیجہ نکالا تھا۔

Scanned with CamScanner

محمود علی کی بیگم نے جواب دیا۔ مکان پر حق دونوں کا برابر ہے۔ اس لیے پھر تم مسعود علی بھی نکالیں ورنہ وہ صرف اپنا حصہ درست کرائیں گی۔ (ان کا حصہ درست ہی نہیں ہو، چمک گئی گیا۔)
لیجیے صاحب، مکان میں میرا حصہ، تیرا حصہ شروع ہو گیا۔

مسعود علی اور ان کے اہل و عیال میں جو احساسِ کمتری پیدا ہوا اس نے طعن و تشنیع کی صورت اختیار کر لی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چولھا الگ ہو گیا اور کچھ عرصے بعد وہ حصے جو دلوں میں بنے تھے، زمین پر آ گئے۔ آنگن بیچ دیوار اٹھ گئی۔ سیدانی بی بی بہت رنجیدہ تھیں، لیکن عمر پوری ہو رہی تھی، رنجیدہ رہنے کو زیادہ دن نہیں رہیں۔ ان کے انتقال کے بعد تو کوئی احتساب ہی نہ رہا۔

مسعود علی کا اکلوتا بیٹا ترقی پسند تھا۔ آج کے دستور کے مطابق کمپیوٹر کی ڈگری حاصل کی اور منھ اٹھا کر بگٹٹ بھاگا بنگلور کی طرف، جو سارے کمپیوٹر والوں کا مکہ بنا ہوا ہے۔ دو لڑکیاں تھیں، ان کا بیاہ مسعود علی نے ذرا جلدی ہی کر دیا تھا۔ کہتے تھے قلیل آمدنی ہے اور دو دو بیٹیاں سر پر۔ اس لیے سوائے ہڈی بوٹی کے اور کچھ نہیں دیکھا۔ سادات کی ایک بستی سے دو نالائق لونڈوں کو پکڑ کر نکاح کر کے چھٹی پائی۔ بیٹیاں اپنے گھر کی ہو گئیں۔

مسعود علی پٹنے سے باہر کبھی نہیں نکلے تھے۔ بیٹے نے بنگلور بلایا تو بڑا شہر دیکھ کر آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہاں سے ہی دوست احباب کو فون کر کے بنگلور کے یوں گن گاتے جیسے سیدھے نیویارک پہنچ گئے ہوں۔ واپس لوٹے تو بات بات پہ "وہاں اس طرح ہوتا ہے" یا "وہاں تو ایسا ہے" لوگ سمجھ جاتے 'وہاں' سے ان کی مراد کیا ہے۔ پھر مسعود علی نے 'وہیں' جا کر بس جانے کا فیصلہ بھی کر ڈالا۔ یہاں ان کا روکنے والا کون تھا، اور پھر وہاں شداد کی جنت جو تھی۔

سید مسعود علی نے بڑے بھائی کو کانوں کان خبر کیے بغیر، کہ کہیں وہ رخنہ انداز نہ ہوں، اپنے حصے کا مکان بیچ ڈالا۔

"سنا ہے بھائی مسعود علی نے مکان بیچ دیا؟" ایک رشتے دار خاتون نے محمود علی کی اہلیہ سے کہا۔

"ہاں، دشمنوں کو بیچ گئے۔"

"اے ہے، دشمنوں کو!" انھوں نے ناک پر انگلی رکھ کر کہا۔

"ہمیں بتاتے تو ہم ہی خرید لیتے۔ باپ دادا کا مکان ہاتھ میں رہتا۔ یہ تو ہاتھ سے نکل کے رہ

Scanned with CamScanner

گئے۔ اور چچی بھی ڈیسک کو۔ اب رہو دھنوں جلاہوں کے ساتھ۔" وہ تیں بار پہلے مسعود علی نے دھنوں کو دھنکا تو زہرا سے نہ رہا گیا۔

"امی، دھنے کون ہوتے ہیں؟"

"ارے وہی جو روئی دھنتے ہیں۔"

جاڑوں کی آمد ہوتی تو گلی محلے میں جب تک وہ نمودار ہو جایا کرتے تھے۔ بیچارے، خستہ حال سے لوگ۔ اکثر تو ننگے پیر لنگی کرتے میں ملبوس، کاندھے پر دھنکی رکھے۔ کبھی بھی وہ دھنکی کے تار چھیڑتے تھے۔ یہ گویا ان کی موجودگی کا اعلان تھا۔ زہرا نے اکثر اس کی طرف بچپن سے ساتھ دیکھی تھی، لیکن اب ان کا آنا بہت کم ہو گیا تھا، اس لیے کہ زیادہ تر لوگ لحاف گدے بازار سے بنے بنائے لینے لگے تھے، مشینوں پر بھی کر بھروا لیتے۔ گھر پر روئی دھنوانے میں اب لوگوں کو قباحت محسوس ہونے لگی تھی۔ زہرا کو اس طرح کے سبھی لوگوں پر بڑا ترس آتا تھا۔ دوسروں کے یہاں جڑاول کا انتظام کرانے والے یہ مفلوک الحال لوگ اکثر شدید سردی میں بھی محض لنگی کرتے میں ملبوس نظر آتے۔ جاڑا زیادہ بڑھتا تو سر پر انگوچھا بھی لپیٹ لیتے۔ یہ محلے کا دورہ کرتے تو اکثر چھوٹے چھوٹے لڑکے ان کے پیچھے لگ لیتے اور ناک سے دھنکی کی آواز نکالتے۔

"امی، تو کیا اب ہر وقت ہمارے یہاں تن تن تانا کی آواز گونجتی رہے گی؟" دھنوں کی مفلوک الحالی سے زہرا کو جتنی بھی ہمدردی رہی ہو، وہ یہ نہ چاہتی تھی کہ گھر میں روئی دھنی جائے اور شور مچتا رہے۔ یہ ذرا کم ہی موقع تھا۔ پھر یہ کہ کسی غریب دھنئے نے بچا کھچا سامان خرید کیسے لیا؟ اتنے پیسے آئے کہاں سے ان کے پاس؟ یہ کون سی قسم کا دھندا ہے؟

"بیوقوف، ہر دھنا روئی تھوڑی دھنتا ہے۔"

"نہیں دھنتا تو پھر وہ دھنا نہیں رہ جاتا۔"

"بڑی کٹھ حجت لڑکی ہے۔" زہرا کی والدہ باورچی خانے کی طرف مڑ گئیں۔ آج مسعود علی صاحب نے مرغ دو پیازے کی فرمائش کی تھی۔

جاتے وقت چچی دل گیر ہو گئے۔ انھوں نے گلے شکوے بھلا دیے، بیٹے کو بہلا دیا، یہ خاص بات بھی دے دی۔

شعور ہو کر جہاں جا سکتا ہے، یہ نہ سوچا انھوں نے) اور ایک بار وہاں ضرور آنے کی درخواست کی تاکہ بھائی جان وہاں کے اہلِ وعیال کی آنکھیں کھل جائیں اور وہ بھی دیکھیں کہ اب ان کے کیا ٹھاٹ ہوں گے اور وہ کیسے شہر میں رہیں گے۔

دوسرے دن وہاں احمد حسین بی اے، ایل ایل بی کی تختی لگ گئی۔

سادہ آرائش میں ٹی وی، فریج، صوفہ سیٹ، ایک عام متوسط گھر کی سی چیزیں تھیں۔ اچھے صاف ستھرے ذوق کی غماز۔ قیمت کے اعتبار سے بھی کم و بیش ویسی ہی تھیں جیسی مسعود علی کے گھر میں۔ بس شجرہ مختلف تھا۔

ایک گمنام شجرہ

احمد حسین صاحب کے دادا (کہ تاریخ بس دادا تک ہی یاد تھی اور اس سے پہلے کی کوئی بنے قدر سے میں نہیں کوئی کرم خوردہ شجرہ بھی نہیں تھا، اس لیے کہ شجرے وہیں ہوتے ہیں جو اپنی عظمت ماضی میں ڈھونڈتے ہوں) کاندھے پر دھنکی لیے، گزرتے جاڑوں میں گلی گلی [illegible] دادا صاحب استطاعت لوگوں کے یہاں روئی دھن کر لحاف گدے بھرتے تھے۔ اگر وہ مقامی آدمی ہوتے تو شاید محلے کے کسی مدرسے چندے بٹورتے، [illegible] دیے جاتے تھے۔ ان کا اسم شریف محمد تھا جو بگڑ کر ممدو اور پھر کچھ ستم ظریفوں نے ملقب کر کے ممدو دھنیا کر دیا۔ وہ تازندگی اسی لقب سے جانے جاتے رہے۔ موصوف اس فن میں دھاگے ڈالتے تھے۔ جس گھر لڑکی کے جہیز کا لحاف ہوتا تو وہ اس میں اپنی ساری فنکاری صرف کر دیتے اور اجرت میں کمی کر دیتے کہ بیٹی کا بیاہ ہے۔ گدوں میں ایسا دھاگہ ڈالتے کہ روئی سالوں نہ کھسکتی۔ پاؤ ڈیڑھ پاؤ روئی دھن کر بادلوں کی طرح ہلکی کر دیتے اور بڑی سی رضائی میں یوں برابر کر کے پھیلاتے کہ معلوم ہوتا کہ بس ململ کی ایک تہہ ڈال دی گئی ہے۔ اس خوبصورت بادلوں جیسی ہلکی رضائیوں کو خواتین بغل میں دبا کر سمیٹ لیتی تھیں اور روئی ذرا نہ ٹوٹتی۔

دادا میاں کی ایک خاصیت یہ بھی تھی کہ اس کی دھنکی کے ساتھ ان کے کاندھے پر مستقل ایک تھیلا سا پڑا ہوتا تھا، جاڑا ہو یا گرمی وہ ان کے لباس کا حصہ تھا۔ سرما کا وقت ہوتا (جس کا اندازہ

وہ [illegible] سے سالوں سے نکالا کرتے تھے) تو وہ اس کثیف ٹکڑے کو تیار کرتے [illegible] سے صاف رہتا [illegible] ہو جاتے۔ [illegible] پڑھ [illegible] جو ھول کے ہوتے [illegible] ہوتی [illegible] کے کونے میں پتا چھپا [illegible] تھیں [illegible] سے پہلے [illegible] عام طور پر [illegible] کے گھر کام کر رہے ہوتے اس سے پانی [illegible] تھے۔ [illegible] کے سامنے [illegible] ہوتی تو کہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کے [illegible] سے کام چلا لیتے۔ [illegible] میں یہ بات آ [illegible] تھی [illegible] بیٹے اللہ رکھا عرف بچن [illegible] کاندھے پر رکھ کر گلی گلی [illegible] پڑے۔ ایک تو بڑی مشقت، اس پر سے لوگوں کا تحقیر بھرا برتاؤ۔ ستم بالائے ستم، محلے میں [illegible] جھولی امت پیچھے لگ جاتی۔ تنگ تنگ تاکیں [illegible] وہاں جائیں۔ [illegible] حرکات [illegible] ذرا [illegible] تھے [illegible] تھیں [illegible] پر [illegible] تی۔

[illegible] الٰہی نسان باپ [illegible] وقت سے [illegible] تو [illegible] نہیں [illegible] اس کی سوچ بھی اس سے آگے نہیں نکل سکی تھی۔ اللہ رکھا عرف [illegible] نے [illegible] ایک دکان مل جائے اور وہ وہاں بیٹھ کر روئی [illegible] کا کام کریں۔ [illegible] عورت ہو خود وہاں آ کر کام [illegible] اور لے جائے۔

[illegible] معصوم سجدے اللہ کے یہاں قبول ہوئے۔ انتھک محنت اور [illegible] کی وجہ سے انھوں نے [illegible] کہ عمر کے کچھ سال باقی رہتے انھوں نے ایک چھوٹی سی دکان کرائے پر لے لی۔

اللہ رکھا خلف [illegible] نکلے۔ ایسی ہی محنت کی جیسے [illegible] میاں کیا کرتے تھے۔ [illegible] بعد دکان انھوں نے خرید لی۔ ایک غریب رشتہ دار عورت کو دھاگے ڈالنے کے کام پر [illegible]۔ کاروبار مزید بڑھا کر دکان پر کپڑوں کے تھان اور روئی بھی رکھنے لگے۔ ہنر کی قدر دانی ہوئی۔ [illegible] سوچ نے بھی ترقی کی [illegible] میاں سے کئی قدم آگے نکل گئی۔ اپنے بیٹے کو انھوں نے پڑھنے [illegible] سکول بھیج دیا [illegible] پر [illegible] بھی رکھا۔ اللہ رکھا عرف بچن کو اپنا نام اور عرفیت دونوں [illegible] ناپسند تھے، اس لیے بیٹوں کے نام احمد حسین، رضوان حسین وغیرہ رکھے گئے۔ دکان قائم رہی لیکن جب [illegible]

رکھا۔ بڑے والد کی عمر کو پہنچے تو ان کی حیثیت بے واثری کی ہو گئی تھی، اس لیے کہ دکان اب کارندوں کے سپرد تھی۔ رضوان حسین پورا حساب کتاب رکھتے تھے اور شام کا خاص وقت دکان کو دیتے تھے جسے وہ 'فیکٹری' کہا کرتے تھے۔ احمد حسین نے گریجویشن کی اور اس کے بعد اپنے اساتذہ کے مشورے سے، جنھوں نے ان کے ذہن رسا کا اندازہ لگایا تھا، وکالت پڑھی۔ کنبہ بڑھا تو انھوں نے ایک مکان لینے کی بات کی۔ اس میں کنبے کی پوری رضامندی شامل تھی۔ سید صاحب مکان بیچ رہے ہیں، یہ یک دم ان کی معرفت معلوم ہوا، تو بڑے احترام و عقیدت کے ساتھ (اور اس امید کے ساتھ کہ کہ سید کا مکان ہے، ضرور اس میں برکت ہوگی) انھوں نے وہاں ہجرت کرنے والے سید مسعود علی کا مکان خرید لیا جو دراصل دو بھائیوں کے مشترکہ مکان کا نصف حصہ تھا۔ حسب توفیق انھوں نے اس کی مرمت کی، رنگ روغن کرا کے مزید کار آمد بنایا جس طرح وہ اپنی اولاد کو بنا رہے تھے۔

احمد حسین عرف احمد میاں نے بیٹے کا نام رکھا، اپنے والد اور دادی سے کہا احمد حسین صاحب کو وراثت میں پایا بے حد عقیدت تھی۔ دوسرے، دادی ایک مجسمہ نائل سے مسجد اور ہر طرح سے خوبصورت۔ وکالت پڑھنے کے بعد سے ذہن پر اور بھی جلا ہو گئی تھی۔ کہتے تھے، اب یہ لوگ جو صدیقی، فاروقی، علوی اور عثمانی وغیرہ لگاتے ہیں تو ہم تو کہتے ہیں، یہ سارا عقیدت کا کھیل ہے۔ میاں، ذرا پردہ اٹھ جائے تو کوئی دکھائے تو ہم جانیں۔ دادا کے باپ تک پہنچتے پہنچتے ہی یہ دعوے ہوا ہونے لگتے ہیں، اور کہیں ان کے بھی باپ کا پوچھ لیا تو بس گلی ہی پکڑی دھری رہ جاتی ہے۔ یہ یار لوگ ہیں کہ سارے کے سارے چودہ سو برس کی خبر دے رہے ہیں اور مانا یہ شجرہ موجود بھی ہے تو...“

تو سن لیجیے ڈپٹی صاحب کی کہانی

ڈپٹی سلیم احمد صدیقی نے (ڈپٹی جس کے نام کا جزو بن گیا تھا) اپنی بیٹی کی شادی شیوخ کی ایک اونچی شان کے فرزند ارجمند سے طے کر دی جو شیخ محمود لڈے کہلاتے تھے، اس لیے کہ کبھی اقتدار سے مجبور ہو کر چند پشت پہلے ان کے گھر کے کچھ افراد گھوڑوں پر سامان لے کر بیچتے تھے۔ اس طرح انھوں نے سوداگری شروع کی تھی۔ ڈپٹی سلیم احمد صدیقی کے خاندان کے زیادہ تر

جب یہ زمیندار تھے یا بڑے کاشتکار۔ نئی نسل کے چند افراد سرکاری نوکریوں میں بھی آ گئے تھے (جن کے رول ماڈل ڈپٹی نسیم احمد تھے) اور اگرچہ رسولِ خدا نے خود صرف تجارت ہی کی بلکہ تجارت کو ایک افضل پیشہ قرار دیا، بیچارے شیخ گھرانے اس تحقیر آمیز خطاب سے نوازے گئے۔ حالانکہ اب گھوڑوں پر سامان لاد کر ادھر ادھر لے جانے کی ضرورت نہیں رہی تھی اور جماعت مختلف دھندوں، بشمول تجارت، میں لگی ہوئی تھی لیکن یہ خطاب ان پر چپک گیا تھا۔ جو شیوخ خود کو برتر قرار دیتے تھے وہ ان کے یہاں شادی بیاہ سے اجتناب کرتے تھے اور اسی طرح کے رشتے کو جو ڈپٹی نسیم احمد نے طے کیا، باعثِ تذلیل گردانتے تھے۔

روایت سے بغاوت کرنے والے اگرچہ بہت کم ہوتے ہیں لیکن وہ ہوا کرتے ہیں۔ [illegible] والے صمد آپا ان کو پیچھے کے [illegible] لقب سے نوازنے کے باوجود [illegible] نے ان ہی گھرانوں میں سے ایک کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ ڈپٹی نسیم احمد بھی روایتوں کے باغی تھے۔ انھوں نے بھی ڈپٹی نظم سے گھرلدوں کے بیٹے [illegible] بیٹی دینے میں کوئی سبکی محسوس نہیں کی، رشتہ طے کر دی۔ ([illegible] کی اس [illegible] کی جرأت تو انھوں نے کی نہیں تھی۔) خیر جب [illegible] ہوئے ڈپٹی صاحب کے دیوان میں گھس آئے۔ (حالانکہ عمر دراز تھے [illegible] داڑھی والے اور بارعب۔ [illegible] سے ڈپٹ کر بولے، تم ڈپٹی صاحب سے [illegible] وہ انھیں روک نہ سکا۔)

"کیا میاں یہ کیا کر رہے ہیں؟ خاندان میں لڑکوں کا کال تھا؟"

"نہیں، بالکل نہیں تھا۔ ایک سے ایک نالائق موجود ہیں،" جواب ملا۔

"تمھارے اندر سرکاری نوکری کا تکبر آ گیا ہے۔ اللہ سے توبہ کرو۔ سب کو نالائق قرار دے رہے ہو!"

"اور آپ شیوخ کی ایک بڑی جماعت کو نالائق قرار دے رہے ہیں۔"

"بالکل نہیں، ہوں گے وہ اچھے، لیکن بیٹی تو کنوئیں میں ہی دی جاتی ہے۔"

"جیسے [illegible] میں نے کھونے تین معیار مقرر کیے ہیں: شرافت، تعلیم اور [illegible]

نکال پر یوں گزرتا ہے تو میں یہ تکلف بھی نباہوں گا۔ پھر، وہ شیخ محمد داود [illegible] آپ تشریف لے جائیں، میں مصروف ہوں۔ مگر ہاں، ذرا ٹھہریے۔" انھوں نے منشی جی [illegible] مخاطب کیا، "ایک صاحب بیٹھے ہوں گے، جب علی جبل انھیں اندر بھیج دیجیے۔ اور ہاں، چائے بھی منگوا لیجیے۔"
[illegible] میں ایک بزرگ صورت مسلوک الحال مقامی ہستی تھے۔ شعر و شاعری میں شد بد رکھتے اور شبلی تخلص فرماتے تھے۔ [illegible] ڈپٹی کے توسط سے [illegible] کئی مرتبہ [illegible] لوٹ چکے تھے۔ [illegible] کی [illegible] سے بھرے جھک مارتے تھے۔ [illegible]

"شبلی صاحب!" ڈپٹی صاحب نے مخاطب کیا۔

"جناب والا!" وہ گھٹنوں تک جھک گئے۔

[illegible] شیخ جاوید حسن [illegible] (ہم [illegible] انھوں نے قدرے تبسم [illegible]) ایک شجرہ تیار کیجیے تو والد کا نام شیخ [illegible] حسن [illegible] آپ جانتے ہیں۔" ڈپٹی صاحب نے بے نیازی سے [illegible] مگلے ان کی [illegible] پیش ہونے والے تھے۔

شبلی صاحب شجرہ لے آئے۔ شیخ جاوید حسن صدیقی کا سلسلہ نسب سیدھا حضرت ابوبکر صدیق سے ملتا [illegible] اونٹوں پر سامان لاد کر تجارت کرنے والے حضرت کے اسلاف ہندوستان آ کر گھوڑوں پر تجارت کریں (کہ یہاں اونٹ [illegible] ریگستانی علاقوں کو چھوڑ کر باقی علاقوں کے لیے [illegible] دستیاب) تو یہ تو عزت افزائی ہے۔ کمتر ٹھہرانے کا جواز کہاں نکلتا ہے! تو ٹھہرا ہی وہ گردن زدنی۔

ڈپٹی صاحب نے ہنس کر پوچھا، "شبلی میاں، آپ کو [illegible] کے اسلاف کے سارے نام کہاں سے مل گئے؟"

"[illegible] حسن صاحب کے دو پردادا کے نام تو تحقیق مل گئے تھے۔ کچھ بزرگ رشتے داروں سے تحقیق کر لی تھی۔ [illegible] حضور، آپ کا حکم تھا، اس لیے باقی شاعری ہے۔"

[illegible] ڈپٹی سلیم احمد صدیقی نے قہقہہ لگایا، گھنٹی بجا کر چپراسی کو طلب کیا اور چائے کے ساتھ سموسے بھی منگوائے۔

[illegible] حکیم شفیق احمد صدیقی تا [illegible] بقید حیات [illegible] حکیم صاحب موصوف کی ذاتی واقفیت بھی تھی۔)

[illegible] قبضے میں چلے [illegible] قیمت [illegible] کی صورت ہو جاتا۔ [illegible] شادیاں [illegible] تعمیر مکمل ہو رہی تھی [illegible] فلیٹ [illegible] رہا تھا [illegible] تھے [illegible] اور چند [illegible] پڑتے۔ محمود علی [illegible] محمود علی کی [illegible] بی اے [illegible] کی تختی پر نظر [illegible] لیکن [illegible] نہایت خوش شکل اور [illegible] نوجوان [illegible] کی کال بیل پر انگلی رکھ کر کھڑا ہو گیا۔ اندر سے جواب ملنے میں [illegible] دیر لگی۔ [illegible] اس کا چہرہ [illegible] ہو رہا تھا ''شاید کوئی ملنے والا ہوگا۔ لڑکوں کا سا [illegible]۔ اللہ کی شان [illegible] لڑکے بھی [illegible] خوب پڑھ رہے ہیں۔'' بیگم محمود نے سوچا۔ [illegible] کی نظر [illegible] پڑیں۔ اس نے نہایت شائستگی سے سلام کیا۔ قدرے [illegible] آگے بڑھ گئیں۔

تیسرے چوتھے دن [illegible] لڑکے نے محمود علی صاحب کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ [illegible] سے بیگم محمود علی ہی سامنے آگئیں۔ ''کیا ہے میاں؟ [illegible] پھر تمھیں جواب نہیں مل رہا ہے؟''

لڑکے کی سمجھ میں بات [illegible] نہیں۔ [illegible]

سلام کہا ہے اور کہا ہے کہ آج ذاتی مکان میں منتقل ہونے کے سبب مغرب بعد شکرانے کا میلاد کرا رہی ہیں۔ آپ ضرور آئیں۔ آپ ہمارے پڑوسی ہیں اور جناب مسعود صاحب کے سگے رشتے دار بھی۔ ہم خود حاضر ہوتے لیکن گھر میں ساز و سامان منتقل کرنے میں اتنے مصروف رہے۔ امی نے یہ بھی کہا ہے کہ آپ کچھ خیال نہ کریں، بعد میں وہ ضرور آئیں گی۔"

"تم کون ہو میاں؟"

"جی، ہمارا نام ایاز احمد وارثی ہے۔ ہمارے والد نے آپ کے عالی صاحب سے یہ مکان خریدا ہے۔ محلے کی مسجد میں میری اور والد صاحب کی جناب محمود صاحب سے ملاقات ہو چکی ہے۔ ہم ان ہی کی صف میں تھے۔" وہ مسکرایا۔ اس کے ایک گال میں گڑھا پڑا جس سے اس کی وجاہت میں اضافہ ہو گیا۔

محمود صاحب کی بیوی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ اللہ کی شان ایسا ان لوگوں کا بیٹا ہے۔ ویسا ستھرا اجلا نقش، صاف رنگ، بال، اور بولی چالی تو دیکھو۔ خوب پڑھا رہے ہیں لوگ۔ ان ہی کو عروج ہے آج کل۔ یہاں ہم بیٹی کا رشتہ تلاش کر رہے ہیں تو ایک ڈھنگ کا لڑکا نہیں دکھائی دے رہا برادری میں۔

"اچھا بیٹا امی سے، ہم آئیں گے،" وہ قدرے رکھائی سے بولیں۔

پھر چونک کر پلٹیں۔ "کیا نام بتایا تھا؟"

"جی، ایاز احمد وارثی۔"

دیر تک مسکرائیں۔ انھیں معاً شیخ چراغ علی قادری یاد آ گئے۔

قدرِ مشترک درمیانِ ایاز احمد وارثی و شیخ چراغ علی قادری

بیگم محمود کے یہاں قصبے میں ایک دور دراز کے نانہالی رشتے دار شیخ صاحب کے نام سے مشہور تھے۔ حافظِ قرآن تھے اور نیکوکاروں میں شمار۔ محلے میں صرف ان کا مکان پختہ اور دو منزلہ تھا، باقی سب مکان کچے اور یک منزلہ تھے۔ تمام موقعات کی اس متعدداری میں نخرے اور جھگڑے ہوتے تھے۔ شیخ صاحب عموماً دالان میں پلنگ پر بیٹھے حقہ گڑگڑاتے رہتے تھے۔ اکثر دو چار حواری موالی بھی موجود بیٹھے دکھائی پڑ جاتے۔ ان کی رعیت میں سے جو بھی چھوٹا بڑا گزرتا، 'سلام علیکم جی شیخ جی' کہتا ہوا گزر

جاتا۔ شیخ صاحب نابینا تھے لیکن تمام نابینا افراد کی طرح ان کی باقی حسیں نہایت تیز تھیں۔ آواز تو سب کی جانتے ہی تھے، بھی تو قدموں کی چاپ سے پہچان لیتے کہ برابر سے کون گزرا ہے۔ اس دن بھی دور سے نئی جوتے پہنے ہوئے پیروں کی چاپ سے وہ سمجھ گئے کہ ظل نصری کا چھٹیوں میں گھر آیا جوان بیٹا چلا آرہا ہے۔

"السلام علیکم" لونڈے نے بڑی دور سے سلام دعا کی لیکن اس کے قدم ہلکے نہیں پڑے۔ طرہ یہ کہ السلام علیکم کے فوراً بعد اس نے ہلکے سروں میں سیٹی بھی شروع کر دی تھی۔ وہ چند قدم بھی نہ بڑھ پایا تھا کہ شیخ شجاعت حسین کا بھاری بھرکم بارعب جسم اس پر آن پڑا، اور قبل اس کے کہ وہ اس آفت ناگہانی کی نوعیت کو سمجھ سکے، اسے دھول دھپا ہو چکا تھا، چیست کی طرح اسے لوٹ کر رکھا تھا۔

"حرامزادہ، نامعقول کی بدذات اور واہیات، داخل ہوتے پڑھتے گیا ہے تو تمیز سیکھ کر آتا۔ نابینا اوقات ہے تیری۔" کہہ کر شیخ شجاعت حسین پھر چوپٹ پر جا بیٹھے۔

شام کو ظل نصری کا بیٹا گروہ شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا لونڈے کی کم عقلی اور بدتمیزی کے لیے جتنی معافی مانگی۔ چار برس سے علی گڑھ میں پڑھ رہا تھا، ماحول بھی وہاں دوسرا ہے۔ چونکہ گمراہ تھا اس لیے قدم بوسی کے بعد ہی آگے بڑھتا ہے۔ مذاق اس کا تھا نہیں۔ ... کی اتنی شامت ... کہ بدن میں درد سے ... پیٹھ پر وہ ... ہلدی چونے کا لیپ لگا رہی تھیں۔ دراصل وجہ یہ تھی کہ اس نے سنت سے منہ نکالا۔ بیاہ تو وراثتے ہی دن علی گڑھ واپس لوٹ گیا تھا۔ شیخ صاحب بہت دن سے اس کنبے سے خفا ہو رہے تھے جس نے لڑکے کو پڑھنے علی گڑھ بھیجا تھا۔ یہ تاریخی واقعہ حیرت بھی تھا اور باعث عبرت بھی۔ غیروں کو تو پختہ مکان بنانے کی بھی جرأت نہیں تھی، نہ اپنا مکان شیوخ کے مکانوں سے اونچا کرنے کی۔ نکروں کی آبادی کے مالی حالات کچھ بہتر تھے لیکن جب بھی ان کے یہاں بچہ پیدا ہوتا تو وہ محلے کے سربرآوردہ بزرگ کے پاس جا کر نام تجویز کراتے۔ وہ محلے والوں کے حساب سے بدھو، جمعراتی، جمن میاں، ممدو، مدو، گھسیٹا، اللہ رکھا قسم کے نام رکھ دیتے۔

اللہ رکھا کے یہاں بیٹا ہوا تو وہ نام رکھوانے نہیں آیا۔ دراصل ٹھیک اس کی ولادت کے وقت اس کی دادی نے چہ میگوئیوں میں تکمیل ... کر لی تھی۔ دوسریوں نے گھسیٹا ... کے نام سے

جانے جاتے تھے۔ بچے کا نام چراغ علی تجویز کر دیا۔

چراغ علی دو ماہ کے ہوئے تو، بقول ان کی والدہ ان پر کسی موت آسیب کا سایہ ہو گیا اس لیے کہ وہ بہت خوبصورت تھے۔ کاجل کے ٹیکے وغیرہ کی آسکتی نے چنداں ... اس لیے پھونکوانے کے لیے چراغ علی کے والد میاں اللہ رکھا انھیں لپیٹ لپاٹ کر میاں دادا شیخ شجاعت علی کے پاس لائے۔

"بچے کا نام ابھی تک نہیں رکھا گیا ہے؟" شیخ صاحب نے فرمایا۔

میاں اللہ رکھا نہایت شرمندہ ہوئے۔ بولے: "سید صاحب نے چراغ علی تجویز کیا ہے۔"

شیخ صاحب پر ذرا سا سناٹا چھا گیا۔ بغاوتوں کے چڑیا کے پر جیسے ہلکے پھلکے ہونے کے دور پر اڑنے لگے تھے۔

"ہم اسے چراغ نہیں کہیں گے۔" قدرے توقف کے بعد انھوں نے فرمایا۔ "ورنہ ہم سب ہی چراغ ... نام سے بچے کی صحت کے لیے دعا کر رہے ہیں۔" ہاتھوں سے پھونک ماری۔ ... انھوں نے ... سونف ادا کر دی۔ "یہ سونف پانی کر اس کا پانی دن میں دو بار چٹا دیا کرنا۔" بچہ پیٹ کے اپھارے کی وجہ سے رویا کرتا تھا۔ سونف کا پانی پی کر دو چار روز میں چنگا ہو گیا۔

میاں چراغ بڑے ہوئے تو محلے میں لونڈوں سے دھول دھپا، سید صاحب کے باغ سے آم امرود چرانا اور آوارہ گردی کرنا ان کا معمول بن گیا۔ باپ دادا اور میاں ... انھیں جانتے تھے ... انھیں ہرگز راس نہ آیا۔ تنگ آ کر والدین نے انھیں بہار میں رہنے والے رشتے داروں کے ایک کنبے کے پاس بھیج دیا۔ وہ وہاں پڑھتے رہے۔ یہ کنبہ سن سینتالیس میں ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلا گیا اور چراغ کو ان کے والدین کی اجازت سے ساتھ لیتا گیا۔ کسی طرح یہ حضرات سنہ اکہتر کی خوں ریزی سے بچ گئے۔ چراغ علی پر بچپن میں جو موت آسیب عاشق ہوئی تھی، شاید اس نے انھیں یہاں بھی ڈھونڈ نکالا ورنہ ... کی پرورش کر دی۔ دراصل چراغ علی نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ناسازگار حالات میں محنت اور دیانت ہی ایک شخص کے سب سے اچھے دوست ہو سکتے ہیں۔ اس سے وہ کامیاب رہے۔ صاف رنگ، مضبوط قد کاٹھی اور معقول ذریعۂ معاش کی وجہ سے ان کی شادی ایک اچھے خاندان میں ہوئی۔ سنہ ... میں شیخ چراغ علی بزنس کا ایک چلتا پھرتا نام، وہ ترقی اور ایڈمر

Scanned with CamScanner

جتنے سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ایک بھی شریف حیثیت سے گھر سنبھال رکھا تھا۔ ایسے میں یہ شاخ علی وطن عزیز کی یاد آئی۔ لوٹے تو سوٹ بوٹ میں ملبوس تھے، کلائی میں بیش قیمت گھڑی تھی اور بٹوا نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔

پرانے شناساؤں میں شیخ شجاعت علی کے یہاں بھی پہنچے۔ محلے کا واحد پختہ مکان کھنڈر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ جس جگہ میں باغ تھا وہاں چراغ علی کے ہی پاس دور کے رشتے داروں نے قبضہ کر کے رہائش کا ٹھکانا بنا لیا تھا۔ بڑے لڑکے مرغیاں پال لیے تھے، جوان روزی روٹی کی تلاش میں باہر تھے۔ صرف ایک بڑی خاتون، جو چراغ علی کے بچپن میں نوجوان لڑکی تھیں، باقی رہ گئی تھیں۔ بیوہ ہونے کے بعد وہ اپنے نالائق لڑکے، اس کی پانچ بچوں اور بہو کے ساتھ کھنڈر پر دعویٰ ٹھوک کر رہ رہی تھیں۔ حال چال دریافت کرنے کے بعد چراغ علی نے ایک بچے سے کہا:

"میاں جاؤ، اندر کہہ دو کہ شیخ چراغ علی آئے ہیں۔"

لڑکے نے جا کر جواب دیا، "دادی کہہ رہی ہیں، ابا نہیں ہیں، پھر آئیو۔"

انھوں نے فرمایا، "کہہ دو، آپ کی بھی قدم بوسی چاہتے ہیں۔"

دادی تعجب سے کچھ بوسیدہ ٹاٹ کے پردے کے پیچھے آن کھڑی ہوئیں۔ "کون ہے؟ ہم سے ملنے کون آیا؟"

"خالہ، ہم ہیں چراغ علی۔"

"کون چراغ علی؟"

"زمانہ پہلے ہمارے ابا کوئی آٹھ سات گھر چھوڑ کر رہا کرتے تھے۔ اللہ رکھی صاحب۔ ہم ان کے بیٹے ہیں۔ آپ اکثر ہم سے دوپٹے رنگنے کو رنگ منگوایا کرتی تھیں زرا برق۔"

انھوں نے آنکھوں پر ہاتھ سے چھجا بنایا۔ ذرا سا پردہ ہٹا کر اس کی درز سے باہر جھانکا تو ذہن میں کھد بد کھد بد کچھ پکا۔

"ارے کم بخت، یوں کیوں نہیں کہتا، چراغا ہے!" وہ پردہ ہٹا کر یوں باہر نکل آئیں کہ ایک قدیم عادت کے تحت پیٹھ پر دھول جمانے کو ہاتھ اٹھا ہوا تھا لیکن ایک دراز قد، مضبوط، ادھیڑ عمر، خوش لباس شخص کو دیکھ کر ٹھٹک کر رہ گئیں۔

اس کے چہرے پر چراغ روشن تھے اور پل کے نیچے سے بہت سا پانی بہہ چکا تھا۔

"آجاؤ، آجاؤ اندر آجاؤ، چل بیٹھو۔" انھوں نے پچکھچر سا مونڈھا سرکایا۔ کچھ دیر بعد دراری کی پیالی میں اوٹی ہوئی چائے دو کھڑ کھڑے بسکٹوں کے ساتھ پدائی، نام بنام سب کی خیریت پوچھی۔ چلتے وقت پانچ روپے کا مڑا تڑا نوٹ نکال کے دیے۔ "بچوں کے لیے کچھ لیتے جائیو۔" شیخ چراغ علی نے وہ مڑا تڑا کثیف نوٹ اپنے چمڑے کے بیش قیمت بٹوے میں سو سو کے نوٹوں کے درمیان رکھا اور سلام کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ دل میں کہیں ایک ٹیس سی اٹھی۔ جب بھی ان کی والدہ اس ڈیوڑھی پر سلام کرنے کو حاضر ہوتیں، بچوں کے ہاتھ میں ایک آدھ مٹھائی کا ٹکڑا دیا جاتا یا بسکٹ۔ چلتے وقت دوانی چونی جیسی رقم ضرور عطا کی جاتی۔ روایت برقرار تھی۔

(کہانی کے پہلے نصف حصے کے راوی احمد صدیق پروفیسر شعبہ قانون، دہلی یونیورسٹی کا انتقال ہو چکا ہے، دوسرے حصے یعنی چراغ علی کے شناسا سید شفیع الزماں کا سایہ ان کے اہل وعیال پر قائم ہے۔)

تو چونکہ بہت سی روایتوں کے برقرار رہنے کے باوجود پل کے نیچے بہت سا پانی بھی بہہ چکا تھا اس لیے محمود علی صاحب کی اہلیہ احمد حسین وارثی مرحوم کی اہلیہ کے ہاں میلاد میں تشریف لے گئیں۔

ربیع الاول کے مہینے میں میلاد محمود صاحب کے یہاں بھی ہوتا تھا۔ رشتے داریں، تعلقات، سب طرف کی عورتیں جمع ہوتیں۔ سال بھر سے بند کر رکھے مولود سعیدی یا میلاد اکبر کو جھاڑ پونچھ کر نکالا جاتا۔ ثناء اللہ کی اہلیہ کو (جو عرف عام میں 'دروغائن' کہلاتی تھیں) جھوم جھوم کر بلند آواز میں میلاد و سلام پڑھنے اور میاں کی رشوت کی کمائی میں سے نوٹوں کی گڈیاں جھاڑ جھاڑ کر گدوں کے اندر چھپا کر رکھنے میں بڑی مہارت حاصل تھی۔

ثناء اللہ عثمانی ڈی ایس پی کے عہدے تک پہنچ کر حال میں ریٹائر بھی ہو چکے تھے لیکن بیوی کے ساتھ لفظ 'دروغائن' چپک کر رہ گیا تھا۔ وہ کچھ ایسا برا بھی نہ مانتیں۔ عزیزوں، رشتے داروں اور دوست احباب، کسی کے گھر زنانہ میلاد ہوا تو میلاد خوانی کے لیے انھیں ہی مدعو کیا جاتا۔ لیکن ادھر میلاد پڑھا، ادھر اپنا حصہ سنبھال، وہ موٹر میں چڑھتیں، اور ادھر گھر والے و بقیہ حاضرین ان کی بخیہ ادھیڑنے

شروع کرتے۔

"سنا ہے ایک فلیٹ گلستان میں بھی بک کیا ہے۔"

"بڑی مہنگی عمارت ہے۔ وہاں تو علاقے کے دام ہیں" آواز میں رشک نمایاں تھا۔

"ریٹائر ہوتے ہوتے اتنا مال بنا لیا کہ اگلی دو تین پشتیں آرام سے کھا سکیں۔ مکان دیکھا ہے علی نگر والا؟"

"یہ تو جب داروغہ تھے تب ہی چھوٹ کر کما رہے تھے۔ ڈی ایس پی ہوگئے وہ بھی ٹریفک میں! اس کے بعد سے تو وارے نیارے۔"

"سب دیکھو، یہ تینوں بھائی لڑکوں کو ڈونیشن والے کالجوں میں پڑھا رہے تھے۔ ایک ڈاکٹر، باقی دو انجینئر۔ ہمارے لڑکے بچارے پڑھ پڑھ کر مر گئے لیکن مقابلے کا امتحان کلیئر نہیں کر سکے۔"

"اجی، ڈونیشن کی بات چھوڑیے، وہاں تک تو جائز ہے۔ انھوں نے اور لوگوں نے تو مقابلے کے امتحانوں کو دولت کے بل بوتے پر پھوڑ لیا۔ وہ کیٹ (CAT) والا ہنگامہ نہیں یاد؟ بس دو تین سال ہی تو ہوئے۔"

"رنجیت ڈان والا؟"

"ہاں صاحب، سی پی ایس ای اور کیٹ کو ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔ اب لوگ لاکھوں دے کر کسی ذہین امیدوار کو دھکا دے کر اپنے بچوں کو اس کی سیٹ پر لے آتے ہیں۔"

"بیٹی کی شادی فائیو اسٹار ہوٹل سے کی۔"

"لوگ اللہ سے ڈریں نہ عاقبت سے۔"

"ارے، آخرت سے کیا ڈرنا۔ اب ڈی ایس پی صاحب مع داروغائن حج کرنے جا رہے ہیں۔ داڑھی بھی چھوڑ چکے ہیں۔ گناہ ثواب کا پلہ برابر ہو جائے گا، جنت کے دروازے کھل جائیں گے۔"

"نہ کھلے تو وہاں بھی رشوت دے دیں گے۔ یہاں لیتے آئے تھے، وہاں دے کے چھوٹ جائیں گے۔"

(یہ کمنٹ زہرا کا تھا۔)

"اجی تم کون سی اللہ رسول سے ڈرو ہو! یہ نئی نسل دیدے کی صاف، زبان کی تیز۔ وہ داروغہ

جنت کو رشوت خور ٹھہرا دیا!"

گفتگو کا رخ نئی نسل کی طرف پھر گیا۔ رہبر اداس سے سنتی رہی۔ جیسے یہ کوئی سرگزشت تھی۔

درود عالی کو فخر تو تینوں بیٹوں پر تھا لیکن ڈاکٹر بیٹے پر انھیں خصوصی گمان تھا۔ زیادہ تر اچھے گھروں کے لونڈے آوارہ یا تباہی ڈھونڈتے ہی پھرتے گھوم رہے تھے ورنہ چھ داتوں کو عروج حاصل تھا۔ ان کا کنبہ ان چند کنبوں میں تھا جہاں بیٹی تک نے اعلیٰ تعلیم حاصل کی تھی۔ پونا کی ایک درسگاہ میں بھاری عطیہ دے کر اسے ایم بی اے کرا دیا گیا تھا۔ تعلیم کے دوران ہی رشتہ پکا ہو گیا تھا اور ریٹائر ہونے سے چند ماہ قبل درود عالی کے ڈی ایس پی شوہر نے اس کی شادی کر دی تھی، جس کا خاصا چرچا رہا تھا۔ اب بڑے بیٹے کی باری تھی۔ رشتے تو بہت آ رہے تھے لیکن درود عالی کو ڈاکٹر بیٹے کے لیے رفعت بہت پسند تھی اور اس کا عندیہ وہ ظاہر کر چکی تھیں، جس پر محمود علی ٹیلی کمیونیکیشن انجینئر کی بیوی دبی دبی خوشی کا اظہار کر چکی تھیں۔ شادی کے بارے میں ڈاکٹر کا بھاؤ بہت تیز تھا۔ اگر ڈاکٹر کی ماں از خود لڑکی پسند کرے تو سودا مہنگا نہیں رہے گا۔ ابھی لمبی ڈاڑھی والے متین خاں نے بیٹے کی شادی میں ایک فلیٹ اور گاڑی کا مطالبہ کیا تھا۔

لمبی ڈاڑھی و لمبی گاڑی

متین خاں محکمہ نہر میں اوورسیر تھے۔ (اوورسیر حضرات آج کل 'جونیئر انجینئر' کہلاتے ہیں۔) کمانے کی گنجائش تھی، خوب کمایا بھی۔ ریٹائر ہونے کے بعد خدا یاد آیا، اس لیے کہ خدا سے ملاقات ہونے کا وقت قریب آتا محسوس ہو رہا تھا۔ ان کی ڈاڑھی پہلے سے تھی، اسے انھوں نے بڑھا لیا۔ اب ٹھڈی نیچے کرتے تو ڈاڑھی سینہ چھوتی۔ مسجد میں درسِ قرآن شروع کرایا اور مرمت کے لیے بھاری عطیہ بھی دیا۔ مزید ترقی ہوئی، تبلیغی جماعت کے رکن بن گئے۔ بیٹا ایک ہی تھا، ہونہار۔ مقابلے کے امتحان میں بیٹھا۔ کلاس ٹو گورنمنٹ پوسٹ مل گئی، جو آگے چل کر یقینی طور پر کلاس ون میں تبدیل ہونے والی تھی۔ لڑکی والے فیصلہ کن بات چیت کے لیے آئے تو عام سا سوال پوچھا، "ابھی کوئی مطالبہ ہو تو پہلے بتا دیں۔" والد کہنے لگے، "فی الحال تو مغرب کے لیے مسجد جا رہا ہوں۔ پھر گشت میں نکل جاؤں گا۔ میرا کیا مطالبہ ہو سکتا ہے، جو ہے وہ بیٹے کا ہے۔" انھوں نے آسمان کی

مرتب ہو چکا تھا۔" ہاں! ان اور ادھر سے پوچھئے! غرض میں یہ تو صاحب محو تھے
... بڑے سے گھرانے تھے جو شادی شدہ تھے۔

کافی دیر آئیں بائیں شائیں کے بعد اندر سے بلایا گیا کہ ... لڑکی ... ہو گئے۔ ... دوسرے دن صبح ایک ... اب ... مستقل کلاس ون افسر کے رتبے ... تنخواہ 800 سے شروع ہوتی ہے۔ سچ پوچھیے تو اب ... کسی ناپو بعد میں بڑی بھی لے لینا۔"

"تمہارے لیے پیام آئے ہیں صاحب، ذرا ہوشیار رہو۔" ... نے شرارت سے آنکھیں نچاتے ہوئے کہا۔

"ہمارے لیے بھی! یار ... بہت سنجیدگی سے ... کا تنکا توڑتے ہوئے کہا۔

"تمہیں کیوں چڑھنے لگے؟"

"اس لیے کہ آپ ان پیغامات پر جو آپ کے لیے آ رہے ہیں، تن خوشی کا اظہار کر رہی ہیں۔"

"احمق ہیں آپ!"

"وہ تو اسی دن قرار پا گئے جس دن سے آپ کی مدد کی۔"

"یہ بے شرمی کی تھی ... کریں گے؟ واپس لے لیجئے۔"

"چلیے، واپس لیا۔"

زہرہ سچ مچ ناراض ہوئی۔ "اب کیا میرے نکاح میں کوئی ... ارادہ ہے؟"

"تو کیا کریں؟ آپ کے ابا آپ کے دادا کی چھڑی سے ... چھڑی کی ... چاندی کی ہے، زور سے لگے گی۔"

"سید زادی سے شادی کرنے کے لیے دو چار چھڑیاں کھا لینا کوئی بڑی بات نہیں۔ ... سمجھ جائے گی۔"

"سمجھ ... باپ سے چلا کرتی ہے۔ آپ کے یہاں کی ... تمہیں ہے۔"

Scanned with CamScanner

"بی چھوڑیے اصل اس سے چلتی ہے جس کا پلہ بھاری ہو۔ ہمارے ہر دلعزیز راجیو گاندھی نہرو کے نواسے ہی کہلاتے رہے۔ ان کے والد کا نام تو ضرور معلوم ہے۔ ان کا بتا دیں تو ابھی آپ کو سونے کا تمغہ دے دیں ہم۔"

ایاز نے سر کھجانا شروع کر دیا۔ "سید زادی ہونے کا جو زعم آپ کو بھی ہے، جبکہ حضور نے اپنی صاحبزادی سے فرمایا تھا کہ اے فاطمہ، اس زعم میں نہ رہنا کہ رسول کی بیٹی ہو۔ روز محشر تمہارے اعمال تمہارے ساتھ اور میرے اعمال..."

"اور حضور نے یہ بھی فرمایا تھا" زہرا نے مصرع اٹھانے کے انداز میں بات کاٹ کر آگے کہنا شروع کیا، "تم میں سے کسی کو کسی پر فوقیت نہیں —"

"نہ کالے کو گورے پر نہ گورے کو کالے پر —"

"نہ عربی کو عجمی پر نہ عجمی کو عربی پر۔ مگر ایاز صاحب، ہم سے شادی کریئے گا تو بچے تم خود کر اپنا نام بنائیں گے۔ مثلاً بیٹے کا نام کیا رکھیں گے آپ؟"

"فرض کیجیے، کیقباد احمد وارثی —"

"یہ کیقباد کیا ہوا؟ واہیات نام ہے۔"

"یہ نہایت مدبر رعایا پرور سلجوق سلطان تھا۔ کچھ مورخین نے تو اسے کیقباد دی گریٹ کہا ہے۔"

"کہا ہو، یہ سید کیقباد دی گریٹ احمد وارثی چلے گا نہیں۔"

"تو کوئی اور وریدنا لیجے کہ ہم اپنا سلسلۂ نسب یا عرب سے جوڑ سکیں یا سینٹرل ایشیا سے، خواہ ہم وہاں فوج میں گھوڑوں کی لید سمیٹنے پر کیوں نہ مامور رہے ہوں یا رابرٹ بدوؤں کی جماعت میں ہوں۔"

"یہ تمہارا احساسِ کمتری بول رہا ہے۔"

"زہرا! کیا تم سنجیدہ ہو؟" ایاز کے لہجے میں خفیف سی دھار تھی اور کچھ حیرت بھی۔

زہرا دہشت زدہ ہو گئی۔ "فار گاڈز سیک ایاز" اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ پارک میں آس پاس کوئی دکھائی نہیں دیا۔ صرف ایاز کی موٹر سائیکل چمک رہی تھی۔ وہ اس کے بہت قریب آ گئی، تنا

قریب کر کے اس کی سانسوں کو اس نے اپنے چہرے پر محسوس کیا۔ "آئندہ ایسا مت کہنا۔ سوچنا۔ میں جس مرد موسیٰ کے ساتھ اپنی باقی ساری زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکی ہوں اس سے زیادہ معظم میری نظروں میں کوئی نہیں۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نمی تھی۔ "اور ہاں،" اس نے خود پر قابو پا کر کہا، "تم شوق سے ہمارے بیٹے کا نام کیقباد رکھنا۔ مجھے تمھاری کسی بات پر کبھی اعتراض نہ ہوگا۔" اس بار اس کی آواز میں مسکراہٹ سے روشن تھی۔

"حق مذنی،" ایاز نے اسے تیزی سے اور قریب کر لیا۔ "کیقباد کی ماں! کیا ویسا رہے گا؟ نہیں تو جہاں اریق ہوگا۔ یہ سارے سینٹرل ایشیا کے گھاس کے میدانوں کی خوشبو میں بسے ہوئے نام—"

زہرا نے اس کے پورے چہرے کو اپنے ہاتھ سے ڈھک کر زیر لب کہا، "پاگل کہیں کے۔"

"گھر میں بیری ہو تو ڈھیلے آتے ہی ہیں، لیکن ایسا بے ڈھب ڈھیلا! منہ اٹھا کے سیدھا زری کا ہاتھ مانگنے چلے آئے۔" زہرا کی والدہ، اہلیہ محمود علی نے آموں کے ٹوکرے کو دور کیا۔ ہماری جو یار کی نے بھجوایا تھا۔ بہترین، تازہ اور چیدہ گلاب خاص اور دسہری فرش پر لڑھک گئے۔ کچھ دیر وہ غصے میں تن بھن کرتی رہیں، پھر ملازمہ سے کہہ کر آم اٹھا کر ٹوکرے میں رکھوا دیے اور ان کے یہاں واپس بھجوا دیے۔ آموں کا ٹوکرا بطور سوغات انھوں نے سویرے ہی بھجوایا تھا، جو پڑوسی کی طرف سے دوستی اور منکسر المزاجی کا مظہر سمجھ کر قبول کر لیا گیا تھا، لیکن سہ پہر کو ایاز احمد وارثی کی والدہ تشریف لے آئیں اور ابتدائی گفتگو کے بعد پرس سے ایک کاغذ برآمد کیا۔

"پہلے رشتے چلا کرتے تھے جو شرط لازمی تھی۔ اب یہ ہے بایوڈیٹا۔ وہ بھی آیا ہوگا تو ہمیں بھی دینا پڑتا ہے،" وہ وضاحت کر رہی تھیں۔ (ویسے اندر سے چھوٹا منھ بڑی بات تو وہ بھی طرح محسوس کر رہی تھیں۔ بیٹے کی محبت میں اس مکان پر غور کر کے آئی تھیں کہ انھیں اہانت کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔)

"کیا مطلب؟" اہلیہ محمود حسین واقعی کچھ سمجھ نہیں سکیں۔ اس کا تو انھیں سان گمان بھی نہیں تھا کہ یہ زہرا کے لیے پیغام ہو سکتا ہے۔

"ہم زہرا بٹیا کا ہاتھ مانگنے آئے ہیں،" وہ بڑی گھبراہٹ پر قابو پا کر ایک دم سے بول پڑیں۔

Scanned with CamScanner

نہیں، رشتہ ہو گیا میں تو شاید ہمت ٹوٹ جائے اور اٹھ کر بھاگ جائیں۔

لڑکی کی ماں نے انھیں یوں دیکھا جیسے وہ ذہنی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔

"میرا بیٹا ڈاکٹر ہے۔ سرجری میں اسپیشلائز کر رہا ہے۔ مقابلے کا امتحان دیا تو پہلی مرتبہ میں کامیاب ہو گیا۔ ایم بی بی ایس میں بھی اول آیا تھا۔ سو ہم اس وزن کے ... دل رکھتے ہیں۔ صورت تو آپ نے دیکھی ہی ہے۔ گورا اور ... سعادت مند ایک مرتبہ۔" بیٹے کی خوبیاں بیان کرتے وقت وہ کافی تاثر ہو چکی تھیں اور فخر خوشنگ کر بات کر رہی تھیں۔

محمود حسین نے انھیں شرارے برساتی نظروں سے گھورنا چاہا لیکن ضبط کر گئیں۔ ملازمہ چائے لا کر رکھ چکی تھی۔ جی تو چاہ رہا تھا، اس گستاخ عورت کو اسی وقت نکال باہر کریں، لیکن وہ مہمان عورت پردے میں تھی اور پھر صبح ہم سب کا نوکر قبول کر چکی تھیں۔ مزید ضبط و تحمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے انھوں نے چائے کی پیالی بڑھائی اور ناشتے کی پلیٹ بھی، لیکن چہرے کا رنگ بدل چکا تھا جو ان کی بیگم کی ... پر صاف نظر آ رہا تھا۔ چائے پی کر وہ اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"جواب کا انتظار رہے گا۔"

"جواب کا انتظار نہ کریں۔ شادی کفو میں کی جاتی ہے۔"

"تعلیم اور رہن سہن کے معیار، خاندانی لوگوں کے کردار سے بنتے ہیں۔ ان تمام باتوں سے آپ ہمیں کفو سے باہر نہیں پائیں گی۔"

وہ دروازے کی سمت بڑھ چکی تھیں۔ لڑکی کی اماں، غصے سے گنگ، اٹھ کر اندر چلی گئیں۔ ڈاکٹر اید... اور ڈاکٹر کا بائیو ڈیٹا کچھ دیر میز پر پڑے پڑے پھڑپھڑاتا رہا، پھر ہوا سے اڑ کر آنگن میں چلا گیا جہاں سے ملازمہ نے اٹھا کر کوڑے کی بالٹی میں ڈال دیا۔

بائیو ڈیٹا کچھ یوں تھا۔

عمر: 27 سال

تعلیم: ایم بی بی ایس، گولڈ میڈلسٹ (ایم ایس)

قد: 5 فٹ 8 انچ

وزن: 58 کلو

رنگ: گورا

شوق: کرکٹ، ادبی کتب کا مطالعہ

عادات: شریف (روپے دھڑنے والے محنت کش انسان)

مذہب: سنی مسلمان

خیالات: حسن خیالات۔ مذہب سے لگاؤ۔ دین اسلام کے اصولوں اور جدید اقدار میں یقین

والد: ایڈووکیٹ ہائی کورٹ

والدہ: بی اے پاس، ہاؤس وائف

مستقبل: نہایت روشن

رشتہ والی بیگم نے محمود علی صاحب سے کہا: ”دونوں خاندان بہت صاف شفاف نظر آ رہے ہیں۔ آپ یہ تو زہرا کی بات آگے بڑھائیے ورنہ کسی دوسرے رشتے پر غور کیجیے۔“

”ایسا اچانک آپ کو زہرا کی شادی کی کیا سوجھ گئی؟ ابھی وقت باقی ہے۔“

انھوں نے اس بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ بولیں، ”دونوں خاندان سے یہاں کا رشتہ بہت مناسب ہے۔ عادات کا کچھ پوچھنا نہیں، جانے بوجھے لوگ ہیں۔ لڑکا ڈاکٹر ہے۔“

”ہوں... سوچا تو جا سکتا ہے۔ لیکن لڑکا...“

”لڑکے میں کیا خرابی ہے؟“

”قد کم ہے زہرا کے حساب سے، ورنہ ہے۔“

وہ بھڑک گئیں۔ ”اب فیتہ لے کے لڑکے ناپتے پھریے گا؟ اور یہ جو سنا ہے کہ میڈیکل میں داخلہ پیسہ کھلا کے ہوا تو سب کا ایسے ہی ہو رہا ہے۔ لاکھوں لڑکے بیٹھتے ہیں، ان میں سے آپ نے محض ڈیڑھ دو ہزار لیے تو باقی کہاں جائیں گے؟ سب ناکارہ نالائق ہی ہیں کیا؟“

”میں اس موضوع پر بات ہی کہاں کر رہا تھا۔ ڈاکٹر ہے نا، آگے آیت رشتہ یہ ہے کہ ان لوگوں کا مطالبہ بھی ہے۔ اب اگر ہماری بساط سے زیادہ مانگ بیٹھے؟“

”زہرا ایم بی اے کر رہی ہے، نوکری کرا سکتی ہیں۔ انھیں پسند بھی ہے۔ زیادہ بات نہیں

گے جہاں لڑکی کمتر ہو۔"

لڑکی کی شادی کی بات، وہ بھی ماں کے منھ سے، کوئی انوکھی تو نہیں لیکن جس لہجے میں اور جس چڑ تنک طریقے سے اٹھائی گئی تھی، اس سے محمود علی صاحب کچھ ٹھٹک ضرور رہے تھے۔

"کیا دردانہ نے کچھ کہلوایا ہے؟"

"دردانہ نے ابھی ادھر تو کچھ نہیں کہا لیکن آپ کے بھائی صاحب جن لوگوں کو ہمارے سر پر مسلط کر گئے ہیں، وہاں سے زہرا کے لیے پیغام لے کر لڑکے کی والدہ آ کر بیٹھیں۔ ادھر میں نے زہرا میں کچھ تبدیلیاں محسوس کی ہیں۔ میرا تو شام سے دماغ خراب ہو رہا ہے۔"

"کیا؟" محمود علی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ "ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ یقیناً انھیں کسی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ ورنہ کسی کی کیا، تمھاری بیٹی کی ہوگی۔ ذرا پوچھنا تو کل اس سے۔"

"میری بیٹی کا نام مت لیجیے۔ آپ کے بھائی صاحب نے ہتھیا لیا نا۔ جب وہ انھیں اس لائق سمجھ سکتے ہیں کہ اپنا مکان ان کے ہاتھ بیچ جائیں تو یہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ پیغام بھیجو، آخر تم میں کیا کمی ہے۔"

محمود علی خاموش ہو گئے۔ شاید بیوی سچ کہتی ہوں مگر کل اس، زہرا کی خبر تو ضرور لینی ہے۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ زہرا کا ادھر ہر جمعے کو ایکسٹرا کلاس ہونے لگا تھا وہ سویرے ہی تیار ہو کر نکل چکی تھی۔ جمعے کی نماز کو جاتے ہوئے محمود علی صاحب یہی سوچ رہے تھے کہ شام کو ہی ذرا لڑکی سے پوچھنا ہے کہ یہ کیا گل کھلا رہی ہے، اور اتوار کو پہلی فرصت میں ڈی ایس پی صاحب سے مل کر رشتہ پکا کر دینا ہے۔

سوچ میں گم محمود علی نے نظریں گھمائیں۔ ایاز آج بھی ان کی صف میں ان کی بغل میں کھڑا تھا۔

Scanned with CamScanner

ذکیہ مشہدی

گلی سرمست میں رمضان

مغرب میں زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔

حافظ مستقیم عرف حافظ جی نے جلدی جلدی مسالہ لگے قیمے کو آٹے کی طرح گوندھنا اور سیخوں پر تانا شروع کیا۔ وہاں پر کام کرنے والا لڑکا مغلی پنکھے سے انگیٹھی کے کوئلے دہکانے میں مصروف تھا۔ انگیٹھی کے دوسرے سرے پر المونیم کا بڑا سا چائے والا دیگچہ رکھا تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگ آنے لگیں گے۔ ایسے نہ جانے کتنے ہیں جن کا گھر دوار نہیں ہے۔ سب افطار کے وقت حافظ جی کی دکان پر اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ روٹی، کباب، چائے اور پکوڑوں سے روزہ کھولتے ہیں۔ پکوڑے، جو عام دنوں کے مینو میں شامل نہیں ہیں، رمضان میں خصوصی اہتمام کے طور پر بننے لگتے ہیں۔

"جلدی کر بیٹا،" حافظ جی نے لڑکے سے کہا۔ "جاڑوں میں سورج کتنی جلدی ڈوبتا ہے۔ گرمی میں تو جیسے اس کے پاؤں بھاری ہو جاتے ہیں۔ ڈوب کے ہی نہیں دیتا۔"

"السلام علیکم حافظ جی۔ السلام علیکم بھائی مغل۔" یہ اکبر تھا۔ وقت سے کچھ پہلے ہی چلا آیا تھا۔ "پڑھ پڑھ کے سالا دماغ خراب ہو گیا۔" وہ زیر لب بڑبڑایا اور انگیٹھی کے سامنے ہاتھ کر کے ہاتھ تاپے۔ "ٹھٹھر کے انگلیاں اکڑ گئیں۔"

ابھی اور لوگ نہیں آئے تھے اس لیے اس نے آرام سے پاؤں پھیلائے اور بنچ اوپر چڑھا کر بیٹھ گیا۔ اکبر سامنے والی بلڈنگ کے لڑکوں میں سے تھا۔ چار پانچ کمروں میں کوئی سولہ سترہ لڑکے رہتے ہوئے تھے۔ سب کے سب قریب کے کوچنگ انسٹیٹیوٹ میں انجینئرنگ یا میڈیکل کالجوں میں

والدین نے تحقیقات کی پڑھائی کر رہے تھے۔ کل رمضان سے کئی لوگوں نے اپنے گھر والوں میں تبدیلی کر دیا تھا۔ بیشتر ناظمی مہیا کرتے تھے۔ یہ تھے مختلف رب کی سہولت دی گئی۔ سب سے سب نے بہت مہنگے۔ ماں باپ ستاتے رہتے تھے۔ لڑکا میڈیکل یا انجینئرنگ کالج میں آ گیا تو وہ سے نے میں بھرتی سے مع ... داخل نکلوا لیں گے۔ نہ آیا تو بھی دیکھا جائے گا؛ جب تک امید ہے تب تک خوش ہوتیں۔ ایسے ایا اب پہلے سے زیادہ وسیع ہو چکی ہے، ما تنیں پر رہے بھی کہیں سے تیں ہوتی جاتے ہیں۔

شادو مست ... میں آبادی کا تناسب ذرا اگر بڑ گیا تھا، اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ غیر مسلم لڑکے بدرجہ مجبوری ہی یہاں آتے۔ جو آتے تھے انہیں لوگ چنگ کے ساتھی چھیڑتے۔ ''... سنتے میں، یہ پاکستان میں رہتے ہیں۔'' ''کیوں جی، میاں بٹے میں کتنی دیر ہے؟'' ''... میں نے دیکھا تھا، ایک دن مسجد سے نکل رہے تھے۔''

یہ مسجد والی بات ذرا بے ڈھب تھی۔ جس سے کہی گئی تھی وہ لڑکا گھبرا گیا۔ دراصل وہ اپنے ایک ساتھی کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچا تھا۔ ساتھی دو دن سے غیر حاضر تھا اور اس کے نوٹس اسے کرنے تھے۔ اس کے بارے میں کسی نے بتایا کہ عشاء کی نماز کے لیے باقاعدگی سے مسجد آتا ہے۔ یہ اس کو ڈھونڈتا ہوا وہاں پہنچ گیا تھا۔ یار لوگ غضب کی خبر رکھتے ہیں۔ ڈر گیا کہ کہیں اوپر تک بات پہنچ گئی تو بیڑا غرق ہو جائے گا۔ شادو مست کی لڑکی سے وہ پہلے ہی ڈرے ہوئے تھے۔ لڑکا انہی دنوں میں کہیں اور منتقل ہو گیا۔ بڑی مشقت کے بعد ایک جگہ تلاش کر سکا تھا جہاں پے انگ گیسٹ بن کر رہ سکے۔

''... صاحب، تو بھی آج'' اکبر نے قیصر کو بالکونی سے جھانکتا دیکھ کر ہانک لگائی۔ قیصر کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔

''یار، آج صبح سے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا ہے۔ پیاس بھی بہت لگی۔ تپ ٹھنڈ ہے، پھر بھی۔ حاجی کے کباب پراٹھے کھا کے اور ہو گا بھی کیا!''

دراصل رمضان میں ہی نہیں، عام دنوں میں بھی یہ لڑکے زیادہ تر حافظ مستیا کے کباب پراٹھوں پر گزارہ کرتے تھے۔ چھ روپیوں میں پیٹ بھر جایا کرتا تھا — خوب تیز مسالوں والے

کباب اور ہرے دھنیے کی کھٹی چٹنی۔

شاہ دستر خوان [illegible] سجا [illegible] تھا۔ [illegible] افطار کے وقت جب [illegible]
رہتے [illegible] [illegible] وقت [illegible]
بھائی مغل اماں [illegible] کباب پراٹھے [illegible] میں سب [illegible]
[illegible] ؟" [illegible] سے [illegible] سے آگئے" اور
سے مغیث حیدر عرف مغل کی [illegible] اور حافظ [illegible] سنائی دی۔

اتنے [illegible] کباب [illegible] اس کی آنکھوں میں چمک آگئی۔ [illegible] پیٹ پر ہاتھ [illegible] اس نے
[illegible] سے [illegible] پیٹ پیچھے کر لی۔ "آپ بڑے [illegible] ہیں۔ [illegible]"

"[illegible] فوری طور پر
وہ [illegible] سمجھ نہیں پایا۔

"[illegible] تو [illegible] بھی نہیں کھانے کا [illegible]
[illegible] وہ بھی نہیں تو پھر اس میں کیا شک!"

اتنے ایک [illegible] ہنس پڑے۔ [illegible] کا غصہ رفع نہیں ہوا تھا لیکن [illegible]
کی قدر کی۔

"کباب پر [illegible] اس کا مطلب ہے، گوشت [illegible] ہو؟"

"ہاں، گوشت تو [illegible] کھاتے ہیں کہ ہمارے کھانے کے بعد [illegible] مگر
ہاں..." اس نے سر کھجایا۔

"وہ بھی کھانے لگو گے،" دانش نے مصنوعی سنجیدگی سے کہا، "جب [illegible] روپ میں [illegible]
کباب پراٹھے [illegible] گے۔ محترم [illegible] پر رکھ کے یہاں کئی [illegible] والے"

"دانش!" [illegible] نے بڑی زور سے دانش کو ڈانٹا۔ وہ باقی لڑکوں سے عمر میں [illegible] بڑا اور مزاجاً
سنجیدہ تھا۔

"اب [illegible] کیا کر رہا ہے؟" قیصر نے اسے کو بھی بالکونی میں [illegible] دیکھ [illegible]
اس بار اس نے ہانک لگائی۔

"آپ... جب روزہ نہیں رکھتا تو... رکھو، شام کی چائے تو پیے گا نا؟ چل آج افطار ہماری طرف سے۔" وہ لڑکے اور چلے گئے۔

ابھے اور نجی دونوں آ گئے۔ جب سے رمضان شروع ہوا تھا، یہ دونوں نئے منظر سے دوچار ہو رہے تھے۔ شروع میں گھبراہٹ بھی ہوتی تھی۔ شام ہوتے ہی نہ جانے کہاں سے بہت سارے مسلمان بلبلاتے ہوئے نکل پڑتے تھے؛ سر پر کروشیا سے بنی ہوئی ٹوپیاں، اذان کا انتظار کرتے۔ مسجد میں اذان ہونے سے پہلے چھوٹی لڑکیاں اور لڑکے کشتی میں افطاری لیے ہوئے مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیتے۔ ان کی سینیوں پر بھی اکثر کروشیا سے بنے ہوئے خوان پوش پڑے ہوتے۔ دوپٹوں سے سر ڈھکے، سر جھکائے وہ لڑکیاں بڑی پیاری لگتیں۔ پڑوس میں رہنے والی ایک خاتون شاد سرمست لاج میں رہنے والے لڑکوں پر بڑا ترس کھاتیں۔ "ہائے، بیچارے گھر سے دور رمضان میں روزے رکھ رہے ہیں۔" کبھی کبھی وہ مسجد کے ساتھ ساتھ ان کے یہاں بھی کچھ بھیج دیتیں۔ ابھے اور نجی کے بھی چھکے پنجے ہو جاتے۔ ایک دن انجی نے کہا، "ذرا تفتیش کر لی جائے۔ یہ تو شاید فیوچر انوسٹمنٹ ہے۔ گھر میں کوئی تیرہ چودہ برس کی لڑکی ہوگی۔ کچھ سال بعد ڈاکٹر یا انجینئر۔"

دانش بگڑ گیا۔ "ابے یہ ہمارے یہاں کا دستور ہے۔ مسجد میں کون سے ڈاکٹر یا انجینئر پکڑنے کو افطاری بھیجی جاتی ہے؟"

"تو ترنگ کیا ہے؟" ابھے نے انجی کا ساتھ دیا۔ "برا کیوں مان رہے ہو؟"

"سالے، تم دونوں پٹ جاؤ گے!" دانش نے آنکھیں نکالیں۔

"ہاں، اقلیت میں ہیں۔ اقلیت ہمیشہ سے پٹتی چلی آ رہی ہے۔"

"بہت بڑا فلسفہ بگھار رہے ہو تم نے تو!" دانش نے اس بار سالے سے دو چار ڈگری آگے کی گالی جوڑی۔

"رمضان میں زبان نہیں خراب کرتے۔ خبردار جو گالی بکی ہے!" اکبر نے دانش کو ڈانٹا۔

"بھیا جی!" قیصر کہہ رہا تھا۔ "ایک دن روزہ رکھ کے دیکھو، پھر مزہ دیکھو پکوڑوں کا۔ اس سے تو خیر تم محروم ہو۔" اس نے شرارت سے ہندوؤں کی طرف اشارہ کیا۔

ابھے اور نجی کو رمضان کے شروع میں سحری کے اعلان اور پھر فجر کی نماز کے بعد میلاد سے

بڑی دقت ہوتی تھی۔ 'یار تم لوگ اپنے ساتھ دوسروں کی نیند کیوں حرام کرتے ہو؟'' ایک دن چڑ کے کوئی بولا تھا۔

''مسجد والے تو باقاعدہ اس کے خلاف مہم چلا چکے ہیں۔ تو بھی چپ رہے!' بولنے والا حاجی ہو گیا۔ قیصر سے ہونٹ بھینچ کے کو چھوڑ کے۔ اسے خود ہی سخت وقت ہوتی تھی۔ سحری کھانے کے لیے خاص وہ بھی جاڑوں میں۔ اسے نیند سے زیادہ کچھ عزیز نہیں تھا۔ وہ قیصر کے نقطہ نظر سے سوچنے کے برابر ایک اس میں کوئی مذہبی رنگ نہیں ہے۔ ہوٹل میں دو چار ملے تھے۔ وہ قیصر کی گردن دبا دیتے۔ بس یہ اس نے زبان بند رکھنے میں عافیت سمجھی۔ اکثر یہی ہوتا ہے۔ وہ جو معقول سوچ رکھتے ہیں، اپنی زبان بند رکھنے میں ہی عافیت محسوس کرتے ہیں۔

مسجد سے مغرب کی اذان کی آواز بلند ہوئی۔ دکان پر جھنجھٹ لگ چکا تھا۔ کسی نے ایک شربت پانی سے روزہ کھولا، کسی نے جیب سے کھجوریں نکالیں۔ ایک شخص نے ایک کھجور کے دو ٹکڑے کیے اور ایک ٹکڑا مغلی کو بڑھا دیا۔ ''ہم روزہ دار نہیں ہیں!'' کہتے کہتے وہ رک گیا۔ دونوں ہاتھوں کے پیالے میں کھجور یوں لی جیسے وہ پرشاد لیا کرتا تھا، پھر ماتھے سے لگا کے قیصر کو بڑھا دی۔ اس شخص نے قدرے حیرت کے ساتھ اس کو دیکھا۔

افطار کے بعد لوگوں نے ٹوپیاں سنبھالیں۔ حافظ جی نے بھی۔ مغلی نے حسب عادت ٹوکا۔

''جلدی آجائیو چاچا''

''ابے لوگے، ہم دیر لگاتے ہیں کبھی؟ روز تو تجھے نہیں ہوتا۔''

''ہیں ہیں ہیں ... بچے ہم سے اکیلے نہیں بیٹھا جاتا۔ پھر ہمیں بھی تو نماز پڑھنی ہے۔''

''چپ بے، دکان دیکھ۔''

حافظ مستیا کو معلوم تھا مغلی کبھی نماز نہیں پڑھتا۔ اسے پڑھنی آتی بھی نہیں۔ البتہ عید کے دن عید کا ضرور جاتا ہے اور جیسے جیسے لوگ رکوع اور سجدے میں جاتے ہیں وہ بھی عمل کرتا جاتا ہے۔ دعا میں البتہ بہت کچھ مانگتا ہے۔ اپنی خود کی چھوٹی سی دکان، اماں کی آنکھیں، بہن کی شادی، ایک چھوٹا سا گھر، اس گھر میں پائل چھنکاتی بیوی اور چیختے چلاتے شور مچاتے بچے۔ اور بھی بہت کچھ ... ساتھ ساتھ جو سب سے بڑے ہیں ابھی اپنے لوگ جنھوں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہو ان کے لیے

اللہ میاں سے حسب توفیق ان کا برابر ربط بھی با خصوصیت رہتا۔ ایک مرتبہ حافظ جی نے دو دن
اس بات میں خفت رکھنے پر سے پچھتایا تھا۔ اتفاق سے یہ واقعہ رمضان میں ہوا تھا۔ عید کی نماز میں
انھوں نے دعا مانگی: "اللہ میاں، اس حرامزادے حجام کی تو ٹانگ ہی توڑ دیجیو۔" عید کی نماز سے واپس
آکر حافظ جی نے اسے دس روپے عیدی دی تو اس نے فی الفور ایک بد دعا واپس لے لی اور
ان کے بے کار استعمال کرنے کے لیے اللہ میاں سے معافی بھی مانگی۔

رمضان میں افطار کی گہما گہمی کے بعد جب عشا اور تراویح کے بعد تک محلہ بڑی حد تک سنسان رہتا تھا
اس لیے وہ دونوں قصوں پر سر دھنتے ہوئے اٹھنے لگا۔

"ارے بھائی مغل!"

مغلی اچھل پڑا۔ آواز کراری اور اختیار آمیز تھی۔ آنکھیں ترچھی کر کے دیکھا تو بابو جی
تھے۔ گلی کے اختتام پر جہاں سے چوڑی سڑک شروع ہوتی تھی وہیں کریم ... کا دو منزلہ مکان تھا۔
نیچے حصے میں مٹھائی کی شیشوں سے مزین فیشن ایبل دکان اور اوپر رہائش گاہ۔

"بابو جی آپ؟" حیرت سے مغلی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ ایسی بات نہیں کہ بابو جی سے
کوئی تعلق نہیں تھا۔ سلام پرنام اور تو تو میں میں، دونوں کا رشتہ تھا، لیکن تھا دور دور کا۔ دکان پر تو وہ
صرف ایک مرتبہ اور آئے تھے، تصدیق کرنے کے لیے کہ ان کا لڑکا یہاں بیٹھ کر کباب کھاتے تو نہیں
گیا ہے۔

"ہاں ہم! نہ آئیں تمھاری دکان پر کیا؟ اچھوت سمجھتے ہو؟" مغلی اور زیادہ گڑبڑا گیا۔ خیریت
ہوئی، نماز پڑھ کے واپس آتے حافظ جی دکھائی پڑ گئے۔ اس کی جان میں جان آئی۔

"سلام اللہ جی، آپ؟" حافظ مستقیم بھی گھبرا گئے۔

"کیوں بھائی، ہم پڑوسی نہیں ہیں کیا؟ ہم نے تو سوچا ہے کہ گلی سرمست کے سب مسلمان
بھائیوں کو افطار کی دعوت دیں۔ آخر ہم لوگ ایک جگہ رہتے ہیں، دکھ سکھ کے ساتھی ہیں۔"

"مگر بابو جی، آپ کو یہ سب ابھی کیسے یاد آیا؟" مغلی بولنے ہی والا تھا کہ حافظ جی نے آنکھ
کے اشارے سے تنبیہ کی۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں برادر جی۔ ہم سب آئیں گے۔ کب کرا رہے ہیں افطار؟"

اس کی بات درست تھی۔ پکوڑے آپ ہی سے چکھنے میں نے۔ اور ہاں، پتہ ہی آپ سے [illegible] ہے۔ باقی محلوں کی محفلیں نے۔" وہ دیر تک ہنستے ہوئے اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ مدعوین کی فہرست بھی بن گئی تاکہ کوئی چھوٹے نہیں۔

"وہ [illegible] ہو رہا تھا۔ مسجد میں اس بار موبائل فار روشنی کے اعلان میں ہوتے [illegible] رہتے ہیں" یہ دعوت کی تو [illegible] نے [illegible]۔ جیت گئے تو صرف بچوں کی محفل میں کی [illegible] سے [illegible]۔ رمضان اب رہے گا [illegible]۔"

تم سب سے [illegible] کی نظروں سے ہی دیکھتے ہو" قیصر نے پڑھتے پڑھتے کتاب پر سے نظریں اٹھائیں۔ "ایک دن اچھا افطار مل جائے تو۔ بیچارہ مغل دن رات محنت کرتا ہے۔ [illegible] مہمان ہے، پھر بھی دکان پر زندگی بسر ہو رہی ہے۔"

"مغل کون سا روزہ دار ہے؟ خواہ مخواہ ترس کھا رہے ہو" ذیشان جھنجھلایا۔ دوسرے فریق سے ایک سال میں اچھا موافق ہونے ہی نہیں رہا تھا۔

مغل کا اپنا ایک الگ فلسفہ تھا۔ "اللہ میاں نے ویسے ہی ہمیں کھانے کو کم دیا ہے، اب یہ روزہ ہم پر فرض نہیں ہے۔ ہم بغیر روزہ رکھے بھی رہتے ہیں۔ بھوکا رہنے پر کیسا ثواب۔" رزق رکھنے والا مغل کا ہم نوا تھا۔ رات کو گرم دودھ اور پکوڑوں کی سحری کرتا، کہ گلی رمضان میں رات بھر جاگتی تھی۔ [illegible] مونچھوں سے دودھ چاٹ کر پکوڑے کو روزے کی نیت کرتا لیکن [illegible] سے [illegible] جب تک روزہ توڑ [illegible] دیتے، کیسے انہیں کہتا [illegible] اب بھی پیٹ خالی ہوگیا تو بڑے روزہ کی بھوک لگتی ہے، پھر ہم سے رستہ نہیں کھینچتا۔ ایک سے ایک موٹی موٹی سواریاں چڑھ جاتی ہیں۔ ایک ڈاکٹر صاحب کی بی بی چڑھتیں۔ ایک [illegible] ایک چھوکری، ایک بنگل کی خود، جیسے گلو بجلی، پانچ منٹ میں دو جلے تلوے ہیں۔ لیکن کھاتے ہیں یہ لوگ رمضان میں اگلے داری ہے۔ منع بھی نہیں کر سکتے۔ سامان اور دو دو ٹوکریاں ہیں ضد چڑھا گئیں۔ پست ہو گئے پڑ گئے۔ روزہ توڑنا پڑے۔" لیکن گلی میں چچل [illegible] شرف، ماسٹر ساجد علی، غلام علی باربر، اشرف کا بھائی مشرف، وزیر میو سے [illegible] سب کے سب پکے روزے دار تھے۔ رشید نے چار مسلمان [illegible] بھی پابندی سے روزے رکھتے تھے۔ رزاق ان سب کی بڑی عزت کرتا تھا۔ "اے بھیا، جنت میں زیادہ جگہ تمہیں تھوڑی ہے

ہیں گے۔" حنیف گھوم گھوم کے سلائی مشینیں کی مرمت کرتا پھرتا۔ آواز بھی لگاتا جاتا، "سلائی مشین مرمت!" لیکن کیا مجال جو روزہ قضا ہو۔

"ہردیال چاچا جس دن افطار پارٹی دیں گے، اس دن ہم بھی روزہ رکھیں گے۔" بھگے نے اعلان کیا۔

"ابے کیوں ہم لوگوں کو بدنام کرے گا۔ ویسے بھی روزہ رکھ یا مت رکھ، جانے کا تو جہنم میں ہی۔" دانش نے اس کا منہ چڑھایا۔

"ہی ہی ہی... سب اچھے لوگ وہیں ہوں گے۔ تم رہیو داڑھی والے بیوقوف امام صاحب کے ساتھ۔ مائیک پر پڑھ رہے تھے وہ کیا کہیں کہ خطبہ۔ ترکیب بتا رہے تھے کہ بیوی کو کیسے ماریں کہ چہرے پر نشان نہ پڑیں۔"

دانش کھسیانا ہو گیا۔ بھگے اور چندن نے اس رات دھوم دھڑکے، شور شرابے کے ساتھ سحری کھائی اور دوسرے روز روزہ رکھا۔

"اب سالے کہیں مسجد میں نماز پڑھنے مت جائیو!" اکبر نے سنجیدگی سے کہا۔ "سالے ہردیال افطار پارٹی تو دے دیں گے لیکن اس کے بعد ایک مدافعت کر ڈالیں گے۔ امتحان قریب ہیں، سب بن جاؤگے ڈاکٹر انجینئر!" بھگے نے منہ اٹھا کے جواب دیا، "ہی ہی ہی!"

اسی جمعے کو رکشہ اسٹینڈ کے رکشے والوں نے چاروں مسلمان رکشہ والوں کے لیے افطار کا اہتمام کیا۔ اس دن شرما حضوری رزاق نے بھی پورا روزہ رکھ لیا۔ بیج ناتھ گھر سے بہت سے پکوڑے بنوائے لایا۔ گلشن نے کھیر رکھی، شرما نے پھل، اور پاسوان نے حاجی کے یہاں سے گھوگنی خریدی۔ شام کو جگہ صاف کر کے ان سب نے پرانے اخبار بچھائے جو وہ ردی بیچنے والے بڑھو سے مانگ لائے تھے۔ (بڑھو کا کوئی نام نہیں تھا، وہ صرف بڑھو کہلاتے تھے۔ اللہ جانے پیدائشی بوڑھے ہوئے تھے یا کبھی کوئی اور نام بھی تھا۔)

بیج ناتھ نے کہا، "نمک کا بھگوان مالک ہے۔ گھر والی بولی ہے کہ بھگوان جی کا پرساد چکھا نہیں جاتا، اس لیے بیسن گھولتے وقت نمک نہیں چکھا ہے۔"

اذان ہوئی تو سر پر انگوچھے باندھ کے سب گھیرا بنا کے بیٹھ گئے۔ "اس سے اچھے پکوڑے ہم نے

Scanned with CamScanner

بیٹے نہیں کہا ہے۔'' نور محمد نے کہا۔ ان کی آواز میں ہلکی سی نمی تھی۔ اچانک سب کی جیب سے کی اجابت رانی۔ رستم ... کے سارے کے سارے اٹھ رہے تھے ہاتھ میں افطار کی پلیٹیں تھامے وہاں چلے آ رہے تھے۔ چندوں سے ہاتھ میں چٹائی بچھی تھی۔ سب وہیں بیٹھ کے بیٹھ گئے۔

''چلو مومنو، اللھم لک صمت۔ اب جلدی افطار کر لیجئے۔''

معلوم ہوا کہ اس افطار کی خبر کبیر نے دی تھی۔ صبح وہ رزاق کے رکشے سے کہیں گیا تھا۔ سے رزاق نے بتایا تھا۔ بزرگوں نے ایک ٹولی بیگ کی۔ افطار لالہ ہردیال کے یہاں سے اٹھایا اور یہاں آن پہنچے۔ اس دن وہ مسجد نہیں گئے، وہیں چٹائی بچھائی اور نماز ادا کی۔ میاں نور محمد نے، جن کی داڑھی بھی تھی اور عمر دراز تھے، امامت کی۔

رمضان کا ایک اور دن تمام ہوا۔

ذکیہ مشہدی

لپاگو

"اماں، آج جمعہ ہے نا، آج مرغا؟" بھیا سے میں منہ ٹھونس کے چلاتی۔

آموں کا موسم تو کب کا جا چکا، ہمیشہ کی طرح۔ دودھیا، مالدہ، لنگڑا، گلاب خاص، سفیدہ، بمبئی، سب دھیرے دھیرے اٹھ گئے۔ برسات شباب پر آئی ہمیشہ کی طرح۔ پھر جاڑے کی آمد ہوئی۔ وہ بھی ہمیشہ کی طرح۔ کتنے موسم آئے، کتنے موسم گئے۔ سب یاد رکھنے کا کیا فائدہ ہے؟ دن ٹپ ٹپ گرتے رہے، مولوی جی کے باغ میں پکے آموں کی طرح زمین پر بچھ بچھ گئے۔ ڈالی والے منقوب کی طرح مٹی میں رل گئے — اتنے سارے دن۔

جمعہ آتا تھا، جمعہ جاتا تھا۔ اماں بھیا کے لیے کلف لگا چکن کا کھڑا کرتا، علی گڑھی پاجامہ نکال کر بستر پر رکھتیں۔ بھیا انکھیوں سے دیکھ کر مسکراتا۔ "آج پھر مصیبت ہے!" اماں بھڑک اٹھتیں۔ "کمبخت ہفتے میں ایک دن تو مسجد جا کر نماز پڑھتا ہے اور اسے بھی مصیبت کہتا ہے۔"

"جمعہ ہفتے میں کتنی بار آتا ہے اماں؟" بھیا انتہائی معصومیت سے سوال کرتا۔ تب کی اماں کس قدر ناراض ہو جاتی تھیں کہ ان کی بولی نہ نکلتی۔ بس گھور کے دیکھتیں اور منہ پھیر لیتیں۔ اور تب تنویر فاطمہ عرف تنو سوچا کرتی تھی کہ جمعہ جلدی کیسے آ سکتا ہے؟ وہ تو اپنے وقت پر ہی آتا ہے، ہفتے میں ایک بار، اور اپنے وقت پر ہی آتا رہے گا۔ مگر تنو اب ایسا نہیں سوچتی۔ وہ تو سوچنے لگی ہے کہ جمعہ ہی نہیں، ہفتے کے سارے دن بہت جلدی آ جاتے ہیں۔ لو، ابھی تو آیا تھا اور ابھی پھر آ گیا۔ دن ہیں کہ ساون کی تتری کی طرح اڑے جا رہے ہیں، برس برس کے گٹھے جا رہے ہیں اور بہے جا رہے ہیں

نہ جانے کتنا کچھ۔

'یوسف حسین خاں کا' تذکرہ میں ... ہو چکا ... یہ تھا ... ان کے قوالی ... تھے۔ 'جمیل جالبی' صاحب بڑی زور سے ڈپٹنے والے مدارس میں ... تھے ... قوالی ... سے اقبال دان سے خوب ... نیاز احمد عرف ننھّے ان میں سب سے ... تھے۔ ... صاحب علم تھے لیکن زیادہ تر اردو، ہندی کی ادبی کتابیں اٹھا اٹھا کے پڑھتے رہتے۔ ایک ... نے پریکٹیکل میں گلہری کاٹنے کو دی تو کلاس چھوڑ کے بھاگ آئے۔ پھر ... نہیں گئے۔

"یہ حضرت وطن کی گز بات، 'اماں گلہری کے بارے میں یہ بری تھیں۔' ... پر پیار سے ہاتھ پھیرا تھا اس لیے اس کی پیٹھ پر نشان بن گئے۔"

"اماں، ہندوؤں کے یہاں مشہور ہے کہ گلہری کی پیٹھ پر سیتا جی نے ہاتھ پھیرا تھا۔ بھیا اور بولے بغیر مان جائے!

"ارے تو دونوں نے پھیرا ہوگا۔" اچھن جھٹ سے سمجھوتا کر لیتے۔ ویسے بھی اچھن کو بہت سی باتیں معلوم تھیں۔ مثلاً یہ کہ آم اگر کترا ہوا ہے تو وہ طوطے سے کترا ہے یا کوّے سے۔ ایک بار ... نے بڑے سے قلمی آم میں منہ مارا اور اچھن کے سامنے پیش کر کے پوچھا:

"اچھن بتاؤ یہ کس نے کترا ہے۔ طوطے نے یا کوّے نے؟"

اچھن نے آم کا بغور معائنہ کیا۔ سونگھ کر دیکھا۔ ... دیر تک سوچتے رہے پھر بہت سنجیدگی سے بولے، 'قد آور گلہری نے کترا ہے۔' اچھن کی دن سے ... رہ جانے۔

اچھن گر وہاں تو بچ گئے لیکن لوگوں نے انھیں چڑانا نہیں چھوڑا۔

اچھن کے دو بچھن، بلیا کے دو کان
اچھن گئے باجار، پکڑ لائے شیطان

کئی اور باتوں کی طرح اچھن کو چڑانے کی ابتدا کا بھی پتا ... جانتے تھے ... تعلق تھا۔ وہ کوئی برس ڈیڑھ برس بعد گاؤں گیا تھا۔ وہاں سے لوٹا تو اچھن کو چڑانے ... ایک بہت ... نہایت فحش، غلیظ اور ذلت آمیز۔ دراصل جو دور ... بہت تھا اس میں اچھن یار نہیں

بدطینتی میں مہارت حاصل کرنے گئے تھے۔ اماں اور دادی کے ڈر سے لوگوں نے اسے تبدیل کر دیا تھا لیکن دیکھیے، جب کوئی بڑا پاس نہ ہوتا تو یہ اپنی اصلی شکل میں دہرایا جاتا تھا۔ انجمن جا میں تو جا میں جہاں اجڑے کوئی لیکن پتا عموماً پا گو ہی تھا۔ ایک تو یہ کہ سارے فساد کی جڑ وہی تھا، اوپر سے کمزور بھی کہ گھر کا مدار رہتی (پٹ جائے تو کوئی پرسانِ حال نہ ملے) اور سونے پہ سہاگہ یہ کہ سنج کلام اس نے اصل صورت میں لوگوں کو سکھایا تھا۔ یوں دیکھا جائے تو بازار میں بھی شیطان کے ہاتھوں بِک جانے کی بات کچھ کم اہانت انگیز نہ تھی۔

ابھی انجمن کا ای میل آیا تھا امریکہ سے۔ ہوائی جہازوں میں اڑے اڑے پھرتے ہیں۔ ذیابیطس کے مریض پہلے ہی تھے، اب دل کا عارضہ بھی ہو گیا۔ لڑکی نے ایک نیگرو سے شادی کر لی ہے۔ کمبخت کو غیر مذہب، غیر ملک، غیر ذات میں ہی شادی کرنی تھی تو کم از کم کسی گوری چمڑی والے سے تو کرتی!

’’اب بیٹے کی شادی جلد کر ڈالو، اس سے قبل کہ وہ بھی کوئی کالی چپلی گئی لے آئے۔‘‘ تنویر فاطمہ عرف تنو نے بوس کے پیر احمد عرف انجمن کو جوابی ای میل کیا۔

اس بار انجمن میاں کا فون آیا (کہ ای میل میں کوئی دہاڑیں مار کے رو نہیں سکتا) انھوں نے بات بعد میں کی، پہلے دہاڑیں مار کے روئے۔ ’’آپا، ہم ہجرتوں کے نوحہ خواں، کون کون سی خبر نہ دے کر آپ کے دکھوں میں اضافہ کریں۔ بیٹا تو نہ جانے کب سے ایک لڑکی کے ساتھ یوں ہی رہ رہا ہے۔ لاکھ کہتا ہوں، اچھا چلو یہی سہی، شادی تو کر لو۔ جواب دیتا ہے، بہت شادیاں کر چکے آپ لوگ... اب اس دقیانوسی انسٹیٹیوشن کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔‘‘‘

تو سننے میں آگئی... گناہ و ثواب، اچھے برے کے معیار بھی کتنے بدلتے جا رہے ہیں۔ کچھ دیر اس کی سمجھ میں نہ آیا کیا کہے۔ پھر اس نے خود کو سنبھالا۔ ’’آپ کے بیٹے رنج کرنا چھوڑ دو انجمن۔ آخر اس نے شادی کی ہے نا۔ بیٹی ذات ... اگر وہ بھی شادی کے انسٹیٹیوشن کی قائل نہ ہوتی تو؟ اور جب انجمن، انسان تو سب انسان ہی ہیں۔‘‘ پھر اس خوف سے کہ کہیں اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن اسے خود دہاڑیں مار کر رونے پر مجبور نہ کر دے، اس نے یکلخت فون بند کر دیا۔

یہ چپ تنویر پر کئی دن طاری رہی۔ خود اس کا بڑا امتیاز زیادہ سرسبز چراگاہوں کی تلاش میں اپنے

Scanned with CamScanner

مال بچوں کو دے کر دیتا تھا۔ لاکھوں میں کھیل رہا تھا لیکن اس کے باپ مکان بنوانے میں مقروض ہو گئے تھے، اس نے کبھی چار پیسوں کو نہ پوچھا۔ تو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتی تھی کہ چلو وہ تو خوش ہے۔ لیکن بیٹی جو ایم ایس سی ڈیمو کر کے بمبئی جیسے جنگل میں نوکری کر رہی تھی۔ گھر کی آدھی ذمہ داری ساری جیسا محاورہ اس کی سمجھ سے کوسوں دور تھا۔ جو بھی رشتہ آتا اس میں عیب نکال کر اسے رد کر دیتی۔ کہیں یہ نہ ہو کہ شادی کا انسٹیٹیوشن اس کی بھی سمجھ سے پرے ہو جائے۔ سو کا دل بیٹھنے سا لگتا۔

اس سے چھوٹا سلمان ہر دوسرے تیسرے مہینے کسی نہ کسی امتحان میں بیٹھتا تھا یا انٹرویو دیتا تھا۔ ہزاروں روپے فارم بھرنے، فیس دینے اور سفر کے اخراجات پر خرچ ہوتے رہتے تھے۔ نتیجہ ابھی تک ڈھاک کے تین پات تھا۔ معمولی نوکری ملنے کا امکان تھا لیکن وہ اسے خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ چھوٹے موٹے بزنس کا تو خیال ہی اہانت انگیز تھا۔ وہ اپنی ساری ناکامیوں کا ذمے دار والدین کو ٹھہراتا تھا۔ "ابا اگر مکان نہ بناتے، وہی روپیہ خرچ کر کے کہیں مجھے ملازمت دلا دیتے تو آج میری حالت یہ نہ ہوتی۔" اس نے کئی بار کہا تھا۔ ابا کچھ دن ہوئے کہ تمام الزامات سے اوپر اٹھ چکے تھے۔ جب تک جیے، اپنی ساری نامرادیوں اور بچوں کی نافرمانیوں کا ذمے دار تقدیر کو ٹھہراتے رہے۔ تقدیر پر کوئی ردعمل نہ ہوتا۔ وہ بھری بھری سی رہتی تو وہ اپنا سب سے نوکیلا حربہ آزماتے جو سیدھا دل میں اتر کر ایک چھید بناتا۔ "اور یہ لڑکی رابعہ یہ بے شرم۔ اس نے تو حد ہی کر رکھی ہے۔ ایم ایس سی میں پڑھانے کی نوکری مل رہی تھی وہ نہیں کی، چل دی بمبئی۔ اکیلی رہتی ہے اور منہ کھول کر اپنی شادی کی باتیں کرتی ہے۔ ننھیال پر گئی ہے ننھیال پر۔"

فقیر ایسے وقت میں آتا کہ گھر میں لڑکے بالے یا پھر کوئی نہ ہوتا تو دادی یا اماں خود دروازے تک آتیں۔ پیالے میں آٹا رکھ کر کنڈی کھڑکاتیں اور جھپ سے واپس ہو جاتیں۔ فقیر ہاتھ بڑھا کر اندر سے آٹا لے لیتا۔ وہ جھولی میں آٹا ڈال کے دروازہ اچھی طرح بند کرتا اور واپس کنڈی کھڑکا کے چلا جاتا۔ محلے کے فقیر اس معمول کے عادی تھے۔ ان کے اور گھر کی بزرگ خواتین کے درمیان کنڈی کا پردہ ہمیشہ پڑا رہا۔ ان کا آنچل کبھی کسی نے نہیں دیکھا، نہ ان کی آواز سنی۔ اماں اور دادی کے درمیان کوئی 'جنریشن گیپ' نہیں تھا۔ دادی کو حضرت رابعہ بصری سے سخت عقیدت تھی۔ اماں نے ساس کی عقیدت کا خیال رکھتے ہوئے اپنی بچی کا نام رابعہ رکھا تھا، جو خود اسی کو سخت ناپسند تھا۔

Scanned with CamScanner

ان نیک بیبیوں کو دنیا کی خبر بھی نہ ہوئی۔

چند سال پہلے تو حد ہو گئی تھی۔ پھر بھی چند دادی اب پلنگ پر پڑی رہتی تھیں۔ ہاں ہاتھ پاؤں چلتے تھے لیکن بینائی برے نام رہ گئی تھی۔ صحن والی بیچ کا آموں کا باغ کٹ گیا تھا۔ وہاں چمڑا بنانے کا کارخانہ لگ گیا تھا۔ گرمیوں میں امریاں بور آتیں تو بھینی بھینی خوشبو ہر طرف بکھری پھرتی — اب چمڑا مہکتا تھا۔ کئی فرلانگ دور تک اس کی بو محسوس کی جا سکتی تھی۔ دادی بڑی نفاست پسند تھیں۔ دادا کے انتقال کے بعد بھی سفید کپڑوں پر ہلکا سا عطر ضرور لگاتیں۔ ان کانوں میں بیلے کی کلیاں چاندی کی بالیوں میں پرو کر پہنتیں۔ اچھا ہے، دادی کے سارے حواس جاتے رہے، خوشبو و بو کا بھی کوئی احساس نہیں۔ زندگی لئے گویا، آموں اور چمن پر بنائے گئے بت کی مانند بالکل چپ چاپ صورت ہو گئی ہے۔ درخت کٹوا کے۔ دل ہر وقت ڈوبتا سا رہتا۔ کسی روبوٹ کی طرح کیلی تو سارے گھر میں گھومتی پھرتی تھی۔

ماں اور دادی سے یہ تو کوئی آخری ملاقات تھی۔ دونوں آگے پیچھے اپنی نیک بیبیوں کا جھرمٹ میں آخرت پدھار گئیں۔ ماں اگر دادی کی طرح رہ پاتیں تو کچھ اور بہت دن جی سکتی تھیں۔

جب وہ بس لوٹ رہی تھی تو سٹیشن پر اندھیرا تھا۔ بجلی چلی گئی تھی اور آسمان پر بادل گھرے ہوئے تھے۔ وہ بھی برسات کا ہی موسم تھا۔ سلمان کو اس نے باپ سے دھکا دے کے بھیجا تھا کہ جا کے تو کولے آئے۔ وہ نہایت خراب موڈ میں تھا۔ جینز کی جیب میں ہاتھ ڈالے، جوتے کی نوک سے خیالی کنکروں کو ٹھوکریں لگا رہا تھا۔ بارش کے اندیشے سے تو یہ گھنے سایہ دار درخت کے نیچے آ گئی۔ یکایک ٹپ سے وہ کچھ گرا، جو پانی نہیں تھا۔ پھر کچھ دیر بعد ٹپ سے کچھ اور۔ ٹپ ٹپ جاری رہی۔ تو ذرا سا ہلی تو چپل کے نیچے کچھ سے کچھ آیا۔

"کاہے کا درخت ہے سلمان؟ اندھیرے میں پتہ نہیں چل رہا۔"

"اور جیسے میں تو روشنی میں کھڑا ہوں!" وہ چہرے سے بدمزاجی ظاہر ہو، "مولسری کا درخت ہے، پھل گر رہے ہوں گے۔"

"پھل یا پھول؟"

"پتا نہیں۔" اس نے بیزاری سے جواب دیا۔ پھر مزید جھنجھلایا "بال کی کھال نکالنے لگتی ہیں۔"

Scanned with CamScanner

"اب سب ایک دوسرے سے بچھڑ کر یوں رہ رہے ہیں؟" پاگو نے اداسی سے سوچا۔ بچپن سے یاد آیا کہ وہ مہوے کے درخت کے نیچے مہوا چنا کرتا تھا — ٹپ ٹپ ٹپ۔ سنہرے رس بھرے انگوروں جیسے پھول۔ خوب میں پھل بجتی تھی۔ ماں گوار حد تک تیز میٹھی خوشبو والے، سوکھیں تو جیسے کشمش۔ پاگو نے بتایا تھا۔ اس کی دادی خشک مہوے وریوں کے موٹے پتے آٹے سے بڑی مزیدار روٹی پکاتی تھی۔ موسری نے ایک اور پھل ٹپکایا — ٹپ۔

ٹیپ سے ٹپاک سے کپ رکا ہے پھوڑے رے
جنگر ایسا ڈینگر ایسا رت کا ہے ڈولے رے

"تومنی، بوجھیے تو جانیں" پاگو نے پہیلی بجھائی۔

"جانے کیا کیا بکواس کرتا رہتا ہے،" اچھن نے منہ چڑایا۔

"بکواس نہیں، اچھن بھی، بوجھیے نا۔ پہیلی ہے۔"

"ارے یہ کیسی پہیلی؟ تیری اٹی کھوپڑی جیسی۔"

"اچھا کہیے، ہاری۔"

تومنی نا پر تجسس حاوی ہو گیا۔ ایک بار میں ہی ہار بول دی۔

"دیکھیے تومنی، ایک تھا مہوے کا پیڑ۔" اچھن نے گردن ٹیڑھی کی۔ پاگو نے ٹیڑھی گردن کو یکسر نظرانداز کر دیا، وہ یوں گویا ہوا۔ "ایک تھا مہوے کا پیڑ۔ اس کے نیچے رات کو ایک سانپ آن کے بیٹھ گیا۔ اچھن کا ڈسنے کا سانپ شوں شوں" پاگو نے آواز نکالی اور ہاتھ سے سانپ کا پھن بنایا۔ "مہوے کا پیڑ بھلا کاہے کو ڈرے۔ اس نے تاک تاک کے سانپ کے پھن پر اپنے منہ سے رسیلے پھول ٹپکائے ٹپ ٹپاک ٹپ۔ سانپ جھنجھلا کے بولا:

ٹیپ سے ٹپاک سے کپ رکا ہے پھوڑے رے؟

پیڑ کاہے کو چوکتا! جھٹ سے جواب دیا:

جنگر ایسا ڈینگر ایسا رات کا ہے ڈولے رے'

پاگو نے ہاتھ سانپ کی طرح بنا کے پھر لہرایا۔ "بغیر ہڈی والا جیو، سل سل کرتا سانپ، ارے تو آدھی رات کو ڈولتا ڈولتا بھلا میرے نیچے آیا ہی کیوں؟ اب تیرا سر پھوڑوں کہ نہ پھوڑوں؟ اب کیسے اچھن

جیسے کہ سانپ کا ایسا دوٹوک جواب کسی نے کاہے کو دیا ہوگا۔ وہ کھسیا کے وہاں سے بھاگ گیا۔''

سانپ کے کھسیانے کی بات نے سب کو خوب ہی تو محظوظ کیا۔ پپو کی آنکھیں خوشی سے چمک گئیں۔ ایک تو اس کی پہیلی کوئی بوجھ نہ پایا؛ اس پر سے پہیلی میں پوشیدہ کہانی سب کو خوب ہی تو بھائی۔ وہ کہانی دہرا دہرا کے گھر کی بزرگ خواتین کو خوب ہی تو عاجز کیا کرتا۔ لڑکے دن چڑاتیں اور اماں نصیحت کرتیں کہ رات میں نام مت لیا کرو، ماموں کہہ دیا کرو، لیکن کوئی کاہے کو سنتا۔ سب ایک دوسرے کے سر پر ٹیپ مارتے اور کہتے: ''ہینگر ایسا ڈینگر ایسا رات کا ہے ڈولے رے۔''

کچھ عرصے بعد جمیل بھائی اپنے لانبے قد اور دبلے پتلے جسم کی وجہ سے مستقل طور پر ہینگر ڈینگر کہلانے لگے۔

ہینگر ڈینگر جمیل دلّی کے کسی آرکیٹیکٹ سے ایک دوست کے مکان کا نقشہ بنوانے کو جاتے ہوئے ہارٹ کے دورے میں جاں بحق ہوئے۔ بس مہینے بھر پہلے بڑی اچھی ملازمت ملی تھی۔

کبیرا گرب نہ کیجیے، کال گہے کر کیس
کیا جانے کت ماریے، کیا گھر کیا پردیس

ارے میاں کبیر، کبھی تو کوئی دل خوش کن بات کر لیجیے! اب دیکھو نا، یہ لگتا ہے جیسے ایک مہیب صورت، سیاہ فام، دیوقامت انسان لوگوں کے بال پکڑے گھسیٹتا لیے چلا جا رہا ہے۔ لوگ گھس گھسا کے چیونٹی جیسے ہو جاتے ہیں۔ وہ انھیں ایک بڑے سے ٹوٹے پھوٹے بدرنگ پیالے میں ڈالتا ہے، پھر مٹھی بھر کے منھ میں — کڑکڑ کڑاک! کھلک چبینا کال کا تو روندھی ہو گئی تھی۔ ڈر کے مارے اس نے آنکھوں پر ہتھیلیاں رکھ لی تھیں۔ تب جمیل بھائی نے نظیر اکبرآبادی کی نظم 'ریچھ کا بچہ' سنا کر اسے ہنسایا تھا۔ وہ منھ سے بڑی عمدہ ڈگڈگی بجایا کرتے تھے۔ ان کی ڈگڈگی کی تان پر پپو ریچھ کا بچہ بن کر ناچی تھی اور تو کی ساری کلفت دور ہو گئی تھی۔ ہنسی اب اتنی جلدی کیوں نہیں آتی؟ رونے اور ہنسنے کے درمیان فاصلے اتنے بڑھ کیوں گئے ہیں؟ قہقہے کہاں گم ہو گئے؟

بھاری دل کے ساتھ تو نے بیٹے کا کمرہ سرکایا۔ پوداکیوں سے بھرا ہوا تھا۔

تو نے ایک رسالے میں ایک پنجابی گیت کا ترجمہ پڑھا جس میں محبوب کے ہاتھوں کو کیلے کی پھلیوں سے تشبیہ دی گئی تھی۔ اپنی قابلیت بگھارنے کے لیے اس نے اسے اپنی 'لوک سبھا' میں دہرایا

Scanned with CamScanner

اور مطلب بیان کیے۔ پاگو نے اس حسین تشبیہ کا تیا پانچہ کر کے رکھ دیا۔ دست نچوڑ کر بولے "جب مرغی کی جگہ پیسے کی تھیلیاں ہوں اور جو کہیں گن مل جائے چیل نے کھائے کو؟ یا بڑی چیونٹی وہ پڑے، وہ بھی تتو کی طرح۔" ایسے چیونٹی ہیں کہ کتے سے کھائے نہ دن شرمندہ جاتے۔ تو بھیا، ذات تو کچھ کر کے باہر نکلیں ہیں تب باہر بھی نہیں، سیدھے پیٹ کے اندر۔ اور سمجھے ایسے جیسے، ابھی پیدا ہوئے ہوں۔"

کمبخت، اوندھی کھوپڑی جو بات کرے گا سو الٹی' مارے غصے کے تتو روٹھی ہوئی۔ گرچہ رائحین کو اس تشبیہ کی درگت، جو دراصل تتو کی درگت تھی، بہت پسند آئی تھی لیکن وہ اس بات سے بھی خاصے خوش ہوئے کہ گوپال کی کھوپڑی اوندھی ہے۔ اس لیے رائحین نے گوپال کو، جو اس وقت تک لیڈو کے درجے پر فائز نہیں ہوئے تھے، الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ اچھی تو جب سے سیٹھ اور چپ سے بھی اٹھلائے اور نفیس حمد عرف ھیا کا فیصلہ آخری مانا گیا۔ اس طرح گوپال بن گئے پاگو اور تتو ان سب میں سے زیادہ ہنسی۔ بقول دادی 'ڈھینگ کی ڈھینگ' اور تتو بھیا 'لمڈھینگ' اور جتو میل بھائی 'منڈا' اس سانس بھر اچھلی تو یقیناً یہ سب تھی ہوئی بلکہ ان سب کا مترادف۔

"کیا واقعی میں کبھی اس طرح ہنس سکتی تھی؟ دل کے اندر کی گہرائیوں سے؟ وہ بھی ایسی فضول باتوں پر؟" تتو نے گملے کو پرلی طرف رکھا اور مرچوں بھرا سوپ اٹھایا۔ آج دن بھر دھوپ نکلی تھی برسات کی صاف ستھری چمک دھوپ۔ جی چاہے، مرتبان میں بھر کے رکھ لو کہ جھری لگے تب نکال کام آئے۔ ساری مرچیں سکی جا رہی تھیں۔ وہ سچ مچ ہنس پڑی۔ پھر شرمندہ ہو گئی۔ نہیں کوئی اسے یوں اکیلے میں ہنستے تو نہیں دیکھ رہا کہیں کوئی مرتبان میں دھوپ بھرنے کا حق تو نہیں پڑھ لے رہا۔ کیا ہی اچھا ہے کہ سائنس نے ایسا کوئی آلہ ایجاد نہیں کیا جس سے دماغوں کے خیالات پڑھے جا سکیں۔

وہاں کوئی نہیں تھا، علاوہ اس بلی کے جو دیر سے منڈیر پر ساکت بیٹھی ایک چڑے پر گھات لگا رہی تھی۔ نیچائی سے تتو کو اس کے صرف دو کان نظر آ رہے تھے، نوکیلے، دو تکونوں کی طرح۔ یکلخت وہ دھپ سے کودی۔ ایک موٹا چوہا جان بچا کے بھاگا۔ تتو نے جھٹ پیچھے پاس رکھی ادھ چپل اٹھایا:

"بل بل بل، ہش ہش"

پاکو نے بتایا تھا کہ اس کے پڑوس میں ایک مولوی صاحب رہا کرتے تھے۔ ایک دن مولویانی نماز پڑھ رہی تھی کہ بلی آ گئی۔ دودھ کی پتیلی منھ میں ڈالنے ہی والی تھی کہ مولویانی زور سے بولیں: ''الحمد للہ رب ' اور سورۂ فاتحہ کا باقی حصہ حسبِ دستور زیرِ لب پڑھا۔ بلی بھاگ نکلی، قصہ رد ہو گیا۔

''ارے کمبخت پاکو، بچوں کو یہ کیا سکھا دیا ہے۔ بے ادبی کرتے پھرتے ہیں۔ جہاں بلی دیکھی 'الحمد للہ رب ' کا ورد شروع۔'' ''خیر سے آپ پاس میاں تمھیں بھی تنگ کرو۔'' یہ مت کہیو اللہ مار مشتو' بی بی بھتیجو سیکھنے میں اتنے دن لگا دیے اور بلی بل جھپٹ سے ازبر۔''

جمیل بھائی نے دادی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ ''دادی، یہ قصہ تو پاکو سے پہلے اس مولوی لطیفے باز نے سنایا تھا۔ لیا گو نے تو محض اس میں یہ پھندنا ٹانکا ہے کہ مولویانی اس کے پڑوس میں رہا کرتی تھیں۔ پتا نہیں ہر بات میں مذہب کہاں سے در آتا ہے۔ کہہ گئے نا داس کبیر کہ 'ہندو مدھا ترکو کانا'۔'' انھوں نے ایک آنکھ دبائی اور دیر تک کانے بنے رہے۔

جمیل بھائی کی خبر سن کے پاکو کچھ دیر گم سم بت بنا بیٹھا رہا تھا۔ وہ کوئی پانچ چھ برس بعد ادھر آیا تھا۔ ابا نے اسے رو دھو کے پہلے کسی کارپوریشن میں نوکری دلوا دی تھی۔ اس کا بجٹ بیٹھ گیا۔ ملازمین کو مہینوں تنخواہ نہیں ملی تو پاکو واپس گاؤں چلا گیا۔ تب سے وہ بس یوں ہی کبھی کبھار جھگڑ ڈنگر سا آن ٹپکتا تھا، اور اس بار تو خیر بہت دن لگا دیے تھے۔

''تو منی'' (وہ سب چارپائیوں پر اکٹھے ہوئے تھے۔) ''ہم ہر گھٹنا پر یہی سوچتے ہیں کہ اس سے بھی برا ہو سکتا تھا۔ تب ہمیں تسلی مل جاتی ہے۔ اب دیکھیے نا، ہماری لگی لگائی نوکری چلی گئی۔ اگر ہاتھ پیر چلے جاتے تو ہماری لگائی کا کیا ہوتا؟ چار چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ کھیت مجوری کر کے سب کو پال پوس کے دونوں لڑکے نکل گئے۔ ایک کلکتے میں ہے، ایک پٹنے میں۔ دو لڑکیاں تھیں۔ بیاہ کے اپنے اپنے گھر۔''

دھیا جنوائی لے گئے، بہویں لے گئیں پوت
داس کبیرا یوں کہیں، تو رہا اوت کا اوت

یہ جمیل بھیا بولتے تھے۔'' اس نے صدی سے کہا۔

''گوپال جمیل بھائی کے ساتھ اس سے برا کیا ہو سکتا تھا؟'' تو نے اور منڈی بڑھی کو پی کر کہا۔

Scanned with CamScanner

تحصیل بھیا کا بیاہ نہیں ہوا تھا۔ گر بیاہ ہو گیا ہوتا تو دلہن تو عمر بھر رہتی نا۔ ابھی ایک اولاد ماں بچہ رہتا۔ کون اگورتا، جتا ہے تو؟'' یہ گوتم نے یاد رکھ کر سوال کیا تھا کہ کسی نے کھوٹی نہ کی تو، گور نہیں کرتا لیا گوتمے، تم نے بھی بات جاری رکھی تھی،'' اور تو تمنی، جو تحصیل بھیا مرتے نہیں یہیں اپنی ہوتی ہے پڑجاتے جیسے نسیم چچا کا بیٹا۔''

تمنا کانپ گئی تھی۔

''لڑکے بالے ٹھیک ہیں نا؟'' اس نے اپنا دھیان بٹانے کو پوچھ لیا تھا۔

''ٹھیک ہی ہوں گے۔'' اس کی آواز میں تاسف کی آہٹ تھی لیکن اس نے جلدی خود پر قابو پالیا تھا۔

''دو جون کی سوکھی روٹی کا بیر ہوتا ہے۔ لنکائی کا دماغ چل گیا ہے۔ پہلے بھی ذرا کمزور تھا۔ جو ذات کما کے دیتے ہیں جو ہی ٹھوکر بھی پڑتا ہے۔ مگر ہم سوچتے ہیں تمنی، کہ جیسی بھی ہے، ساتھ تو ہے۔ نہیں تو جھونپڑی میں الو بولتا۔ جب کام نہیں ملتا تو اس کی سیوا کر کے وقت کاٹ لیتے ہیں۔''

تمنا نے دیکھا، گوپال کی قمیص کئی جگہ سے کھنچی ہوئی تھی۔ اس کے پیر میں چپل نہیں تھے۔ جب وہ ان لوگوں کے ساتھ تھا، اس کا حلیہ کہیں بہتر ہوا کرتا تھا۔ صحت بھی اچھی تھی۔ اب وہ بالکل مفلس ہو لگ رہا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں اس کی صورت چوہے جیسی ہو جائے گی اور وہ بس تنچے ہوئے جیسے المونیم کے پیالے میں جا پڑے گا۔ تمنا نے یوں ہی سوچا کہ وہ بھی تحصیل بھائی جیسی بن گئی ہے۔

''ہونی کسی کے ٹالے نہیں ٹلتی تمنی، ورنہ اسے کوئی نہیں روک سکا۔ باقی رہا یہ سنسار، یہ اپنی چال چلتا رہتا ہے۔'' کم عقل والے گوپال نے مسرور لہجے میں کہا۔ پھر وہ قہقہہ لگا کر کھلے دل کے ساتھ ہنسا۔ بھیا نے جھلا کے کہا، ''ابے، اب کیا ہوا؟''

''ہم سوچ رہے تھے بھیا، کہ آپ جس تخت پر بیٹھے ہیں یہ اگر سونے کا ہو جائے تو … بس ہمیں ہنسی آگئی۔''

''دماغ تیرا چل گیا ہے، تیری بیوی کا نہیں۔ بلاوجہ بیچاری کو بدنام کر رکھا ہے۔''

اس نے بھیا کی تشنیع کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

''دیکھیے تمنی … شام آئی!'' اس نے بچوں کی طرح خوش ہوتے کہا۔

اس منڈیر پر کانگنی اور پانی رکھا کرتی تھیں۔ ان کے اس لنگر خانے میں بہت سی چڑیاں آیا کرتی تھیں، لیکن تنو کو سب سے بھلی لگتی تھی سانولی سلونی شاما۔ دبلی پتلی، لمبی چمکیلی دم والی شاما۔

شاما تو یہاں بھی آتی ہے اور گوریاں بھی اور آس پاس کے درختوں پر فاختہ آواز لگاتی ہے: 'اے دوست تو' اور تمھاری چھت پر رکھے ان سوسو گملوں میں پھولوں سی پھول کھل جاتے ہیں، تو پھر تنو بی بی، تم دل گرفتہ اور اداس کیوں رہتی ہو؟ کیوں تم نے چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو گرد کی طرح دامن سے جھاڑ رکھا ہے؟

گوپال نے صرف ایک بات اداس ہو کر کہی تھی۔ "ہمیں اب کوئی بابا کو کیوں نہیں کہتا؟"

"ارے منوا، ٹی ے" "سڑک سے گزرتی بچیا دھوبن نے اپنے لڑکے کو زور سے ڈانٹا جو گٹھری سر پر رکھ کر ٹیڑھا میڑھا چل رہا تھا۔ پنجرے میں مٹھو نے نقل اتاری: "رے منوا، ٹی ے۔" تنو بے ساختہ ہنس پڑی ... ایسی ہنسی جو دل کے اندر پھوٹتی ہے، جس کے پیچھے جانے کا ڈر نہیں ہوتا۔

سڑک پر رام دھن کی گیا رنبھائی۔ بکری کے دو سیاہ مخملی بچے آڑے آڑے پھدکے۔ ریتیا کے پودوں میں سے شوخ کلیوں نے جھانک کر دیکھا۔ آسمان میں پھر بادل اٹھے، ہاتھی جیسے سیاہ اور روئی جیسے سفید۔ قدرت کا تحفہ، میناؤں کا ایک جھنڈ اتر آیا، طوطوں کی ڈار نے سبز رنگ بکھیرے۔ پڑوس کے ننھے پوتے نے پالنے میں 'غاؤں غاؤں' کی۔ اس کی خوبصورت کمسن ماں نے منڈیر سے جھانک کر کہا، "تنو چاچی، اچھی ہیں نا؟ کوئی ضرورت ہو تو بتائیے گا۔ اب کی آپ کے گل داؤدی ہمیشہ سے اچھے کھلیں گے۔ پودے خوب ہرے ہیں۔"

دنیا بہت حسین تھی اور ذہن کو منور کرنے کے لیے یادوں کے جگنو تھے اور فرد اپنی ذات میں انجمن تھا اور ہر کسی کی زندگی میں کہیں نہ کہیں کوئی گوپال تھا اور کوئی اچھن، کوئی بھیا، کوئی جمیل بھائی اور دادی جیسی غیر مشروط محبت کرنے والی کوئی ہستی، اور خوش رہنے کی کتنی ہی وجوہات تھیں حتیٰ اداس رہنے کے لیے — شرط صرف انھیں پلکوں سے چن لینے کی تھی۔

❋ ❋

Scanned with CamScanner

شمس الرحمٰن فاروقی کی کتابیں

لغات روزمرہ

(اردو میں زبان کے غیر معیاری استعمالات کی فہرست)

قیمت: 250 روپے

سوار اور دوسرے افسانے

(ہندوستانی ایڈیشن)

قیمت: 350 روپے

ساحری، شاہی، صاحب قرانی

(داستان امیر حمزہ کا مطالعہ)

جلد اوّل تا سوم

قیمت 1110 روپے

آسماں محراب

(شاعری)

۱۹۶۰ء سے ۱۹۹۶ء تک کے کلام کا انتخاب

قیمت 315 روپے

کئی چاند تھے سرِ آسماں

(ناول)

قیمت 600 روپے

تنقیدی افکار

(ہندوستانی ایڈیشن)

قیمت: 250 روپے

افسانے کی حمایت میں

(نظر ثانی اور اضافہ شدہ اشاعت)

قیمت: 240 روپے

The Colour of Black Flower

(Selected Poems)

قیمت: 250 روپے

Scanned with CamScanner

شاعری

ریت پہ بہتا پانی

قاسم یعقوب

قیمت 160 روپے

مٹی کی کان

افضال احمد سید

قیمت:500روپے

سویرے کا سیاہ دودھ

پال سیلان، ترجمہ: آفتاب حسین

قیمت 150 روپے

ای میل اور دوسری نظمیں

ذی شان ساحل

قیمت:150روپے

خودکشی کے موسم میں

زاہد امروز

قیمت 120 روپے

مٹی کا مضمون

فرخ یار

قیمت:150روپے

جنگ کے دنوں میں

ذی شان ساحل

قیمت:125روپے

نیم تاریک محبت

ذی شان ساحل

قیمت:100روپے

سنیل گنگوپادھیائے

ہندی سے ترجمہ: شائستہ فاخری

کیرتی ناشا کے دو کنارے

دوپہر تک آندھی پانی کا کوئی گمان بھی نہیں تھا۔ دور نیلے آسمان میں سیاہ نقطے جیسی چیل منڈلا رہی تھی اور دکھن کی طرف اڑتے بگلوں کا جھنڈ۔ بیساکھ کا مہینہ اپنے اختتام پر تھا۔ آخری دو دن بچے تھے لیکن گرمی کی تپش اس وقت بھی کم نہیں ہوئی تھی۔

آگے پیچھے بیٹھے ہوئے چھ پہریدار اور ایک بندوق بردار سپاہی کے ساتھ ترکی پور سے ایک پالکی روانہ ہوئی۔ اس وقت اس کی منزل نارائن پور تھی جہاں کی ساتھ پالکی میں نئی دلہن بیٹھی ہوئی تھی۔ پالکی کے دونوں طرف موٹے موٹے پردے پڑے تھے۔

انھوں نے آدھا راستہ بغیر کسی رکاوٹ کے پورا کیا۔ ویسے کوئی رکاوٹ آنے کی کوئی وجہ بھی نہیں تھی۔ ان دنوں بنگال میں ٹھگوں اور ڈاکوؤں کی وارداتیں عروج پر تھیں لیکن سات لٹھیت محافظ ساتھ تھے، اور ان میں سے ایک تو بندوق بردار تھا جسے دیکھ کر ٹھگوں اور ڈاکوؤں کی پالکی پر حملہ کرنے کی ہمت جواب دے دیتی۔

کہار دوڑتے دوڑتے چلتے ہیں، وہ اسی طرح چلنے کے عادی ہیں۔ پورا ایک پہر وہ اسی طرح راستہ طے کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے ساتھ چلتے پیادہ پہریدار اس طرح نہیں چل پاتے، وہ ہانپ جاتے ہیں اس لیے ان کو بیچ بیچ میں رک کر آرام کرنا پڑ رہا تھا۔

ادھر کوئی خاص آبادی نہیں تھی۔ تھوڑی دوری پر ایک ندی تھی۔ ایک گھنا جنگل تھا ...

Scanned with CamScanner

اندازہ لگتا تھا کہ کبھی یہاں بھی گھنی آبادی تھی۔ شاید کسی مہاماری (وبا) میں اجڑ گئی۔ ندی کے کنارے بسے ہوئے گاؤوں میں فرنگی سمندری لٹیرے آکر خوب تباہی مچاتے تھے۔ ان لوگوں یہاں کی بستی اجڑ جانے کی وجہ سے وہ جزیرے کی طرف چلے گئے تھے۔

کھلے میدان میں شاخ در شاخ پھیلے پیپل کا ایک تناور پیڑ تھا۔ اس کے بالکل قریب تاڑ کے تین پیڑ تھے۔ وہیں پر کہاروں نے پالکی اتاری۔ پھر اپنی کمر میں کسے ہوئے انگوچھے کھول کر پسینہ پونچھنے لگے۔ پھر قریب کے تالاب میں اپنے ہاتھ پاؤں دھوکر پانی پینے گئے۔

پالکی میں دو عورتیں تھیں۔ ایک اونچے خاندان کی باوقار جوان خاتون اور دوسری اس کی درمیانی عمر کی کنیز۔ وہ خاتون سفید لباس میں تھی۔ جسم پر ایک بھی زیور نہیں تھا۔ مانگ بھی سیندور سے خالی تھی۔ اس کا رنگ تپتے کندن جیسا تھا، اس لیے پیدا ہوتے ہی اس کا نام سورن مئی رکھا گیا تھا۔ وہ بے حد پردہ نشین تھی۔ اس کے لیے ایک کلش میں پینے کا پانی اور کچھ پھل وغیرہ لایا گیا۔ تمام وقت اس نے صرف پانی پیا۔ پھر کنیز کے باربار کہنے پر ایک مٹھائی کھائی۔

اچانک ہی بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑی۔ آسمان میں کب بادل گھر آئے کسی کو احساس ہی نہیں ہوا۔ جہاں تک نظریں دوڑتی تھیں، دور افق کے اس پار تک بادل ہی بادل چھائے تھے۔ اس کی گڑگڑاہٹ سے دل کانپ اٹھتا۔

جو بندوق بردار اس قافلے کا سربراہ تھا اس کا نام ولیو رام تھا۔ وہ کھڑا ہوکر سمت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔ یہ علاقہ نہ صرف سنسان تھا بلکہ یہاں پیڑ بھی کم تھے۔ کچھ دور پر مندر کا گنبد نظر آ رہا تھا۔ ولیو رام کو پتا تھا کہ وہ مندر بھی اب کھنڈر بن چکا ہے۔ ویسے اس کے پاس سے اگر نکل جایا جائے تو کچھ ہی دوری پر نال بھجری گاؤں جانے کا راستہ مل جائے گا، لیکن آسمان میں سیاہ بادل چھائے تھے۔ ایسے بادل چھانے پر گھنگھور بارش ہوتی ہے، ساتھ ہی بجلی بھی گرتی ہے۔ اس لیے ابھی تو پیڑ کے نیچے انتظار کرنا ہی بہتر ہوگا۔

کچھ دیر تک ہر طرف ایک عجیب سا سناٹا چھایا رہا۔ نہ بجلی کڑکی، نہ پتے ہلے۔ قدرت جیسے خاموش کھڑی تھی۔ پھر افق کے اس پار سے جیسے ایک ٹھنڈا جھونکا سا آیا اور تھوڑی ہی دیر میں ہوا کے ٹھنڈے جھونکے طوفان میں بدل گئے اور اس کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ کچھ دیر پہلے

کہیں ہوا کا نام و نشان بھی نہیں تھا اور اب اتنی تیز ہوا چل رہی تھی کہ کھڑے رہنا دوبھر ہو رہا تھا کہ کہیں ہوا اڑا کر نہ لے جائے۔ اب وہ طوفانی ہوا پیڑ کی موٹی موٹی شاخیں توڑنے لگی۔ اتنی تیز بارش تھی کہ مندر کا گنبد بھی اب صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ زوروں کی بجلی کڑک رہی تھی۔ تبھی پیپل کے پیڑ کی ایک بڑی سی شاخ چرمرا کر گر پڑی۔ فوراً پالکی کو کھلے آسمان کے نیچے رکھ دیا گیا۔ اس بیچ بڑی بڑی بوندوں کے ساتھ اولے بھی برسنے لگے اور اس کے ساتھ ہی کسی کی دردناک چیخ سنائی پڑی۔

پہلے اس زوردار بارش میں کوئی سمجھ نہیں پایا کہ یہ چیخ کہاں سے آئی۔ پھر اس بارش میں نظریں گڑا کر دو تین لوگ ایک ساتھ چلا پڑے۔ "بجلی گری ہے، بجلی گری ہے، ملک چند ختم ہو گیا۔" ملک چند نام کا پہریدار پانی سے سر چھپانے کے لیے ایک تاڑ کے پیڑ کے نیچے کھڑا تھا۔ اسی کے سر پر بجلی گری تھی۔ وہ زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کا مردہ جسم بری طرح جھلسا ہوا تھا۔ سب تھوڑی دوری بنائے اس کی لاش کو گھیرے کھڑے تھے جس سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔

بجلی کیسے گرتی ہے، یہ ابھی تک کسی کو ٹھیک سے معلوم نہیں تھا۔ کیا آسمان سے آگ کا گولا گرتا ہے؟ خیر ملک چند کی لاش کو اسی طرح چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ یہی اس کی قسمت میں تھا۔ قسمت سے بڑا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ لیکن اس وقت یہاں کھڑے رہنا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔ کھلا میدان ہو یا پیڑ کی چھاؤں، بجلی کہیں بھی کسی وقت گر سکتی ہے۔ ایسے موسم میں ہر بار کچھ لوگ بجلی گرنے کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی کہار اور پہریدار پالکی کو وہیں چھوڑ کر اپنی اپنی جان بچانے کے لیے بے تحاشا بھاگ اٹھے۔ ان میں ولبھ رام ہی ذمے دار شخص تھا اس لیے وہ نہیں بھاگا۔ اس نے ایک بھاگتے کہار کی گردن دبوچ کر کہا، "سور! رانی دیدی کو چھوڑ کر کہاں بھاگا جا رہا ہے؟ اس کے بعد تیری گردن صحیح سلامت رہے گی؟"

ولبھ رام اور اس کہار نے مل کر پالکی اٹھائی، پھر وہ دونوں اس کھنڈر نما مندر کی طرف لپکے۔ بندوق ولبھ رام کے پاس تھی لیکن اس کے کارتوس بارش میں بھیگ کر بیکار ہو گئے تھے۔ اس دھواں دھار بارش اور طوفان کو کاٹتے ہوئے مشکل سے پالکی کو لے کر دونوں اس ٹوٹے پھوٹے مندر کے اندر گئے۔ ان کی دیکھا دیکھی کچھ دوسرے کہاروں اور پہریداروں نے بھی اپنے پاؤں لوٹ کر اس مندر کے اندر پناہ لی۔

کبھی یہ ایک خواب ہوا کرتا تھا۔ اب اس کی حالت دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ قدرت نے نہیں بلکہ انسان کے ہاتھوں اس کی بربادی ہوئی ہوگی۔ مندر میں شاید کبھی موجود نہیں تھا۔ کہتے ہیں کہ کالا پہاڑ نام کے کسی ظالم سپہ سالار (سپہ سالار) نے اس علاقے کے بہت سارے مندروں کو مسمار کر دیا تھا۔ پالکی میں بیٹھی دونوں عورتوں میں ذرہ برابر بھی گھبراہٹ نہیں تھی۔ انہیں یقین تھا کہ ساتھ میں آئے ہوئے کہار اور پہریدار بھی اپنی ذمے داری نبھائیں گے، کیونکہ فرض نبھانے میں کوتاہی ان کی جان لینے کے لیے کافی ہے۔

کچھ ہی دیر میں طوفان تھم گیا۔ دھیرے دھیرے بارش رک گئی۔ اس کے بعد اس اندھیرے مندر میں سورج کی کرنوں کی روشنی آتے ہی سمجھ میں آ گیا کہ آسمان اب صاف ہو چکا ہے۔ اس بیچ سنکھ بجاتے ہوئے کہار اور پہریدار اپنی بنی جان کی ماں کی خاطر لوٹ آئے تھے۔ اب ولبھرم کے حکم پر وہ پالکی اٹھا کر باہر آ گئے۔ اتنی تیز بارش کے بعد ہوا میں خنکی آ گئی تھی۔ ایک ساتھ ان گنت چڑیاں چہچہا رہی تھیں، شاید مصیبت ٹلنے کی خوشی میں۔ اس خاص شوالے کے آس پاس اور کئی کمرے بنے تھے۔ ان کی حالت بھی ویسی ہی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ ان میں سے ایک کمرے کے سامنے پانچ چھ آدمی کھڑے تھے۔ شاید ان لوگوں نے بھی اس موسلا دھار بارش سے بچنے کے لیے یہاں پناہ لی تھی۔ ان میں سے ایک نے ولبھرم کی طرف دیکھ کر کہا ''کس طرف جائیے گا حضور؟ اف، کیسی مصیبت آئی تھی۔ باپ رے باپ''

اجنبی لوگوں سے اپنی منزل کا ذکر کرنا مناسب نہیں، اس لیے ولبھرم نے رعب دار آواز میں کہا، ''ہم پچھم کی طرف جائیں گے۔''

اس شخص نے کہا، ''ہم بھی تو ادھر ہی جائیں گے۔ چلیے، ایک ساتھ چلتے ہیں، راستہ اچھا نہیں ہے۔''

ولبھرم نے ان دیہاتیوں کو اپنے منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھا۔ سنجیدگی سے بولا، ''ہم راجہ کے سپاہی ہیں، ہمیں ساتھیوں کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اپنا راستہ ناپو۔''

قریب ہی پیڑ سے ایک گھوڑا بندھا تھا۔ اس کے پیٹ کے دونوں طرف دو صندوق لٹک رہے تھے۔ وہ آدمی ایک ہی چھلانگ میں اس گھوڑے پر چڑھ بیٹھا، پھر ادھر آ کر کہنے لگا، ''آپ ناراض کیوں ہوتے ہیں حضور؟ میں تو بھلے کے لیے کہہ رہا تھا۔ سب کے ساتھ چلنے سے اپنی طاقت بڑھتی

Scanned with CamScanner

[illegible] کی خوشی [illegible] کا دیا [illegible] میدان میں [illegible] ہوں۔"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نظر [illegible] تھیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] ہوئے کہا، [illegible]

جا رہے ہو؟ چلو، چلو، دن ڈھلنے کو آیا۔"

اس [illegible] نے کہا، "صبر [illegible] جناب۔ اتنی جلدی کس بات کی؟ [illegible]

[illegible] رشتے دار کے یہاں جا رہے ہیں کیا؟ [illegible]

ہوں گے۔ مجھے بڑی بھوک لگی ہے۔"

[illegible] نے کہا، "نہیں، ساتھ میں وہ سب [illegible] نہیں ہے۔ [illegible]

ہمیں دیر کروا رہا ہے۔"

اس [illegible] نے [illegible] آواز میں کہا، "بہت بھوک لگی ہے [illegible]۔"

[illegible] وہاں سے ایک ہاتھ [illegible]

[illegible] وہ آدمی دوبارہ [illegible] پڑا۔ "کیلا؟ ہمیں [illegible]

[illegible] بھی اس [illegible] گھیر کر کھڑے ہوئے تھے۔ ان کی طرف [illegible]

[illegible] دیکھو، اس پالکی میں کیا ہے؟"

[illegible] نے کہا، "اے بے ادب! ہوشیار!"

اس گھڑسوار نے دھیورام کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس میں سے دو پالکی کی طرف بڑھے۔ سب پالکی کے ساتھ آنے والے چھ بہادر دھاری پہریدار تن کر کھڑے ہو گئے۔

ہر گھوڑے کے دونوں طرف جو صندوق لٹک رہے تھے، دوسرے لٹیروں نے ان کو کھول کر خنجر، چاقو اور دو تلواریں نکالیں۔ ایک تلوار اس گھڑسوار نے ہاتھ میں لی۔ دھیورام کے پاس بندوق سے بھرے ہوئے بھی دو ایسے [illegible] سکا۔ کارتوس جیب کر کا خزانہ بن چکے تھے۔ ان حالات میں گھڑسوار ساتھی سے دھیورام قتل کر سکتا تھا، لیکن اس نے دیکھا، دو پہریدار نے چاروں طرف چیخ تاک کاٹ کر [illegible] کی کوشش کی، گھر اور بیٹے کو چھوڑ رہی تھی۔ تعجب کا [illegible] اس نے حملہ نے پالکی کے ساتھ سے ہوئے ان چھ دھاری پہریداروں سے کہا: "اے بغیر بندوق کے سپاہی سے تم ہو، اپنی بیویوں کو بیوہ نہیں کرنا چاہتے ہو تو سامنے سے ہٹ کر ایک کنارے کھڑے ہو جاؤ۔"

پہریداروں میں ایک شخص اس دھمکی سے نہیں ڈرا۔ وہ پالکی کی حفاظت کے لیے اکیلا وہیں تنا رہا۔ لٹیرے کے قریب آتے ہی اس نے اس لٹیرے کی جانگھ میں بھالے کی نوک چبھو دی۔ اس گھڑسوار نے اس کے نزدیک آ کر زوردار آواز میں کہا: "ارے تو کس ماں کا لال ہے، ذرا دیکھوں تو تیری گردن میں کتنی طاقت ہے۔" اس نے تلوار سے اس پہریدار کی گردن پر ایک وار کیا۔ اس نے جان سے مارا نہیں، صرف زخمی کر کے چھوڑ دیا۔ اب کوئی ان کو روکنے والا نہیں رہا۔ دو لٹیروں نے ایک ہی جھٹکے میں پالکی پر پڑے پردے ہٹا دیے۔ ان لوگوں کا اندازہ صحیح تھا۔ پالکی میں ان دو عورتوں کے علاوہ تحفوں کے گٹھروں میں عمدہ پکوان، مٹھائیاں، چادریں، دو تین دھوتیاں، پھل وغیرہ تھے۔ یہ دونوں کسی کے یہاں جا رہی تھیں۔ وہاں یہ ساری چیزیں دینے کا رواج تھا۔

لٹیرے ان تحفوں پر ٹوٹ پڑے۔ وہ لوگ گٹھروں کا ڈھکن کھول کھول بھوکوں کی طرح کھانے لگے۔ اس گھڑسوار نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے ہی کہا: "اب دیکھ ان کے پاس کتنے گہنے ہیں؟ دونوں عورتوں کو کھینچ کر باہر نکال۔"

اب دھیورام نے ہاتھ جوڑ کر کانپتی آواز میں کہا: "بھائی، سامان جو لینا ہو لے لو، مہربانی کر کے ہماری دلہن بیٹی کو ہاتھ مت لگاؤ۔ میں تمہارے پیر پڑتا ہوں۔ ان کی عزت پر ہاتھ مت ڈالو، یہی تمنا ہے میری۔"

اس گھڑ سوار نے [illegible] موڑ کر [illegible] میں بیٹھ [illegible] کر [illegible]

”نکال، نکال باہر اسے۔“

ایک نے [illegible] جیسے ہی سورن مکھی کا ہاتھ پکڑا، اس کی [illegible] دھاڑیں مار کر رونے لگی۔ ”اس کو مت پکڑیے، مت [illegible] ہمارے ساتھ [illegible] نہیں ہے۔“ اس لٹیرے نے اس کی آنسو بھری [illegible] سورن مکھی کا [illegible] نکالنے کے لیے [illegible] کو کس کر پکڑتے ہوئے کہا، ”چھوڑ، چھوڑ [illegible] ہے ایک [illegible] جسم پر ہاتھ لگاتا ہے۔“ [illegible] پیٹ میں [illegible] جھونک دیا۔ اس کے پیٹ سے خون کا فوارہ چھوٹ پڑا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔

دالیٹروں نے سورن مکھی کو پالکی سے باہر نکال کر اس گھڑ سوار کے سامنے کھڑا کر دیا۔ اس کی [illegible] نے گھونگھٹ میں [illegible] چھپا لیا تھا۔ ایک بھی لفظ اس کے منھ سے نہیں نکلا تھا۔ [illegible] رہی تھی۔ [illegible] گھڑ سوار نے کہا، ”ارے ذرا کوئی گھونگھٹ تو ہٹاؤ، اس کا چاند سا چہرہ تو دیکھوں [illegible]“

سورن مکھی [illegible] کھڑی رہی۔ اس کے چہرے پر پڑا گھونگھٹ ہٹ گیا۔

وہ گھڑ سوار آنکھیں پھاڑے اس کے بے مثال حسن کو دیکھتا رہا۔

پھر اس نے [illegible] جوشیلے انداز میں چلا کر کہا، ”یہ تو چاند سے بھی سندر ہے! آج صبح صبح بھگوان کو [illegible] کی کرپا ہے۔ ایسا انمول رتن مل جائے تو اور سب [illegible] ہے۔“

چنتا [illegible] ہاتھ جوڑ کر [illegible] ہماری [illegible] ہماری عزت [illegible] روتے روتے اس کی [illegible]

[illegible] جانے والے [illegible] بھگوان کو یاد کر رہے تھے

اس گھڑ سوار نے کہا، ”اے [illegible] اس بچی کو، اس عورت کو میرے گھوڑے کی پیٹھ پر [illegible] مجھے [illegible] کچھ نہیں چاہیے، باقی کا سارا مال آپس میں بانٹ لو۔“

سورن مکھی نے اس [illegible] میں چھٹپٹا [illegible] اس کی دونوں آنکھوں سے [illegible] تھے۔ [illegible] تھی۔ [illegible] تھے۔

[illegible] سے [illegible] ایک [illegible]

[illegible]

"چلو ایک بار چل کر دیکھ لیں۔"

[illegible]

بار چل کر دیکھ ہی لیتے ہیں۔"

[illegible]

بچیے ہماری رکشا کیجیے!"

[illegible]

Scanned with CamScanner

[illegible]

لٹیرے بغیر کچھ کہے بے تحاشا بھاگنے لگے۔

[illegible] کہیں کے ان کو اور [illegible]

[illegible] آپ دونوں کو اوپر والے [illegible] کی دولت خوب لٹے۔"

[illegible] آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں؟"

[illegible] اپنے زخم کی تکلیف کو برداشت کرتا ہوا ان دونوں کے پاس آیا [illegible] محل سے آ رہے ہیں۔ یہ خاتون راجہ چاندرائے کی بیٹی ہیں۔ [illegible] ان کی سسرال لے جا رہے تھے۔ [illegible] بہت [illegible] ان کا [illegible] رہا ہے۔ وہاں شامل ہو کر [illegible] جلد [illegible] ہے۔ [illegible] کچھ بھی [illegible] پتا۔"

[illegible] بکھری ہوئی ساڑی کو سمیٹ کر [illegible] اس سے ابھی تک [illegible] نہیں [illegible]

اس کی خاموش نگاہوں میں بہت سی باتیں تھیں، ان باتوں میں بہت حماقت اور بہت دانائی بھی تھی۔ جنگل کا راز چھپا تھا۔

عیسیٰ نے ایک بار سوچا کہ اگر وہ خود پوچھے کہ آپ بھی یہاں تو کوئی جواب نہیں ملے گی۔ اس نے کہا: "اب آپ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ پالکی میں آ کر بیٹھیے۔" اس بار بھی وہ بیٹھ گئی۔ پھر اس نے بہت مشکل سے سیدھے ہو کر پوچھا: "حضور، آپ لوگ کون ہیں؟ کیا ہمارے محسن کا تعارف حاصل ہو سکتا ہے؟"

داؤد نے کہا: "ہم کوئی خاص آدمی نہیں ہیں۔ یوں ہی راہ چلتے مسافر ہیں۔ جب تم لوگ راستہ بھٹک گئے تھے۔ مگر تم یہاں کیسے چلے آئے؟ دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ تم کسی پالکی پر سوار ہو۔"

اس عورت نے ہچکچاتے ہوئے کہا: "میری ایک گزارش ہے... ہماری ... بعد آپ ... ہمارا بیٹا ... کوئی غیر مرد دیکھ لے تو اس کی جان بچنی مشکل ہے۔ ... آپ نے ... کی ... جھلک بھی لی ہے... اب میں آپ دونوں سے کیا کہوں..."

عیسیٰ نے کہا: "میں سمجھ گیا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ تم لوگ بے فکر رہو۔"

اب داؤد اور عیسیٰ نے بغیر وقت ضائع کیے اپنی راہ پکڑی۔ تھوڑی دور جانے کے بعد عیسیٰ نے کہا: "داؤد میں نے تو سنا تھا ہندو عورت کے بیوہ ہونے پر سسرال والے اس کے شوہر کے ساتھ جل کر ختم ہو جاتی تھیں۔ یہ اپنی سسرال کیوں جا رہی ہے؟"

داؤد نے کہا: "کیا معلوم ہندوؤں کے رسم و رواج کا ہمیں کچھ زیادہ پتا نہیں ہے۔" پھر تھوڑی دیر خاموش رہ کر مسکراتے ہوئے کہا: "دوست، تم نے اس عورت کا چہرہ دیکھا ہے۔ وہ چہرہ اگر دل میں بس گیا تو تمہارا سارا امن چین چھن جائے گا۔ جتنی جلدی ممکن ہو اسے بھول جاؤ۔ ہمارے سامنے ڈھیروں کام پڑے ہیں۔"

گوڑ بنگال میں ہندو سلطنت کے زوال کے بعد بہت عرصے سے پٹھان سلاطین حکومت کرتے آئے تھے۔ اس کے بعد مغلوں نے یہاں حکومت قائم کرنی چاہی۔ پٹھانوں اور مغلوں کی بڑی جنگ چلی۔ ہمایوں بادشاہ کے انتقال کے بعد اس کا اکبر نامی کم عمر بیٹا دلّی کے تخت پر بیٹھا۔ اس کے زمانے میں پورے ہندوستان میں مغل سلطنت کی جڑیں مضبوط ہو گئیں۔ بنگال میں مغلوں نے بھی حکومت

Scanned with CamScanner

[illegible]

چاروں طرف وحشت کا ماحول تھا۔

[illegible]

پاس کسی کے لیے رعایت نہیں تھی۔

اب شورش کو [illegible] مختلف علاقوں کے کچھ زمیندار بھی اپنی [illegible] تھے۔ اپنی زمینداری اور اپنی رعایا کی جان و مال کی حفاظت کی خاطر ان لوگوں [illegible] اور اپنی فوج کی طاقت بڑھانے میں لگے ہوئے تھے۔ مغل [illegible] زمینداروں کی فوج میں زیادہ تر بنگالی تھے۔ [illegible] میں بہت سے دریائی جنگ [illegible] ہوشیار تھے۔ یہ چھوٹے چھوٹے سمندری بیڑے بنا کر پرتگالیوں کے سمندری بیڑے [illegible] زمینداروں کا مشہور [illegible] بارہ بھویاں تھا۔ بھویاں یا بھومک [illegible] زمیندار [illegible] ہمیشہ [illegible] کبھی کم تو کبھی زیادہ۔ ان میں سے کوئی [illegible]

[illegible] اور [illegible] وکھوں اور حیران [illegible] کرتے تھے [illegible]
[illegible] ان [illegible] سے [illegible] کا [illegible]
[illegible] رکھنے کے لیے [illegible] کی [illegible] تھی [illegible]
[illegible] تھا [illegible] تھے [illegible]
[illegible] ملتا نہیں تھی۔ ان [illegible] نے [illegible]
[illegible] تھی [illegible] گئی تھی [illegible] میں [illegible]
[illegible] میں بھی [illegible] نہیں [illegible] تھی۔

[illegible] شاہ [illegible] حکومت کے دوران بنگال کے [illegible] تھے [illegible]
[illegible] پرتاب [illegible] سونار گاؤں [illegible] بھوشن [illegible] اور [illegible]
[illegible] پرتاپ [illegible] اور اس کی [illegible]
[illegible] مزاج [illegible] کی [illegible] اس سے [illegible]
[illegible] تھے۔ [illegible] کے [illegible] کے دوران [illegible]
[illegible] اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ [illegible]
[illegible] تھی [illegible] تھی [illegible]
تھے۔ [illegible] سے چندرائے نے کئی جنگوں میں کامیابی حاصل کی تھی۔

اب چندر [illegible] بوڑھا ہو چکا تھا۔ اس کی اکلوتی پیاری بیٹی سورن [illegible] کا [illegible] میں [illegible] مشہور سوداگر سے بیاہ ہوا تھا۔ مگر چھ مہینے کے اندر اس کے شوہر کی سانپ کے کاٹنے سے موت ہو گئی۔ [illegible] سال کی عمر میں بیوہ ہو کر سورن [illegible] کے گھر لوٹ آئی۔ اپنی معصوم بیٹی کی بیوگی دیکھ کر راجہ چندر [illegible] صدمے سے بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا تھا۔ اس کے بعد سے اس کی حالت پوری طرح سے نہیں سدھری تھی۔ زیادہ تر بستر پر پڑا رہتا تھا۔

[illegible] سورن [illegible] بھی عمر کے شباب پر پہنچ رہی تھی۔ بڑی پاکیزگی اور پردہ داری میں وہ [illegible] خانے میں رہتی اور اپنے باپ کی خدمت کرتی تھی۔ ہندو بیواؤں کے رواج کے مطابق وہ دن بھر میں [illegible] ایک [illegible] کھانا کھاتی تھی اور ہر رات کو فاقہ کرتی تھی۔ بیٹی کی یہ حالت دیکھ [illegible]

[illegible]
تھا۔ رات کو اس نے بھی کھانا چھوڑ دیا تھا۔

[illegible]

راجاؤں میں جنگوں کا معمول ہوتے ہوئے باوجود ان دو بڑی راجدھانیوں میں کسی قسم کی دشمنی کا رشتہ نہیں تھا۔ آرکان راجہ کے مخالف کیدار رائے اور عیسیٰ نے ایک دوسرے کے ساتھ سے معاہدہ کر جنگ کی تھی۔ جنگ کے علاوہ بھی دونوں دوستوں میں بیچ بیچ میں کسی مطلب و غرض کی مذاق چلتا رہتا تھا۔

ان دنوں جھنڈ کے جھنڈ ہندو اپنا مذہب تبدیل کر رہے تھے۔ کچھ ظلم و ڈر سے، کچھ مسلمان حاکموں کی مہربانی حاصل کرنے کے لیے، کچھ اپنے مذہب کے ٹھیکیداروں کے ظلم اور ان کی ذات پات اور چھوت چھات سے تنگ آکر مسلمان بن رہے تھے۔ گوڑ بنگال میں جس وقت پٹھانوں نے قبضہ کیا تھا تب یہاں اس وقت اس جنگ میں مٹھی بھر مسلمان تھے۔ بعد میں ان کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی جو ہندو اپنا مذہب نہیں چھوڑنا چاہتے تھے وہ ڈر سے تب سے دن گزار رہے تھے۔ ہندو راجہ آہستہ آہستہ اپنا رسوخ کھو رہے تھے اور ان کی رعایا کا دھرم بھی اب محفوظ نہیں تھا۔

مگر آرکان پور اور سنار گاؤں کا ماحول بالکل الگ تھا۔ دونوں حکمرانوں کے برتاؤ کا اثر رعایا پر بھی پڑتا تھا۔ دونوں کے علاقے کے راجاؤں کے الگ الگ مذہب ہونے کے باوجود ان دونوں میں محبت و بھائی چارے کا رشتہ دیکھ کر رعایا میں بھی ایک دوسرے کے مذہب کے لیے نفرت نہیں تھی۔ یہاں مندر، مسجد دونوں ہی ساتھ ساتھ بغیر کسی جھگڑے کے چلتے تھے۔ اگر کوئی اپنا مذہب بدلنا چاہتا تو اس میں بھی کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ حالانکہ مذہب کی تبدیلی یک طرفہ تھی، ہندو سے مسلمان بنے کی۔ کیونکہ اگر کوئی مسلم چاہتا بھی تو ہندو نہیں بن سکتا تھا۔ ہندو سماج اسے اس کا حق دیتا ہی نہیں۔ دھرم سے دوری بھی چونکہ ہندو پروہتوں سے برداشت نہیں ہوتی تھی اور وہ فوراً اس چوک کرنے والے کو اپنے دھرم اور جات سے باہر کر دیتے۔ کچھ مٹھی بھر ساہوکار اور اونچی ذات کے ہندوؤں کے لیے ہندو سماج اب ٹوٹنے کے کگار پر تھا۔ سارے ملک کے سامنے سنار گاؤں اور وکرم پور مثال تھے، لیکن کب تک؟

سمندر کے جزیرے پر اپنا اپنا قبضہ جمانے کے لیے نہ جانے کتنے مختلف فریقوں نے حملے کیے تھے۔ کبھی اس جزیرے پر کیدار رائے کا اثر و رسوخ رہا، کبھی پرتگالیوں کا، کبھی آرکان راجہ کا۔ آرکان کی فوج کے سامنے پرتگالی فوج نہیں ٹھہر پا رہی تھی۔ آخرکار پرتگالی سپہ سالار کارولو جنگی ساز و سامان لے کر چاند رائے کی فوج میں شامل ہو گیا۔ عیسیٰ خان اور کیدار رائے دونوں آرکان راجہ کے حریف تھے۔ آرکان راجہ کی للچائی نگاہیں جزیرے کے بعد اب سونار گاؤں کی طرف اٹھ رہی تھیں۔

[illegible] اور [illegible] سے [illegible] کی آراکان راجہ کے ماتحت تھے۔ ان آراکانی باشندوں کو بنگال میں مگھ کہا جاتا تھا۔ [illegible] بنگال [illegible] تاریخ [illegible] قدم [illegible] ان سب کی جان اور [illegible] نے بھی [illegible] پرتگالی سپہ سالار [illegible] رہنمائی میں آراکانی فوج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ [illegible] کی فوج کے [illegible] بنگالی تھے۔ یہ بنگلی اور دریائی جنگ میں ماہر تھے۔ جہاں یہ [illegible] کشتی چلانے میں مہارت رکھتے تھے وہیں توپ اور کشتی چلانے میں بھی ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ بنگالی فوج کی اس مہارت کے سامنے مغل فوج کو شکست ہوئی اور پیچھے ہٹنا پڑا۔

[illegible] فوج پیدا [illegible] جہاز [illegible] شامل [illegible] جہازوں پر بھی جیت کی خوشی منائی جا رہی تھی۔ اس جہاز میں [illegible] جہاز میں ایک خوبصورت [illegible] بیٹھی تھی۔ [illegible] پرتگالی [illegible] تھے۔ دونوں طرف [illegible] دونوں [illegible] نظر [illegible] تھے۔

اس [illegible] پیچھے کی اور [illegible] راجہ [illegible] تھے۔ سپہ سالار [illegible] وقت ہونے [illegible] بیٹھے [illegible] تھا [illegible] تھی [illegible] نہیں تھی۔ [illegible] وقت دونوں [illegible] کے کانوں میں [illegible] بجنے لگی [illegible] تھے۔ دونوں راجہ [illegible] کا ذکر کر رہے تھے۔ اس بار [illegible] مقصد سے بنگال آیا ہے [illegible] اس بار اس کا لشکر تو بڑا تھا ہی، ساتھ ہی جنگی بیڑے بھی اس کے ہمراہ تھے۔ یعنی مغل فوج [illegible] دریائی جنگ کے لیے تیار تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ اس بار مغل سپہ سالار اپنا مقصد پورا کیے بغیر لوٹنے والا نہیں تھا۔

[illegible] جنگ کے میدان میں [illegible] شکست دینا مشکل کام ہے۔ اس بات کا علم دونوں کو تھا۔ اس [illegible] میں [illegible] نے جنگ کیے بغیر ہی اپنی شکست مان لی۔ [illegible] اپنی [illegible] کے بدلے مغلوں سے دوستی کرنے میں ہی عافیت سمجھ رہا تھا۔ [illegible] پرتگالی [illegible] کا [illegible] تھے۔

عیسیٰ خان اور میوار [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
برسات کا موسم بھی شروع ہو جائے گا۔

[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
راحت ملے گی۔

کچھ دیر تک اسی موضوع پر تبصرہ ہوتا رہا۔ بیچ بیچ میں دوسرے موضوع بھی چھڑ جاتے۔ عیسیٰ خان کو بچپن میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا تھا مگر جنگی مہارت میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ کیدار رائے کو سنسکرت عربی فارسی کی تعلیم ملی تھی۔ عیسیٰ خان کو اس سے رامائن اور مہابھارت کے قصے سننے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ خاص کر شری رام چندر [illegible] کے قصے وہ بار بار سننا چاہتا تھا۔ آج [illegible] نے کیدار رائے سے پوچھا: "راجہ رام چندر نے بالی کو جس طرح چھپ کر قتل کیا تھا، آپ اسے ٹھیک مانتے ہیں؟ جنگ کے وقت تو دشمن کو کسی طرح بھی ختم کرنا چاہیے۔ ہم بھی تو یہی کرتے ہیں اور آپ بھی کرتے ہیں۔"

[illegible]

[illegible] بزرگ تھے۔ کیا پتا ہندو تھے بھی یا نہیں۔"

[illegible] کر سکتا ہے؟"

[illegible]

ظلم سہنا پڑتا ہے۔ آپ کے مذہب کا یہ کیسا انصاف ہے؟"

"کس نے کہا ہماری بیواؤں کو ساری زندگی ظلم سہنا پڑتا ہے؟ وہ بیوگی کی زندگی گزارتی ہیں۔ دن رات عبادت میں ڈوبی رہتی ہیں۔ میکے میں وہ بچوں اور بوڑھوں کی خدمت کی سعادت سمیٹتی ہیں۔ اصولوں پر کاربند رہ کر وہ، اگلے جنم میں سکھی ہوتی ہیں۔"

"راجہ، ہندو بیوہ ایک غلام کی زندگی جیتی ہے۔ وہ ہر طرح کی خوشی اور روشنی سے کبھی نصیب نہیں ہوتی۔ وہ کسی غیر مرد کو اپنا چہرہ بھی نہیں دکھا سکتی، اس سے بات کرنا تو دور کی بات ہے۔ زندگی کی ساری خوشیوں سے وہ محروم رہتی ہے۔ اسے دو وقت کا کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ رنگین لباس یا زیور پہننا بھی منع ہے۔ مجبوراً اس کو اپنے مرد کی ارتھی میں جل کر مرنا پڑتا ہے۔ آپ اسے اصول کہتے ہیں؟ اس کا نام ناانصافی ہے؟ کیوں؟ ہندو مرد تو اپنی بیوی کے مرنے کے بعد ان اصولوں کی پابندی نہیں کرتے۔"

کیدار نے ذرا گرم لہجے میں کہا: "میں آپ سے اس موضوع پر بحث نہیں کرنا چاہتا۔ ہمارے مذہبی سنسکاروں کو سمجھے بغیر آپ زبان بند ہی رکھیں تو بہتر ہے۔ لیکن ہاں، ہندو بیواؤں کے بارے میں آپ کو اتنی معلومات ملی کیسے؟"

عیسیٰ نے کہا: "کیوں نہیں؟ میری رگوں میں بھی تو ہندو ماں کا خون ہے۔"

"کیا؟ کیا کہا آپ نے؟"

"آپ کو میرے والد کا نام معلوم ہے؟"

"نہیں۔۔۔ اوہ، یاد آیا، آپ شاید قاسم خان کے بیٹے ہیں۔"

"نہیں، قاسم خان میرے چچا ہیں۔ ان کی میں اپنے ابا جیسی ہی عزت کرتا ہوں لیکن میرے ابا کا نام [illegible] تھا۔ ہمارے آباؤ اجداد ایودھیا کے راجپوت تھے۔ میرے دادا ایک خوبصورت پنڈت تھے۔ میں نے بچپن میں ان کو دیکھا تھا۔ ان کی بات مجھے زیادہ یاد نہیں ہے۔ میرے دادا پنڈت ہو کر انہوں نے اسلام کیوں قبول کیا، اس کے دو قصے ہیں۔ ایک، کسی پٹھان سلطان کی بیٹی نے ان کی خوبصورتی پر فدا ہو کر ان سے نکاح کرنا چاہا لیکن میرے دادا اس بات پر راضی نہیں تھے۔ تب ان کو زبردستی اٹھا کر گائے کا گوشت کھلا دیا گیا۔ دل پر ان کو مجبوراً اسلام قبول کر کے اس لڑکی سے شادی کرنی پڑی۔ دوسرا، [illegible] پنڈت ایک دن مسلمان صوفیوں کے ساتھ ہوئے ولی

مناظرہ بازی میں ہار گئے اور دینِ اسلام کی عظمت کو تسلیم کرتے ہوئے مسلمان ہو گئے۔ ہمارے خاندان میں اس دوسری کہانی کو ہی صحیح مانا جاتا ہے۔ خیر، انھوں نے کسی سلطان کی بیٹی سے نکاح کیا اور وہ یہیں آباد ہو گئے۔ اس سلطان کے زمانے میں ان کی بہت ترقی ہوئی۔ بعد میں وہ پٹھانوں کی طرف سے مغلوں سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ میں اور میرا بھائی اس وقت بہت چھوٹے تھے۔ آگے سننا چاہتے ہیں؟"

"ضرور! مجھے تو ان باتوں کی جانکاری ہی نہیں تھی۔"

"اس جنگ میں ہم بھی اپنی جان بچانے میں لگے تھے۔ اس وقت کسی نے ہم دونوں بھائیوں کو یتیم سمجھ کے بچے بیچ کر غلام بنا کر بیچ دیا۔ مجھے فارس بھیج دیا گیا۔ وہاں چند برس ہم نے امیر لوگوں کے گھر پر نوکروں کا کام کیا۔ پھر یہاں کے حالات پرسکون ہونے کے بعد میرے ہمدرد چچا نے آدمی بھیج کر ہمیں ڈھونڈ نکالا اور واپس لے آئے۔ میرا بھائی اسمٰعیل زیادہ دن نہیں بچا۔ خوش قسمتی سے مجھے تریپورہ کے اجداد مانکیہ کی فوج میں نوکری مل گئی۔ میں نے کئی بار تریپورہ کی طرف سے سپہ سالار شہباز خان کو شکست دی۔ مہاراج اور مہارانی مانکیہ کی رانی نے خوش ہو کر مجھے سرکال پرگنہ بطور تحفہ دے دیا۔ میں ان کو ماں کہتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بیٹے جیسا پیار کرتی تھیں۔ ان سے ہی مجھے مسند علی کا خطاب ملا۔ اور پھر میں نے اپنی فوج تیار کی۔ شہباز خان اپنی بے عزتی نہیں بھولا تھا۔ بار بار میرے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ اس لیے میں نے سرکال چھوڑ کر کشور گنج کے جنگل باڑی میں اپنی نئی راجدھانی قائم کی۔ آپ نے وہ راجدھانی نہیں دیکھی ہے۔"

کیدار رائے نے تعجب آمیز لہجے میں کہا، "یہ تو روپ کتھا ہے! ایک معمولی غلام سے آپ آج اس پورے خطے کے علاقے کے راجہ ہو گئے ہیں۔ مغل بھی آپ کو مجبور کر چکے ہیں۔ آپ نے طاقت سے نہیں بلکہ اپنی طاقت، عقلمندی اور ہوشیاری سے سب کچھ حاصل کیا ہے۔"

عیسیٰ خان نے کہا، "بس ایک چیز کی ہوس ہے، ہم نے اپنا مذہب بدلا ہے۔ میرے پتا جی پہلے ہندو ہوا کرتے تھے۔ ان کی بیوی آج بھی ہندوؤں کے رسم و رواج مانتی ہیں۔ ان کو قرآن پڑھنا بھی آتا ہے اور ہندوؤں کے برت اپواس کا بھی پالن کرتی ہیں۔ میں نے ان سے ہی ہندو دیوتاؤں کی داستانیں زندگی کے بارے میں سنا ہے۔ یکایک کے ان ان کو ایک بوند پانی کی ضرورت نہیں ہوتا۔"

بیدر راے بولا: ''رمضان کے مہینے میں آپ دل بھی تو ان جیسے لگتے نہیں۔''

حسن خان نے جواب دیا: ''بیدر راے کے سامنے ٹھیک رہنا'' راے راے بید راج! میری آپ سے ایک گزارش ہے۔''

بیدر راے بولا: ''یہ کیا، آپ اس طرح کیوں کہہ رہے ہیں؟ مجھے بھلا مجھ سے آپ کی کیا گزارش ہو سکتی ہے؟''

حسن خان نے اسی طرح نیچے بیٹھے بیٹھے کہا: ''ہم لوگ دونوں ہی مغلوں کے خلاف ہیں اور جنگ کرنے کے معاہدے میں ہیں۔ اگر ہم دونوں کے خاندانوں کے بیچ بھی کوئی رشتہ قائم ہو جائے تو ہمارا رشتہ اور بھی مضبوط ہو جائے گا۔ ایسا رشتہ صرف بیاہ کے بندھن سے ہی قائم ہو سکتا ہے۔ میں آپ کی بہن سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

یہ سن کر بیدر راے ہکا بکا رہ گیا۔ اس کو گہرا صدمہ پہنچا۔ اس کا چہرہ سفید پڑ گیا۔ اس نے کہا: ''آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں خان صاحب! آپ مجھ سے مانگتے تو میں اپنی جان بھی آپ کو دے دیتا، لیکن شادی... مذہب اور عورت کا ستھ ہمارے سب سے بڑے عہد یا دین ہیں۔ ہمارے خاندان میں آج تک مذہب و ذات کے خلاف شادی نہیں کی گئی۔ اگر کوئی چھوٹی ذات کا راجہ بن جائے تو ہم اسے اپنے گھر کی بیٹی نہیں دیتے۔ مسلمان تو دور کی بات ہے۔''

حسن خان نے کہا: ''راجستھان کے خاندانی راجپوت راجہ تو مغلوں کے ساتھ شادی بیاہ کے رشتے قائم کرتے ہیں۔''

بیدر راے بولا: ''مہارانا پرتاپ نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی سلطنت کھو دی لیکن اپنی عزت و دھرم نہیں کھویا۔ دوسرے راجپوت راجاؤں نے مغلوں سے جنگ میں بار بار مات کھا کر ان کی غلامی قبول کر لی۔ پھر مغلوں کی مہربانی حاصل کرنے کے لیے اپنے گھر کی بیٹیوں کو ان کے حرم میں بھیجنے لگے۔ ان راجاؤں نے اپنی ماں بہنوں کو دے دیا۔ مغلوں کی جوتیاں چاٹ کر سپہ سالار بن بیٹھے۔ میں تو مرتے دم تک کسی کی طرح ذلت میں مبتلا ہو کر اپنا دھرم نہیں کھو سکتا، بلکہ اپنی جان دے دوں گا۔ پھر میری بہن بیوہ ہے۔ بیوہ کی شادی کے بارے میں سوچنا گناہ ہے۔''

حسن خان نے ہاتھ جوڑ کر کہا: ''مہاراج، آپ اپنی بہن کو زندگی دیجیے۔ ہر عورت مرد کا سکھ

چکی ہے۔ اور اسے جنم دینے میں ہی اسے خوشی ملتی ہے۔ آپ کی بہن ان سب خوشیوں سے محروم رہی ہیں۔ اس لیے اگر آپ چاہیں تو..."

اب کیدار رائے گرج اٹھا۔ "عیسیٰ خان، دوبارہ آپ کی زبان سے اگر اس بارے میں ایک بھی لفظ نکلا تو میں پھر کبھی آپ کی شکل بھی دیکھنا پسند نہیں کروں گا۔ میری بہن کا کردار بے داغ ہے۔ آپ کی ایسی بات سن کر وہ اپنی جان دے دے گی۔ میں آپ کو خبردار کر دیتا ہوں۔ آپ نے پھر کبھی اگر..."

عیسیٰ خان کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اس نے بڑی نرمی سے اپنی گزارش پیش کی تھی جس کے جواب میں اس ہندو راجہ نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی۔ عیسیٰ خان کے اندر اگر غصے کا شعلہ بھڑک اٹھا تو اس کے انجام سے شاید کیدار رائے واقف نہیں ہے۔ وہ اسی پل اپنی میان سے تلوار نکال کر اس راجہ کو ختم کر سکتا ہے۔

بڑی مشکلوں سے اپنے غصے پر قابو پا کر عیسیٰ خان کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت ندی کے کنارے سنسان تھے۔ ادھر گھنے جنگل تھے۔ ایک مچھیرا اکیلے پانی میں جال پھینک کر مچھلی پکڑ رہا تھا۔ کیا اسے پتا نہیں کہ کسی بھی وقت وہ باگھ کا شکار بن سکتا ہے؟ اپنا چہرہ گھما کر عیسیٰ خان نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ "مہاراج، آپ اس جہاز کو یہاں لگانے کے لیے کہیے۔ میں یہیں پر اترنا چاہتا ہوں۔ یہ جنگل قلعہ بنانے کے لیے مناسب معلوم ہوتا ہے۔ میں ذرا گھوم کر اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

کیدار رائے سر جھکائے رہا۔ وہ بھی اپنے غصے کو قابو میں کر رہا تھا۔

عیسیٰ خان کا قریبی دوست داؤد خان گرجہ پیر پور میں رہتا تھا۔ وہ اس قلعے کا سردار تھا۔ عیسیٰ خان کبھی کبھار جنگل محل چلا آتا تھا۔ وہاں دوست کے ساتھ گپ شپ کر کے دو چار دن بعد لوٹ جاتا۔ اس بار بہت دنوں سے عیسیٰ خان کا کوئی پتا نہیں تھا۔

ادھر مان سنگھ خود راج محل میں رہ کر ادھر ادھر بکھرے پٹھانوں کو شکست دینے میں مصروف تھا۔ پٹھان ہمیشہ سے مغلوں کے دشمن رہے ہیں۔ گوڑ بنگال پر اپنی حکومت کھو کر بھی وہ چپ نہیں بیٹھے۔ کچھ دنوں تک ادھر ادھر چھپے رہ کر وہ مغلوں پر دھاوا بول دیتے۔ اس بار مان سنگھ نے پٹھانوں کو جڑ سے مٹانے کی ٹھانی تھی۔ خود بیمار تھا اس لیے اس نے اپنے دونوں بیٹوں اور سپہ سالاروں کو

جنگ کے میدان میں بھیجا۔ اس کا ارادہ تھا کہ پٹھانوں کا خاتمہ کر کے وہ پرتاپ اصحت اور دوسرے مہاراجوں کو سبق سکھائے گا۔ فی الحال ادھر مغلوں کے تئیں کوئی ڈر نہیں تھا۔

دوست کے بلاوے پر بھی عیسیٰ خان چپ سادھے بیٹھا رہتا اور وہاں سے نکلتا ہی نہیں۔

ایک شام اپنے دوست کے برتاؤ سے حیران داؤد خان نے باغیچے میں ٹہلتے ہوئے دیکھا کہ جھیل کے کنارے کسی گہرے خیال میں ڈوبا ایک بیٹھا ہے۔ وہ اس کے پاس خاموشی سے بیٹھ گیا۔

کچھ دیر بعد عیسیٰ خاں کی طرف منہ گھما کر اس نے کہا: "مجھے پتا ہے، تم مجھ سے کٹ کر چلنا چاہتے ہو۔ جب بھی ملتا ہوں، بس نصیحت ہی کرتا ہوں۔ مگر اب کچھ نہیں کہوں گا۔"

عیسیٰ خان نے آہستہ سے کہا، "میں لگاتار اپنے دل سے جوجھ رہا ہوں لیکن کسی طرح اپنے کو سمجھا نہیں پا رہا ہوں۔ اندر ہی اندر جھلس رہا ہوں۔"

دوست نے پوچھا، "تم کس آگ میں جھلس رہے ہو؟ یہ وہ حسن کی پیاس ہے یا محبت کی؟ یا پھر تمہارے جسم کی بے قراری؟"

عیسیٰ خان بولا: "صرف حسن کی پیاس کیوں ہوگی؟ کیا عورت کا حسن میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا؟ اور محبت کسے کہتے ہیں، مجھے پتا نہیں۔ میرا سروکار صرف جنگ کرنے اور جسم کو تسکین دینے سے رہا ہے۔ لیکن اس عورت نے صرف ایک بار اپنی نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس کی نگاہوں میں کیا تھا، اس کا مطلب میں ابھی تک سمجھ نہیں پایا۔ بس وہ آنکھیں مجھے بار بار یاد آتی ہیں اور میں سب کچھ بھول جاتا ہوں۔"

داؤد نے کہا، "چھوڑو، ہم کہیں شکار پر جاتے ہیں یا پھر کوئی شہر لوٹ لیتے ہیں۔ تم کو اپنا دل اور دماغ دوسری طرف موڑنا چاہیے، ورنہ مصیبت آنے میں دیر نہیں ہے۔"

"مجھے اور کسی چیز کی خواہش نہیں رہی۔ میں بس ایک دفعہ ان نگاہوں کا مطلب سمجھنا چاہتا ہوں، اس کے بعد مرنا چاہتا ہوں۔"

"دوست، میں نے پہلے تم سے جو کہا ہے، اب بھی کہے جا رہا ہوں۔ اس عورت کو تم اپنے دل سے نکال دو۔ کیدار رائے کی اور تمہاری فوج کے یکجا ہوئے بغیر ہمارے مغلوں سے بچنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ ہندو مسلم فوجیں کندھے سے کندھا ملا کر جنگ کریں گے، یہ کیا کم بڑی بات ہے؟"

Scanned with CamScanner

ایک عورت کی خاطر یہ سب تباہ و برباد ہو جائے گا۔ کوئی بڑا کام کرنے کے لیے چھوٹی موٹی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ اگر تم چاہو تو میں اس سے بھی حسین عورتیں تمہیں پیش کر سکتا ہوں۔"

"دودو میاں نے جواب دیا، میں اس کی قیمت نہیں سمجھتا؟" لیکن مجھے بار بار یہی محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ایک بار چھوڑ دینے سے میری زندگی برباد ہو جائے گی۔ دنیا کی دولت کہتے ہیں، لگتا ہے اس کے سامنے سب کچھ حقیر ہے۔ میری سلطنت، جنگ میں حاصل ہونے والی جیت اور سب کچھ بے معنی ہے۔ مجھے اب کچھ نہیں چاہیے۔"

"پاگل مت بنو، یہ محبت نہیں، جنون ہے۔ چاہو تو میں اس کا علاج کر سکتا ہوں۔ کان کھول کر سنو، مدھو سوداگر اپنی بیوہ بہن کی شادی تم سے کرنے پر راضی نہیں ہوگا۔ اس وقت تمام ہندوستان میں ہندوؤں کی طاقت ختم ہو چکی ہے۔ کسی زمانے میں یہ ملک ان کا ہی ہوا کرتا تھا لیکن آج وہ سب مسلمانوں کے رحم و کرم پر زندہ ہیں، پھر بھی یہ لوگ اپنے اصول نہیں چھوڑنا چاہتے۔ ہندو بیوہ کے دماغ میں اس قدر مذہبی عقیدہ بھر دیا گیا ہے کہ اگر کوئی غیر مذہب والا اسے بیوگی کی ذلت سے آزادی بھی دلانا چاہے تو وہ اس بات کو نہیں قبول کرے گی بلکہ خودکشی کرنا بہتر سمجھے گی۔"

"تم کو پتا ہے، اس دن دو شیر اس عورت کو پکڑ کر کھینچ رہے تھے۔ اگر ہم ٹھیک وقت پر نہ پہنچ گئے ہوتے تو وہ اسے شکار کر لے جاتے۔ وہ کوئی ہندو تھی یا مسلمان، اس بات سے تو ہمیں کچھ بھی نہیں ہوا۔"

"ارے، وہ خبر پہلے ہی پھیل چکی ہے؟ بس وہی جان نہ پائے تو اسے تصور معلوم ہے کہ ہندو بیواؤں کی پاکیزگی برقرار رکھنے کی خاطر کیوں ضد کرتے ہیں، ہم بھی حیرت زدہ ہو جاتے ہیں۔ کتنی ہی بیوائیں اپنے رشتے داروں کی ہوس کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ حمل بھی ٹھہر جاتا ہے۔ یہ خبریں اندر ہی اندر دبا دی جاتی ہیں۔ کبھی کبھی ان بیواؤں کو مار بھی ڈالا جاتا ہے۔"

عیسیٰ خان نے غصے سے ہو کر جھیل کے پانی سے پیالہ بھر کر وضو کیا، پھر تھکی ہوئی ماندگی کے ساتھ پل میں اپنی پوجا میں بیٹھنے لگا۔ پھر دونوں طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے، "دوست مجھے کچھ پرکھنا ہے۔ تم چلو گے میرے ساتھ؟"

اس بیچ عیسیٰ خان نے اپنے مخبروں سے سوداگر کے بارے میں بہت کچھ معلوم کر لیا تھا۔

Scanned with CamScanner

ویسے تو سورن مئی اپنے میکے میں رہتی ہے لیکن سسرال میں بھی اس کا آنا جانا ہے۔ حال ہی میں اس کی ساس گزر گئی تھی۔ سورن مئی سے ان کی ساس کا رشتہ بڑا اچھا تھا، بالکل ماں بیٹی کی طرح۔ اس نے ہی سورن مئی کو اس کے سسر کے شرادھ میں بلوا بھیجا تھا۔ وہاں دس دن رہ کر سورن مئی کو اپنے میکے لوٹنا تھا لیکن اس بیچ اس کی ماں جیسی ساس بیمار پڑ گئی تو سورن مئی اس کی خدمت کے لیے رک گئی۔ اس کی موت کے بعد اس کا شرادھ سنسکار کر کے آج دو مہینے کے بعد سورن مئی اپنے میکے لوٹ رہی تھی۔

آج کوئی آندھی پانی نہیں تھا، ساتھ میں بارہ بیر بہادر تھے۔ ولبھ رام کا گھاؤ بھی گہرا نہیں تھا۔ علاج سے پوری طرح ٹھیک ہو کر اب وہ بھی ساتھ چل رہا تھا۔ آج کسی مصیبت کا اندیشہ نہیں تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ اس ٹوٹے پھوٹے مندر کے نزدیک آنے پر چیتا داسی نے پالکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکتے ہوئے کہا، ''اجی رانی دیدی کہہ رہی ہیں، یہاں کچھ دیر رک کر ذرا آرام کر لو۔''

ولبھ رام نے دوڑتے ہوئے آ کر کہا، ''چیتے، رانی دیدی سے کہو کہ یہ جگہ منحوس ہے۔ یہاں ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی تھی۔ اچھا ہو کہ ہم لوگ یہاں سے جلدی جلدی چل کر کالی گنگا ندی کے کنارے ستالیں۔''

چیتا نے اپنے ہونٹ دبا کر مسکراتے ہوئے کہا، ''یہ جگہ منحوس ہے؟ یہیں پر ہم پر آئی کتنی بڑی مصیبت ٹلی تھی، یاد ہے یا نہیں؟ یہی سب سے مبارک جگہ ہے۔''

مجبوراً ان کو وہیں پالکی اتار کر آرام کرنا پڑا۔ اس کے کچھ ہی دیر کے اندر پاس والے جنگل سے قریب بیس تیس فوجیوں کی ایک ٹولی ان کی طرف بڑھنے لگی جس میں بیس بندوق دھاری تھے۔ فوج کی وہ ٹولی اس قافلے سے دوری بنا کر ایک قطار کی شکل میں کھڑی رہی۔ صرف ان میں سے ایک گھڑسوار دھول اڑاتے ہوئے سامنے آیا۔ وہ گھڑسوار جنگی فوجی کے بھیس میں تھا۔ سر پر چمکتا لوہے کا ٹوپ تھا۔ قریب آتے ہی اس گھڑسوار کا چہرہ صاف دکھائی دینے لگا۔ وہ تھا عیسیٰ خان۔ ولبھ رام اس گھڑسوار کو پہچان کر ہاتھ جوڑے کھڑا رہا۔

عیسیٰ خان نے کہا، ''میں تم لوگوں کا کوئی برا نہیں کروں گا۔ تم بے فکر رہو۔ میں صرف اس پالکی میں بیٹھی راجکماری سے دو چار سوال پوچھوں گا۔''

ولبھ رام نے کانپتے کانپتے میں کہا، ''حضور، رانی بی بی کسی غیر مرد کے ساتھ بات نہیں کرتی''

عیسیٰ خان بولا: "دو میں مجھ دوں گا تو سب اپنی اپنی جگہ پر ٹھہرے رہو۔ اگر کسی نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں سب کو موت کے گھاٹ اتار دوں گا، یہ یاد رکھنا۔ اور اگر چپ چاپ رہو گے تو آرام سے گھر واپس جا سکو گے۔"

پنڈت نے پاس آ کر اس سے کہا: "مہاراج جو ہیں، میں ان سے کہتا ہوں کہ میں سونار گاؤں کا منصب دار عیسیٰ خان صاحب، شہزادی چاند رائی، راجکماری سے بات چیت کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔"

پردہ کی اوٹ سے چھتا نے کہا: "حضور کو میرا پرنام سویکار ہو۔ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔ اس دن آپ نے ہماری جان اور عزت بچائی تھی۔ اس کے لیے ہم ابھی آپ کے شکرگزار ہیں۔ گستاخی معاف ہو، میں مانتی ہوں یہ ٹھیک ہے، پھر بھی آپ سے میرا اتنا کہنا ہے کہ ہماری رانی بیٹی کسی غیر مرد سے بات نہیں کرتیں۔"

عیسیٰ خان نے کہا: "ٹھیک ہے، مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف کچھ سوال پوچھوں گا اور تم ان سے پوچھ کر جواب دے دینا۔ راجکماری جو بیوہ کی زندگی جی رہی ہیں، کیا وہ ایسی زندگی سے آزادی چاہتی ہیں؟"

تھوڑی دیر بعد چھتا بولی: "حضور، راجکماری نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔"

عیسیٰ خان نے کہا: "ٹھیک ہے۔ اب میرا دوسرا سوال ہے: اگر کوئی شخص ان کو عزت کے ساتھ اپنی بیوی بنانا چاہے، کیا تب بھی وہ راضی نہیں ہوں گی؟ دوسرے مذہب میں اس طرح کی کوئی مناہی نہیں ہے۔ کیا وہ صرف ہندو دھرم کا مسئلہ بنائے رکھنے کے لیے ساری زندگی دکھ جھیلتی رہیں گی؟"

چھتا نے کہا: "حضور، راجکماری آپ کے اس سوال کا بھی جواب نہیں دیں گی۔"

عیسیٰ خان نے کہا: "اچھی بات ہے۔ میرا تیسرا اور آخری سوال: اگر کوئی ان کی محبت میں دیوانہ ہو کر انھیں زبردستی اٹھا لے جائے تو وہ کیا کریں گی؟"

کچھ دیر بعد چھتا نے کہا: "حضور، راجکماری اس بار بھی آپ کے سوال کا جواب نہیں دیں گی۔ اگر اجازت ہو تو کیا میں خود آپ سے ایک سوال پوچھ سکتی ہوں؟ جہاں تک مجھے پتا ہے، کیدار رائے آپ کے دوست ہیں۔ کیا آپ اپنے دوست کی بہن کے ساتھ اس طرح پیش آ سکتے ہیں؟"

تب عیسیٰ خان نے ہلکے سے ہنستے ہوئے کہا: "ہاں، یہ صحیح ہے کہ کیدار رائے میرے دوست

Scanned with CamScanner

ہیں۔ تم نے مہابھارت کی وہ کہانی سنی ہوگی۔ شری کرشن کے ساتھ بھی تو ارجن سے دوستی تھی، پھر بھی ارجن شری کرشن کی بہن سبھدرا کو اٹھا لے گئے تھے۔ آپ بھی..."

چمپا نے کہا، "حضور، ہم لوگ بے بس عورتیں ہیں۔ اگر ہمارے پہرے داروں وغیرہ نے آپ کو روکنا چاہا تو ہم ان سے کیا کہیں گے؟" چمپا کے لہجے میں بڑی رقت مندی تھی۔

عیسیٰ خان نے کہا، "پھر تو میں تمہاری مذہبی کتابوں کے مطابق شری کرشن کی طرح راجکماری کو لے جانا چاہتا ہوں۔ اس بات پر کہیں وہ خودکشی تو نہیں کر لیں گی؟"

اس بار بھی چمپا چپ رہی۔

عیسیٰ خان نے کہا، "سنو، تمہارے پہرے داروں میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ ہمیں روک سکیں۔ نہ ان میں اتنی ہمت ہے۔ پھر میں خود تم لوگوں کو یہاں سے نہیں نکالنا چاہتا۔ اگر راجکماری خود باہر آ جائیں تو مجھے خوشی ہوگی۔"

ان کے اتنا کہتے ہی چمپا کا ہاتھ پکڑے راجکماری سورن مئی باہر نکل کر کھڑی ہو گئی۔ چہرے پر پڑا گھونگھٹ ہٹا کر اس نے عیسیٰ خان کو بھرپور نظروں سے دیکھا۔ وہ پرامید دکھائی دیں!

عیسیٰ خان نے کہا، "چمپا، میں ایک مسلمان ہوں، اس کے لیے اچھوت۔ میں خود پہلے ان کو نہیں چھونا چاہتا۔ تم ان کو میرے گھوڑے کی پیٹھ پر چڑھا دو۔ دیکھو کہیں ان کو کوئی اعتراض تو نہیں؟"

چمپا نے بڑی آسانی سے سورن مئی کو گھوڑے پر سوار کرا دیا۔ عیسیٰ خان نے ایڑ لگا کر گھوڑا سرپٹ دوڑا دیا۔ تھوڑی دیر بعد سورن مئی نے آہستہ سے پہلی بار زبان کھولی: "کیا آپ مجھ سے سچ مچ شادی کریں گے؟ بیوی کا درجہ دیں گے؟"

چہرہ گھما کر عیسیٰ خان نے کہا، "ضرور۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ آپ ہی میری خاص بیگم یعنی پٹ رانی بنیں گی۔ اللہ اور چاند سورج کو گواہ مان کر میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ ہم دونوں کا اگر بیٹا ہوا تو وہی ہماری گدی کا وارث ہوگا۔"

یہ خبر جب راجدھانی تک پہنچی تو کچھ دنوں تک چاند رائے سے چھپا کر رکھی گئی، لیکن بعد کب تک چھپائی رکھی جا سکتی تھی۔ چاند رائے کو اپنی بیٹی کے لاپتہ ہونے کا شک تھا۔ اندر محل میں یہ خبر پہنچتے ہی چاند رائے آہ آہ کر کے کراہنے لگا، جیسے کسی نے اس کی چھاتی میں بھالا گھونپ دیا ہو۔ وہ بے ہوش

Scanned with CamScanner

ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد جب اس کو ہوش آیا تو وید حکیم اس کو گھیرے بیٹھے تھے۔ پدماں کے پاس کیدار رائے بیٹھا تھا۔ چاند رائے نے کیدار رائے کی طرف دھنسی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا، "جو سن رہا ہوں کیا وہ سچ ہے؟"

کیدار رائے نے بغیر کچھ کہے، سر ہلا کر 'ہاں' کہا۔ ایک گہری سانس لیتے ہوئے چاند رائے نے بڑبڑاتے ہوئے کہا، "دور دیش سے یہ یون (مسلمان) ہندوؤں کو برباد کرنے آتے ہیں۔ یہ ہمارے راج ہڑپ لیں گے، ہمارے مندر توڑ دیں گے، ہمارے گھروں کی بیٹیوں کو اٹھا لے جائیں گے۔ اب ایک بھی ہندو نہیں بچے گا، ہمارا پراچین دھرم ختم ہو جائے گا۔ ستیہ یگ ہمارا مقدر ہے۔" پھر کیدار رائے سے بولے، "مسلمانوں پر کبھی اعتماد نہ کرنا۔ تو نے اس نرادھم سے دوستی کی تھی، اب دیکھ لیا نا اس دوستی کا نتیجہ؟ کیا قیمت دی اس نے؟ میں سمجھ رہا ہوں کہ اب میں زیادہ دن نہیں رہوں گا۔ ان آخری دنوں میں میرے سامنے اس سونائی کا نام بھی نہ لینا۔ آج سے وہ ہمارے لیے مر گئی۔ کیدار، تو میرے سامنے قسم کھا، تجھے اس کا بدلہ لینا ہوگا۔ جب تک تیرے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی رہے گا تب تک تو اس یون کے راج کو تباہ کرنے کی کوشش کرے گا، اور اگر تو اس پاپی کا قتل کر پایا تبھی میری آتما کو پرلوک میں شانتی ملے گی۔"

اس کے تین دن بعد چاند رائے نے آخری سانس لی۔

کیدار رائے نے اپنے باپ کے سامنے قسم کھائی تھی اور خبر پاتے ہی اس نے خود بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ عیسیٰ خان کو تباہ کر کے چھوڑے گا، چاہے اس کے لیے اسے اپنا راج ہی کیوں نہ کھونا پڑے۔

باپ کے شرادھ سنسکار کے ختم ہوتے ہی جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ کیدار رائے نے عیسیٰ خان کے راج کے خضر پور شہر پر حملہ کیا۔ دونوں فریقوں میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ لیکن حیرت کی بات تھی، جنگ کے میدان میں عیسیٰ خان کہیں نظر نہیں آیا؛ کوئی دوسرا سپہ سالار اس کی فوج کی رہنمائی کر رہا تھا۔ آخر کار کیدار رائے نے فتح حاصل کی۔ اس نے خضر پور کو لوٹ کر اسے اجاڑ دیا۔ اس کے بعد کیدار رائے کیل گاچھا گڑھ کی طرف بڑھا۔ وہاں بھی عیسیٰ خان کی غیر حاضری میں کیدار رائے نے آسانی سے اس قلعے پر قبضہ کر لیا۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد کیدار رائے کے پاس یہ خبر آئی کہ اس کے راج کے دوسرے کنارے پر عیسیٰ خان نے اپنی فوج کی دوسری ٹولی لے کر اس کے دو

Scanned with CamScanner

قلعوں کو مٹی میں ملا دیا ہے۔ کیدار رائے نے راج میں تباہی مچی تھی۔ عیسیٰ خان نے اقبال کیدار رائے کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن بیک بھر پور طاقت کا احساس اس کو اچھی طرح در ناپ رہا تھا۔

ان جنگی حملوں میں کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہوا، بلکہ دونوں فوج کی تعداد میں کمی آ گئی۔ اس دوران بھوئیں ہروں کی فوج کی بحالی کی امید پوری طرح سے ختم ہو گئی۔ ہندو اور مسلمان عوام میں بھی بے اعتمادی اور شک کا بیج پھوٹ پڑا۔

کیدار رائے اپنے دوسرے سپہ سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے بیٹھ گیا۔ دیر تک بحث مباحثہ کرنے کے بعد ان لوگوں نے کہا "مہاراج عیسیٰ خان کی طاقت کو ہمیں کم نہیں سمجھنا چاہیے۔ وہ جنگی منصوبہ بندی میں مہارت رکھتا ہے۔ اس کو پوری طرح سے ختم کرنے کے لیے ہمیں بڑی طاقت اور بھی بڑھانی ہوگی۔ دریائی فوج کو اور مضبوط کرنا ہوگا۔ اس کے لیے ہمیں وقت چاہیے۔ ادھر اراکان راجہ یہاں حملہ کرنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا ہے، جبکہ عیسیٰ خان نے اس سے معاہدہ کر لیا ہے۔ اس لیے اس وقت ہمیں بچاؤ کے لیے سب سے پہلے اراکان راجہ کو روکنا ضروری ہے۔"

کیدار رائے نے وقت کے تقاضے کو سمجھا۔ اس نے اپنے پرتگالی سپہ سالار کار بالو کو جیسور کے راجہ پرتاپ ادتیہ کے پاس مدد طلب کرنے کے لیے بھیجا۔ مہینے بیت گئے، جیسور سے کوئی خبر نہیں آئی۔ ادھر اراکان کی فوج لوٹ مار اور قتل و غارت گری کرنے لگی۔ پرتاپ ادتیہ اپنے مفاد کی خاطر کوئی بھی غلط کام کرنے سے پیچھے نہیں ہٹتا تھا۔ اس نے کار بالو اور اس کے ساتھ آئے سپاہیوں کو بیٹھنے رکھا۔ اور اسی دوران اراکان راجہ کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھی۔ مگھ فوج جیسور تک آ نہیں سکی تھی اس لیے ان کے خلاف جانے میں کوئی سمجھداری نہیں تھی۔ بلکہ اراکان راجہ کو خوش کرنے کے لیے اس نے ایک آسان راستہ اختیار کیا۔ بہت دن انتظار کروانے کے بعد ایک شام اس نے صلاح مشورے کے بہانے کار بالو اور اس کے ساتھیوں کو اپنے پاس بلوایا۔ کار بالو کے اپنی نشست پر آنے کے بعد کسی نے ایک لفظ نہیں کہا۔ پرتاپ ادتیہ کے اشارے پر باہر چھپے ہوئے حملہ آوروں نے کار بالو اور اس کے ساتھیوں کو گھیر لیا اور پل بھر میں کٹے ہوئے سر زمین پر لوٹنے لگے۔ یہ خبر مگھ سینا تک پہنچتے ہی وہ اور بھی بے خوف ہو کر بکرم پور کی طرف بڑھنے لگے۔ کیدار رائے کو ان کے خلاف اکیلے ہی لڑنا پڑا۔ عیسیٰ خان اپنے ہاتھ سمیٹے دور کھڑا دشمن کی بربادی کا تماشا دیکھتا رہا۔ مگھوں کو راج پر

Scanned with CamScanner

قبضہ کرنے کے بجائے لوٹ مار میں زیادہ دلچسپی تھی اس لیے یہ جنگ چلتی رہی۔

ادھر مان سنگھ نے پٹھانوں پر پوری طرح قابو پا کر بارہ سرداروں یعنی بارہ بھوئیں مردوں پر نگاہ ڈالی۔ پرتاپ ادتیہ جو ان میں سب سے بڑا تھا مگر اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے مغلوں سے خلاف جنگ میں اترنے کی بجائے اسے عیاشی اور عشرت کی زندگی زیادہ پسند تھی۔ مغل فوج کے آتے دیکھتے ہی اس نے بہت سارے تحفے تحائف بھیجے اور مان سنگھ کے آگے بغیر جنگ کیے ہی گھٹنے ٹیک دیے۔ مان سنگھ نے اس کو خراج دینے والوں میں شامل کر لیا۔

ان بارہ بھوئیں ہیروں میں صرف دو شخص ہی اپنی آزادی سے پیار کرتے تھے اور ساتھ ہی مغلوں کے خلاف تھے۔ ان میں ایک مسلمان تھا، دوسرا ہندو۔ دونوں میں خودداری کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ دو نڈر جنگجو بھی تھے مگر دونوں ایک ہو کر لڑنے والے نہیں تھے۔ اس کی خبر مان سنگھ کو پہلے ہی مل گئی تھی۔ ان کو ایک ایک کر کے ختم کرنا ہی ٹھیک رہے گا، یہ سوچ کر وہ دھیرے دھیرے سونار گاؤں کی طرف بڑھنے لگا۔

کبھی عیسیٰ خان کے ساتھ معاہدہ کر کے مان سنگھ اس کو دوست بنا گیا تھا لیکن عیسیٰ خان نے اپنی آزادی پر قائم رہتے ہوئے کسی بھی دلی کے بادشاہ کو خراج نہیں دیا تھا۔ مان سنگھ کی فوج سونار گاؤں کی طرف روانہ ہو گئی۔ اس بار کیدار رائے منہ پھیرے بیٹھا رہا۔ اس نے سوچا کہ دونوں ہی اس کے دشمن ہیں۔ اب اگر جنگ میں دونوں کی طاقت کم ہوتی ہے تو فائدہ اسی کا ہے۔ کچھ دنوں بعد خبر ملی کہ اس جنگ میں اچانک دشمن کے گولے سے عیسیٰ خان کی موت ہو گئی۔ ادھر مان سنگھ نے سونار گاؤں کو چھوڑ کر جزیرے پر قبضہ کرنے کے لیے مغلوں کا پیچھا کیا۔ کیدار رائے نے دیکھا، سونار گاؤں پر قبضہ کرنے کا یہ سنہرا موقع ہے۔ عیسیٰ خان کے بغیر اس کی فوج کی رہنمائی کرنے والا کوئی نہ رہا۔ عیسیٰ خان سے وہ سیدھے تو بدلہ نہ لے سکے گا لیکن اس کے راج کو تہس نہس کر کے کچھ تو تسلی ملے گی، یہ سوچ کر کیدار رائے نے کچھ ہی دنوں بعد اپنے پرانے دوست کے راج پر حملہ کیا۔

لیکن جتنی آسانی سے اس راج پر قبضہ کرنا چاہتا تھا ویسا ہوا نہیں۔ عیسیٰ خان کی موت ہو جانے والی فوج پھر سے ایک ہو گئی۔ کیدار رائے حالانکہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا لیکن جنگل محل کے قریب آتے ہی عیسیٰ خان کی فوج جم کر کیدار رائے کی فوج کا مقابلہ کرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ان

Scanned with CamScanner

رن نے جنگی اب تک پیچھے ہٹنے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔ شام کو کیدار رائے اپنے سپہ سالاروں کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے بیٹھے۔ انھوں نے سوال اٹھایا کہ عیسیٰ خان کے بعد بھلا یہ بھی کون شخص اس رن کا سپہ سالار ہے جو جنگی داؤں پیچ میں اتنا ماہر ہے۔

کسی کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔ لہروں کی طرح فوج پر ٹوٹ پڑتی ہے مگر آج تک کسی کو سامنے سے رہنمائی کرتے ہوئے نہیں دیکھا گیا۔ سپہ سالار کے بغیر اس جنگ کی ایسی کامیاب منصوبہ بندی کون کر سکتا ہے؟ کیدار رائے بولے، "جاسوس بھیجو۔ اس راج میں عیسیٰ خان کا وارث کون ہے؟ اس کا جاننا ضروری ہے۔"

تینوں سمتوں کی طرف تین جاسوس بھیجے گئے۔ ان میں دو کو تو کوئی خبر ہاتھ نہیں لگی لیکن آدھی رات گئے تیسرا ایک ناقابل یقین خبر لے کر آیا۔ وہ بھیس بدل کر دشمن کی فوج کے اندر گھس کر خود اپنی آنکھوں سے سپہ سالار کو دیکھ آیا تھا۔ اس نے کہا، "مہاراج، اس راج کی سیناپتی ایک عورت ہے۔"

عورت؟ بھلا بنگالی عورت نے جنگی داؤں پیچ میں کب مہارت حاصل کی؟ وہ تو جنگ کے میدان کے آس پاس پھٹکتی بھی نہیں۔ کیدار رائے نے پوچھا، "کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے یا پھر نری باتیں سنی ہیں؟"

جاسوس نے کہا، "میں نے سچ مچ اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کا نام سونائی بی بی ہے۔ لوگ اس کو عزت سے بی بی بھی کہتے ہیں۔ وہ ہمیشہ سینے میں لیس رہ کر فوج میں جوش بھرتی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ جنگ کے نازک دنوں میں بھی وہ خود ہاتھی پر سوار ہو کر آگے کی قطار میں آکر مورچہ سنبھالتی ہے۔" پھر ذرا جھجکتے ہوئے بولا، "مہاراج، میں نے جہاں تک سنا ہے، یہ عورت مرحوم عیسیٰ خان کی بیوی اور آپ کی سگی بہن ہے۔"

کیدار رائے کچھ پل کے لیے حیرت زدہ رہ گیا، پھر دھیرے سے بولا، "سونائی، میری بہن! وہ تو شرمیلی تھی کہ بات کرنے سے بھی ہچکچاتی تھی۔ کبھی کسی غیر مرد کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔ وہی سونائی اب ہتھیار لے کر مردوں کی فوج میں گھومتی ہے؟"

جاسوس سے اور کچھ دیر جرح کرنے کے بعد اس نے اپنے دوسرے سپہ سالاروں کو حکم دیا، "جنگ نہیں کی جائے گی، سفید جھنڈا لہرایا جائے گا۔ مخالف فوج کے سپہ سالار کے پاس چٹھی بھیجا

Scanned with CamScanner

جائے گا۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔"

رات بھر کیدار رائے کو نیند نہیں آئی۔ اس نے سمجھا تھا کہ ضد میں آ کر بھی شاہ نے اس کی بہن کو اغوا تو کر لیا لیکن چھوٹی ملکہ اس کے ساتھ تھی۔ یوں مل کر اس نے بیاہ رچا لیا ہوگا۔ شیش محل پر کیدار رائے کا غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تھا مگر وہ سوال کی گونج سن رہا تھا، جیسے کہ وہ مر کر ہو۔ سورن کی کو وہاں سے بے محل میں لانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ ہندو عورت کو اگر کوئی غیر مرد چھو بھی لے تو پھر اس کا اپنے گھر رہنا ناممکن ہے۔ اپنے خاندان کے دوسرے افراد سے ہم جو جانتے ہیں۔ چاند رائے کی اس وقت تک نہایت پرسکون اور خوش مزاج لڑکی میں یہ کیسے آیا کہ آج وہ اپنے ملک اور بڑے بھائی کے خلاف ہتھیار لے کر جنگ کے میدان میں آگئی؟

اگلے دن سفید جھنڈا لہرانے کے بعد بیگ صاحب مخالف خیمے میں گیا مگر فوراً ہی ملاقات کا فیصلہ نہیں ہو سکا۔ طرح طرح کی شرطوں کو لے کر دونوں فریقوں میں کھینچا تانی چلتی رہی۔ ایک طرف تحریک رکھ کے ملنے کے بہانے اس کو قتل کرنے کی سازشیں تھیں۔ جہاں بھائی کو بھائی پر بھروسا نہیں ہے وہاں بچاری ورجنی میں کیسا بھروسا؟ دن کے آخر میں طے ہوا کہ دونوں فریقوں کی فوج سے الگ دونوں کے بیچ ایک جگہ پر ایک نیا خیمہ لگایا جائے گا جہاں دونوں فریق کے دس دس چنے گئے سپاہی پہرے پر رہیں گے۔ خیمے کے اندر صرف اس فریق کا جیا اور دوسرے فریق کی رانی ہو گی۔

دن ڈھلنے کا وقت، سانجھ ہونے کو تھی۔ کیدار رائے پہلے وہاں پہنچ گیا۔ اندر دو مشعلیں جل رہی تھیں۔ آمنے سامنے دو سنگھاسن رکھے ہوئے تھے۔ کیدار رائے ایک پر بیٹھ گیا۔ رانی کے اندر آنے کے بعد کیدار رائے کچھ دیر اس کی طرف ٹکٹکی باندھے گھورتا رہا۔ وہ پہچان میں ہی نہیں آ رہی تھی۔ جس کو ہمیشہ سفید لباس میں دیکھا تھا، آج وہی رنگین مسلمانی لباس میں، سر پر چمکتا ہوا سونے کا تاج پہنے سامنے کھڑی تھی۔ رانی نے ہی بات کرنے کی پہل کی۔

"دادا، مجھے تمہاری قدم بوسی کرنی چاہیے تھی لیکن کہیں میرے چھونے سے تمہاری ذات نہ چلی جائے، اس لیے میں دور سے آداب کر رہی ہوں۔"

طنز کے ساتھ کیدار رائے نے کہا، "رہنے بھی دے، بہت ہو چکا۔ تو کیا یہی ہماری سوغات ہے؟ اپنا دھرم کھو کر تو ایسے خراب حال میں میرے سامنے آئی ہے۔ اس سے پہلے تو مر کیوں نہیں گئی؟"

رانی نے صاف صاف کہا، "جو مذہب عورت کو صرف مرنے کے لیے کہتا ہے، میں اس مذہب کو نہیں مانتی۔"

کیدار نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا: "ہمارا دھرم یہاں عورت کو مرنے کے لیے کہتا ہے؟ باپ کی سیوا، شوہر کی سیوا، بیٹے کی سیوا، ایسی عظیم سیوائیں عورتوں کے لیے ہی ہیں۔ وہی ان کو انجام دیتی ہیں۔ بیوہ عورت عمر بھر پاکدامن رہتی ہے۔ دیوی دیوتاؤں کی عبادت کر کے کتنے پن کماتی ہے۔ دوسرے جنم میں بھی اس لیے وہ سدا سہاگن رہتی ہے۔"

رانی سنگھاسن پر بیٹھی نہیں بلکہ کھڑی رہی اور بولی: "پاکدامن کا مطلب ہے، اس دنیا کے سارے عیش و آرام سے اپنے کو دور رکھنا۔ سیوا کا مطلب ہے سسرال یا میکے میں دوسروں کی کنیز یا خادمہ بن کر رہنا۔ مجھے اپنے پہلے شوہر کی شکل تک یاد نہیں۔ میں ایک دن بھی اس کے ساتھ بیوی بنا جیون نہیں جی، پھر بھی ساری عمر اس کا ہی دھیان کرنا پڑے؟ تم لوگوں نے تو کبھی مجھے چین سے سانس بھی لینے نہیں دیا۔"

آواز رندھنے لگی تھی لیکن رانی اس وقت اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر میں اپنے پر قابو پاتے ہوئے وہ کہنے لگی، "دوسرے جنم میں تو تم لوگ یقین کر سکتے ہو۔ میں اب مسلمان ہوں، میں ان باتوں پر یقین نہیں رکھتی۔ میں سمجھ گئی ہوں کہ انسان کو اپنی خواہشیں، اپنی چاہتیں اسی جنم میں مٹا لینی چاہییں۔"

کیدار رائے بولا: "چھی! خود کو مسلمان کہنے میں تجھ کو ذرا بھی شرم نہیں آتی؟ تو ہمارے خاندان کا کلنک ہے۔ ایک احسان فراموش لٹیرے نے تجھے اغوا کیا تھا۔ اپنا مذہب چھوڑنے سے پہلے تو مری کیوں نہیں؟ کم سے کم اس سے بھی ہم خوش ہوتے۔"

"دادا، تم کو یا تمھارے خاندان کو خوش کرنے کی ذمہ داری اب میری نہیں رہی۔ میرے شوہر نے مجھے جو عزت دی ہے..."

"عزت؟ اس کے حرم میں تیرے جیسی اور کتنی بیویاں ہیں؟"

"جتنی بھی ہوں... کیا ہندوؤں کی آٹھ دس بیویاں نہیں ہوتیں؟ یہ لوگ تو پھر بھی حرم میں اپنی بیویوں کو کھانے پینے کو دیتے ہیں، اور ہندو؟ وہ تو ایک کے بعد ایک شادی کرتے ہیں اور بیوی کو اس

Scanned with CamScanner

نے بیٹے چھوڑ آئے ہیں اور وہ پربت جیسے مضبوط ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ میرے شوہر نے مجھے بھرپور آزادی دی ہے۔ مجھے تمہاری گردن سے تلوار چلانا۔۔۔"

"یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی، اب کام کی بات کرتے ہیں۔ تو میرے ساتھ کس بوتے پر جنگ کرنے آئی ہے؟ تیرا راج میں چاہوں تو مسل کر رکھ دوں۔ ہاں تجھ سے میری آدھی فوج کا خاتمہ کر دیا ہے۔ کل تو اور تیری فوج تھی، ادھر سے دونوں ہی ایک ہو گئے تو کمزور کر رہی تھی کا مقابلہ کر سکیں گے۔ جیسی حالت ہے میں نے کئی دن اس بات پر سوچا لیکن اب سے معصوم عشق وار ... نے دنی میں میرے ساتھ احسان فراموشی کی۔ میں تجھے وچن دیتا ہوں کہ تجھے یا تیرے بیٹوں کو کوئی چھو بھی نہیں سکے گا۔ میں تیرے لوگوں کے لیے ماہانہ خرچ بھیجنے کا انتظام کر دوں گا۔ باقی کی زندگی آرام چین سے بسر کرنا۔"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر رانی بولی: "میرے شوہر آخری سانس تک مردوں کی طرح لڑتے رہے۔ ان کی موت پر ہمیں ناز ہے۔ انہوں نے مجھ سے قسم لی تھی کہ زندگی کے رہتے میں اس راج کی آزادی کو دوسروں کے ہاتھ ... گاؤں میں سے ہر ایک بچے کی ... غلام نہیں ... اب تم میرے دشمن ہو۔ میں اپنی آخری سانس تک ہتھیار نہیں ڈالوں گی۔ میرے سپاہیوں نے عہد کیا ہے۔"

"اس جنگ میں تو تجھے ہارنا ہی ہے۔ اس کے بعد میری فوج جب لوٹ مچائے گی تو میں ان کو روک نہیں پاؤں گا۔ تم سے کم سے کم اپنے بیٹوں کے بارے میں تو سوچ۔۔۔"

تبھی باہر سے کسی نے بے قراری کے لہجے میں آواز نکالی: "مہاراج! مہاراج!"

کیدارانے نے غصے سے کہا، "کون ہے؟ میں نے کہا تھا کہ اس وقت مجھے کوئی تنگ نہ کرے؟ دور ہو جاؤ۔"

اس آدمی نے پھر بھی کہا، "مہاراج! مہاراج! بہت ضروری خبر ہے۔ آپ کے لیے ابھی جاننا ضروری ہے۔ مہاراج۔۔۔"

کیدارانے نے خیمے کا پردہ ہٹا کر دیکھا کہ باہر سامنے اس کے تین بہت ہی بھروسے مند معاون سپہ سالار گھبرائے ہوئے کھڑے ہیں۔ ان میں سے ایک نے کہا، "مہاراج، راجدھانی سے خبر ملی ہے کہ مہاراج ... سنگھ نے آپ کے پاس ایک چٹھی بھیجی ہے۔ چٹھی کے پاس ایک خط بھی

بے شک تم اس کے مددگار ہو، مگر اس خط کا جواب نہیں ملا تو وہ لوٹ جائے گا۔"

کیدار راے تھوڑی دیر بعد میں سوچ کے کہا کہ یہ مان سنگھ کی ورچن چال ہے۔ "یہ ایلچی، وہ اس سے پہلے کبھی نہیں بھیجا۔ سرحد پر حملہ کر کے جنگ کا اعلان کرنا اس کا طریقہ ہے۔"

اب دوسرے آدمی نے کہا، "مہاراج، اس وقت ہماری راجدھانی محفوظ نہیں ہے۔ آپ کو اسی وقت وہاں لوٹ جانا چاہیے۔"

دوبارہ خیمے میں آ کر کیدار راے نے سنجیدہ لہجے میں کہا، "درانی، میں نے کسی پجاری سے سنا ہے کہ جیسی قسمت کا راج تمہیں کیسے بنا ملے چپ نہیں بیٹھوں گا۔ فی الحال وہ کام میں ٹال رہا ہوں۔ اس وقت میں مان سنگھ کی فوج کو کسی طرح سے سبق سکھانے کے قابل ہوں۔ میری دریائی فوج مغلوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مضبوط ہے۔ اب تو زمینی جنگ میں میرے پاس ہاتھی سینا بھی ہے۔ مان سنگھ نے اگر اپنی جان بچا بھی لی تو بھی اسے پیچھے لوٹنا ہی ہے۔ اس کام کو تمام کر کے میں پھر یہاں آؤں گا، اس بات کو یاد رکھنا۔"

اسی رات ایک گھڑسوار ٹکڑی کے ساتھ کیدار راے فوراً راجدھانی کے لیے روانہ ہو گیا۔ مغل بادشاہ کے ایلچی کے ساتھ دوسرے ایلچیوں کی طرح سلوک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اگلے دن دربار میں اسے بڑی شان و شوکت کے ساتھ لایا گیا۔ ایک اونچے تخت پر نگینوں سے جڑا سونے کا تخت سجایا گیا۔ درباریوں کو خبر دے کر بلایا گیا۔ صدر دروازے کو پھولوں سے سجایا گیا۔

جب دربار شروع ہوا، مان سنگھ کے ایلچی کو مجلس میں بٹھا کر کیدار راے درباریوں کے ساتھ دوسرے موضوعات پر گفتگو کرنے میں مشغول ہو گیا۔ یہاں تک کہ اپنے میر بحر کے ساتھ بحری تجارت میں وسعت کی راہیں، شکنتلا کے بیان اور کالی داس کے ابھیگیان شاکنتلم میں کہاں کہاں فرق ہے، اس پر بات چیت چھیڑ بیٹھا، جیسے جتانا چاہتا ہو کہ مان سنگھ کا بھیجا ہوا ایلچی اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا، نہ اس پر دھیان دینے کی کوئی وجہ ہے۔ کچھ وقت گزر جانے کے بعد جیسے اچانک یاد آ گیا ہو، اس نے اپنے وزیر سے پوچھا، "ارے ہاں، میں نے سنا ہے کہ مہاراجا مان سنگھ کی طرف سے کوئی ایلچی آئے ہیں۔ کہاں ہیں وہ؟ دربار میں بلاؤ ان کو۔"

وزیر نے کہا، "مہاراج، وہ سبھا میں حاضر ہیں۔ اس سمت میں بیٹھے ہیں۔"

[illegible]

اسی سے آپ کے منشا سے واقف ہو جائیں گے۔"

[illegible]

اس خط کو پڑھتے پڑھتے کیدار ناتھ نے کہا، "آپ [illegible] پاس تو کوئی ماہر [illegible]

[illegible]"

[illegible]

خطرناک سمر سنگھ، مان سنگھ اب آ چکے ہیں۔"

[illegible]

"یعنی سیدھے سیدھے جنگ کا بلاوا؟"

[illegible]

سے روکے رکھنے سے آگے بڑھا۔ برسوں سے مان سنگھ والی کڑی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ بنگالی فوج ہر روز حملوں کی باری لگا کر جنگ کے میدان میں اتر رہی تھی۔ کیدار رائے بھی جیسے آسمانی طاقت سے بھرپور ان کی رہنمائی کر رہا تھا۔ کبھی وہ گھڑسوار فوج کے سامنے نظر آتا تو دوسرے ہی پل جنگی جہازوں میں کمان داخل دکھائی دیتا۔ سب فوجی اپنے راجہ کو اپنے ساتھ پاتے۔ بجلی کی سی تیزی سے وہ پورے جنگ کے میدان پر چھا گیا تھا۔ پہلے دن کی جنگ برابری پر رہی لیکن دوسرے دن مان سنگھ کی فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مغل فوج ان کے جنگی داؤ پیچ کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ یہ بنگالی فوج سامنے سے زیادہ نہیں آتی لیکن اچانک ہی دائیں بائیں اور پیچھے سے ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں دھاوا بول دیتی ہیں۔ نہ جانے کیسے اتنی جلدی سمت بدل لیتے ہیں یہ بنگالی فوجی۔ ندی نالے والے دیش کے یہ لوگ پانی کے اندر دیر تک ڈبکی لگائے رہ سکتے ہیں اور دور سے ڈبکی لگا کر تیرتے ہوئے آکر یہ کب دشمن کی بحری فوج کی ناؤ میں پانی کے اندر سے حملہ کر دیتے ہیں، اس کا پتا ہی نہیں چلتا۔

مغلوں کی رسمی فوج اور کمان کیدار رائے کی فوج کے مقابلے کہیں زیادہ طاقتور تھی مگر کیدار رائے کی فوج میں حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جنگ کے نویں دن مان سنگھ پیچھے ہٹنے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ تبھی ایک خوفناک حادثہ ہوا۔

برسات کا موسم آنے والا تھا اس لیے کیدار رائے کی فوج کو اپنی فتح کا یقین تھا لیکن یکایک مغلوں کی فوج سے کسی سپہ سالار نے سیدھے کیدار رائے کے سر کو نشانے پر لے کر گولی چلا دی۔ شاید جان نہ ہوا کیدار رائے گھوڑے سے گر گیا۔ عیسیٰ خان اور کیدار رائے کی موت بالکل ایک ہی طریقے سے ہوئی۔

بنگالی فوج میں ہاہاکار مچ گئی۔ اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر مغلوں نے اپنے حملے میں تیزی پیدا کر دی۔ کیدار رائے کی فوج تتر بتر ہو گئی۔ مان سنگھ اپنی فوج کے ساتھ راجدھانی شری پور آیا۔ وہاں اس نے اپنی فوج کو لوٹ مار کی اجازت دے دی۔ خود اس راج کی دیوی شیلا ماتا کی مورتی لے کر چلا گیا۔ سونے کا شری پور تباہ ہو گیا۔

کچھ دنوں بعد عیسیٰ خان کا راج غیر محفوظ سمجھ کر مغلوں نے پھر حملہ کیا مگر نعمت بی بی نے خود اپنی فوج کو یکجا کیا اور خود منصب سنبھال لیا۔ پہلی دفعہ تو اس نے مغل سینا کو روکا، پھر حاجی گنج درگ میں جا کر پناہ

Scanned with CamScanner

ی۔ دشمنوں کے ساتھ اس نے جو گھمسان کی جنگ کی، ایسا کبھی کسی بنگالی عورت نے شاید ہی کیا ہو۔ دشمنوں نے حاجی گنج قلعے کو گھیرے آگ لگا دی۔ جمت بی بی یعنی سانال بی بی نے دشمن کے ہاتھ نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ اس نے اسی آگ میں کود کر اپنی مرضی سے جان دے دی۔ اس کا عہد اور اس کی قسم دونوں پورے ہو گئے۔

❀❀

بنگلہ زبان کے معروف شاعر اور فکشن نگار سنیل گنگوپادھیائے 1934 میں مشرقی بنگال کے شہر فرید پور میں پیدا ہوئے، اور 1954 میں کلکتہ سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ اس کے ایک برس پہلے انھوں نے کرتی باس کے نام سے شاعری کا ایک رسالہ جاری کیا جو آگے چل کر نئے تجربے کرنے والے شاعروں کا ایک اہم پلیٹ فارم بن گیا۔ وہ شاعری، فکشن، سفرنامے، مضامین وغیرہ کی دو سو سے زیادہ کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کی دو ناولوں پر بنگال کے عظیم فلم ساز ستیہ جیت رے نے فلمیں بنائیں۔ ان کے تحریر کردہ بچوں کے فکشن میں مقبول کردار ککا بابو بے حد مقبول ہے۔ سنیل گنگوپادھیائے 2008 سے ساہتیہ اکادمی کے صدر تھے۔

کیرتی ناشا پدما ندی کا دوسرا نام ہے جو مشرقی بنگال میں واقع ہے۔ بنگال کے بارہ بھویاں کا تاریخ سے گہرا تعلق ہے۔ تاریخ میں مغلوں اور پٹھانوں کے ساتھ ساتھ بارہ بھویاں کی جنگ کے متعلق جتنا لکھا گیا ہے، بارہ بھویاں کے بارے میں اس کا نصف حصہ بھی نہیں لکھا گیا۔ کچھ روایتوں اور لوک گیتوں میں آج بھی عیسیٰ اور سونا بی کی محبت کی داستان بکھری بکھری سنائی پڑتی ہے۔ مغربی بنگال کے برعکس مشرقی بنگال (سابق مشرقی پاکستان اور موجودہ بنگلہ دیش) میں یہ عشقیہ کہانی آج بھی گاؤں میں کہی اور سنی جاتی ہے۔ ایک ہندو بیوہ خاتون سے ایک مسلمان راجہ کے ساتھ انوکھے عشق کے اس افسانے میں مذہبی عقیدے اور قدیم ہندو سماج کے خلاف ایک خاتون کی بغاوت ایک خاص معنویت رکھتی ہے۔ ([illegible])

Scanned with CamScanner

نیر مسعود کی کتابیں

عطر کافور
(کہانیاں)
قیمت: 80 روپے

ایرانی کہانیاں
(ترجمے)
قیمت: 90 روپے

انیس
(سوانح)
قیمت: 375 روپے

مرثیہ خوانی کا فن
(تنقید، تحقیق)
قیمت: 150 روپے

منتخب مضامین
(تنقید و تحقیق)
قیمت: 280 روپے

کافکا کے افسانے
(افسانے)
قیمت: 70 روپے

معرکۂ انیس و دبیر
(تنقید، تحقیق)
قیمت: 150 روپے

گنجفہ
(کہانیاں)
قیمت: 200 روپے

Scanned with CamScanner

شنکھ گھوش

بنگلہ سے ترجمہ: شمیم حجازی/افضال احمد سید

یہ دریا اکیلا

جسم سے کھل جاتا ہے اگر بھی کچھ، پھر نئے سرے سے اُگ آتا
اس تازگی کا
تن میں ضرور ہے کچھ بات۔ مجرم؟ جو سارے جرم
کرتا ہوں ہر روز
کیا معلوم ہے تجھے؟
ان ہاتھوں کی مٹھی میں جمع کر چکا ہوں کتنی بددعائیں
اتنا قریب یہ دریا
پھر بھی کھل جاتا ہے سب کچھ، جانی پہچانی اس صبح سے دور
لہراتا ہوا سبز
اچھا لگتا ہے اس کے کنارے خود کو جھکانا کبھی کبھار
اے رس بھرے پودے
کیا معلوم ہے تجھے؟ یہ دریا، اکیلا
ڈوبتے سورج میں بہتا ہے اپنی آنکھیں، دور کہتا ہے
کیا میں بہت دور نکل چکا ہوں؟

Scanned with CamScanner

جسم

جسم میں کچھ ہونے لگا ہے، اے چارہ گر میرے
معلوم نہیں
کیسے بتاؤں اس کا نام

تپنے سے ابرو بجھ جاتی ہیں بھاری پلکیں
رگوں میں درد
اندر سے نکل گئی ہے زرد رنگ روشنی

پر یہ تو ہے شام کی رنگت، کیا یوں ہی
ہوتی ہے شام؟ ہونا چاہیے؟

جسم میں کچھ ہو چلا ہے، اے چارہ گر میرے
معلوم نہیں جس کا نام

زرہ بکتر

میرے گھر کے کھلے ہوئے دروازے تک جب وہ
لوٹ کر آتا ہے رات، اپنے چہرے پر لیے بے شمار زخم
کھڑا ہوتا ہے دہلیز پر، ساتھ لیے ساری کائنات کا سکوت

خم کیے ہوئے جسم، افق سے اوجِ فلک تک
برستی ہے چہرے پہ بے شمار ستاروں کی چبھن
جھک کر اس بے سہارا شان سے ہم ہوتا ہے
جیسے ان پہ شاید گر پڑے تا میرے قدموں کی
سجدہ گاہ پر یہ بد دیانت جسم
نیم شب کی دھڑکن میں خاموش ہوئی
مدت سے معدومیت تک بے شکل، مبہم سانس، پھر بھی وہ
پکارتے ہوئے کسی دور جگہ، دور رہتے میں، دور، ایک دنیا کو
کہتا ہے: تی اگر حرفِ بندگی، ناوک، ور ناوک اندر
پھر کیوں سا تم نے بس یہ جسم ہی دیا، اور جنوں تھے
ساتھ میں دیتا ایک
ذرہ بھر

بلا عنوان

آج کل کوئی بھی انسان جنگل میں نہیں بستا
گلے میں بستے ہیں انسان
اس نے میری بیٹی کو چرا لیا تھا
جو جاڑے کے پھولوں والی ایک پوشاک پہنے ہوئے تھی
الزام ہم کس پر لگائیں

بس سوچتا ہوں اس لڑکے کا اداس چہرہ

ہر شام گلی کے کنارے
وہ اب بھی کیوں اس کا انتظار کرتا ہے
سب کچھ ہے وقت ڈھلتے میں، الزام ہم کس پر لگائیں

مدہوش

اور، اور تھوڑا مدہوش بنا دو اُسے
ورنہ یہ کائنات
آسانی سے شاید اسے سہہ نہ سکے

وہ جو ابھی جواں ہے، اے خدا
ابھی عمر رسیدہ بنا دے اسے
ورنہ یہ زمیں
آسانی سے شاید اسے اٹھا نہ سکے

چپکے

دوپہر کی خشکی میں
سارے پتے اگر اپنی دھڑکنوں کی
نزاکتیں کھو چکیں
ڈانٹیں گے، بہت ڈانٹیں گے مجھے

Scanned with CamScanner

چیخ

چاہیے فوراً جو چاہتے ہیں
ورنہ بیکار ہے یہ زندگی، ہر خواہش پر
اگر قانون ڈرائے ہمیں
جلتی ہوا کی ان بخیل انگلیوں سے
پھر بے دوا وہ زندگی خشک
خاک ایسی زندگی پر

نازک یہ اداس دوپہر بادلوں کی
سورج کر انگلیوں سے چھو لے
ڈانٹیں گے، بہت ڈانٹیں گے تجھے
چیخ

پانی

کیا پانی محسوس کر سکتا ہے تمھارا درد، پھر کیوں پھر کیوں
جاؤ گے پانی میں تم اس آبی قربت کو چھوڑ کے
کیا پانی ستاتا ہے تمھیں، پھر کیوں، پھر کیوں
مجبور جانا چاہتے ہو شب درد کا یہ آبی وزن

بھیڑ

چھوٹے ہو کر اُتر جائیے جناب
سکڑ کر اُتر جائیے
آ تمہیں بھی نہیں کیا، اور کچھ نہیں سکتے؟
سکڑ جائیے چھوٹے ہو جائیے

اور کتنا چھوٹا ہو جاؤں (اے خدا)
بھیڑ سے اندر کھڑے
کیا ہر لمحہ اپنے آپ کے ہی برابر ہوں میں
صدر میں، بازار میں، اکیلے میں

پتھر

پتھر، میں نے ہی جڑ دیا تھا تجھے اپنے سینے پر
اور آج اتار نہیں پاتا

بددعا دیتا ہوں آج، کہتا ہوں: غلط ہے، اب اُتر جا
پھر چاہتا ہوں شروع سے
چاہتا ہوں کھڑے ہونے کو جیسے کھڑا ہوتا ہے انسان

پھسل جاتا ہے دن ہاتھوں سے سوراخوں میں رات

میں سوچتے ہو یہ سمجھا ہیں تے وقت تمھارے دل کی بات

بے جسم میں کوئی نئی سوچ بھی جاگی ہی نہیں

نظر نہ آنے والی روشنی سے ہر پل گھبراہوا

کس کو پوجا گیا تھا اتنے دن

اکیلے ہو جا، اکیلے ہو جا، اکیلے ہو جا

جوانی

جب دروازے کے درمیان پرندوں کی اڑان کے سائے

ہماری آخری ملاقاتوں کی یاد

ایک نیگرو دوست کو خط

رچرڈ، میرے الفاظ میں ہے تیرا نام

رچرڈ، رچرڈ

کون ہے یہ رچرڈ؟ کوئی نہیں۔ رچرڈ میرا لفظ نہیں

رچرڈ، میرے خوابوں میں ہے تیرا نام

رچرڈ، رچرڈ

کون ہے یہ رچرڈ؟ کوئی نہیں۔ رچرڈ میرا خواب نہیں

Scanned with CamScanner

رچرڈ، میرے غموں میں ہے تیرا نام
رچرڈ او رچرڈ
کون ہے یہ رچرڈ؟ کوئی نہیں۔ رچرڈ میرا غم نہیں

باؤل[1]

کہا تھا تمھیں لے کر جاؤں گا اور دور کہیں
سوچتا ہوں میں اب بھی وہ بات
زندگی کے ساتھ۔ وہ مایا نکل جاتی ہے دور دراز
سوچتا ہوں میں اب بھی وہ بات
شکست جو تم سے ملی
زندہ وہ رہے گا پھر کیسے
اندر باہر دیکھو، نا آسودگی آسودگی
جوڑے میں ہی مل پاؤ گے ان سے

بے غرض تو نہیں ہو تم، سمجھتا ہوں
جس کے در سے کھلتا ہے اپنا دل، جس کھولنے کے معنی ہیں
کچھ اور دیکھتا ہوں نیند میں، آسمانی رنگ
ڈوریوں میں روشنی کے پھول

---

1 باؤل: گاؤں گاؤں گھوم کر اپنا صوفیانہ اور عاشقانہ کلام گا کر سنانے والے شاعر۔

Scanned with CamScanner

باندھ نہیں پاتا کبھی جس کی

شعلے سی میٹھی، عجیب سی بات، دیکھتا ہوں ایک بھی

داغ محبت کے بدن پر نہ تھا

کہا تو تھا، دور ہواؤں میں بکھیر دوں گا تجھے

سوچتا ہوں اب بھی وہ بات

دل کے تیرے اندھیرے میں مدہوش ہاتھ کی خوشبو گونجی

صحیح کہا تھا بھائی

سوچتا ہوں میں اب بھی وہ بات

**

نلنجن ہاجرا

بنگلہ سے ترجمہ: نلنجن ہاجرا / افضال احمد سید

نظم

بمبئی کی بندرگاہ کا
بھوتوں کا جہاز
خطرناک طوفان میں نہیں ڈوبتا
پانی کے نیچے چھپی ہوئی
چٹان میں
نہیں پھنس جاتا
برف کے تودے سے ٹکرانے سے
دو ٹکڑے نہیں ہو جاتا

اس کے اشارے پر
کوئی انقلاب برپا نہیں ہوا

اس کی یادداشت میں
کوئی ہیجان خیز شکست نہیں ہے

Scanned with CamScanner

اس میں
ششدر کر دینے والے 70 ملی میٹر بوسوں
یا آنسوؤں کے ڈولبی ساؤنڈ کا
مال تجارت نہیں ہے

کہر میں
اچانک اس کو دیکھ کر ڈر مت جا
اس سے
پرچم زادے
تباہ کن گولے نہیں پھینکا جاتا

پرچم چھپاکے قزاق اس میں سے
کود کر نہیں نکل آتے
یہ غیر قانونی طور پر
افیم نہیں لے جاتا

یہ صرف
بغیر کسی بندرگاہ کا
جوتوں کا جہاز ہے

Scanned with CamScanner

نظم

کیا کر رہے ہو؟
آسمان کو رنگ رہا ہوں

اتنی جرأت کیسے ہوئی؟
محبت کا پرچم اڑانا چاہتا ہوں

محبت کا کیا رنگ ہے؟
سیاہ، گہرا سیاہ

یہ رنگ کیوں چنا؟
تم نے جو آگ کا رنگ نفرت کو دے دیا ہے

اور کیا وجہ؟
اور آنسوؤں کو سبز کر دیا ہے

اور؟
بے شرم خاموشی کو تم نے نیلا بنایا ہے

اس کے علاوہ اور؟
ظلم کو بے داغ سفید کیا ہے

Scanned with CamScanner

محبت کا پرچم اڑانا چاہتا ہوں

نظم

میں نے سب کے ساتھ
آواز ملا کر گانا شروع کیا

سب نے تنگ آ کر کہا
تم نے گیت آخری بول سے کیوں شروع کیا

میں نے کہہ ڈالا
نفرت اور گیت دائرے کی طرح ہوتے ہیں

وہ لوگ
دو گروہوں میں بٹ گئے
دائرے کی ابتدا اور انتہا ڈھونڈنے لگے

دونوں گروہ ایک دن پہنچ گئے
تمھارے دل تک

Scanned with CamScanner

نظم

میں اُس سے باتیں نہیں کرتا
اس ٹالی گنج کے نالے کے پاس کی بستی کی
لڑکی سے
جو اوس میں ٹھنڈی آنکھیں لیے
ہسپتال کے موڑ پر کھڑی ہے
میں اس سے باتیں نہیں کرتا

اور شام بازار محلے کی
لڑکی سے
جس نے سالٹ لیک کے نئے گھر میں ہجرت کی
اس کے ساتھ بھی میں کوئی باتیں نہیں کرتا

اور یہ ٹالی گنج کے نالے کے پاس کی بستی
ہٹ گئی ہے دوسرے نالے کے پاس
شہر اور میٹرو ریل کی سرحد میں
اضافہ کرنے کے لیے

اور شام بازار کا محلہ
کسی اور کنڈوول میں کوئی محلہ
دریافت نہیں کر سکا

اور یہ میٹرو ریل
مجھے جلد نالی گنج بازار پہنچا دے گی

اور یہ میٹرو ریل
مجھے کسی دن بھی نہیں پہنچا پائے گی
کسی دن گنج کے نالے کے پاس کی بستی کی اُس لڑکی کے پاس
اور شام بازار محلے کی اُس لڑکی کے پاس
ایک بار
یا اور ایک بار

دوسری زبانوں کے ناول

قلبِ ظلمات

جوزف کونریڈ

انگریزی سے ترجمہ: محمد سلیم الرحمٰن

Rs.80

تمس

بھیشم ساہنی

ہندی سے ترجمہ: شہلا نقوی

Rs.100

نوکر کی قمیض

ونود کمار شکل

ہندی سے ترجمہ: عامر انصاری، اجمل کمال

Rs.75

بوفِ کور

صادق ہدایت

فارسی سے ترجمہ: اجمل کمال

(نیا ایڈیشن زیرِ طبع)

عمارتِ یعقوبیان

علاء الاسوانی

عربی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

خندہ اور فراموشی کی کتاب

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

وجود کی ناقابلِ برداشت لطافت

میلان کنڈیرا

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

کرپشن

طاہر بن جلون

انگریزی سے ترجمہ: محمد عمر میمن

(زیرِ طبع)

Scanned with CamScanner

زاہد امروز

غیر متوقع بچے کی متوقع موت

وہ عورت جسے ماں کہا جا سکتا ہے
ذرا سی زود عمل ہوتی
تو پہلی سانس سے پیشتر ہی
میں پانی میں بہہ گیا ہوتا

میں انھیں کبھی معاف نہیں کروں گا
جنھوں نے میری پیدائش پر چراغ جلائے
میری یہ الجھن ویسٹ بن نے سلجھائی
کہ میں سماعت سے محروم اور گویائی سے قاصر کیوں رہا
جنازہ گاہ میں پھیلی موت کی خوشبو
کبھی میرے لباس سے نہ گئی
عیدگاہوں میں بغل گیر ہوتے ہوئے
مجھے ہمیشہ پھوٹ پھوٹ کر روتا آیا
اگر وہ میری پیدائش سے پہلے مر گئی ہوتی
تو تمام عمر مجھے مردہ گیت نہ سننا پڑتے

Scanned with CamScanner

مجھے بے مصرف لوگوں نے بتایا
یہ ملک بن مانگے بچوں سے بھرا پڑا ہے
جن کی ماؤں کو کبھی مخلص مرد نہ ملا
جہاں لمس ہمیشہ محبت کو ترستا رہا
کاش کبھی میرے بدن کی نیند بیدار ہوتی
میں اپنی تازہ قبر کی گداز حدت محسوس کر سکتا
جہاں ایک اپنائیت ہمیشہ میری منتظر رہی

مجھے خبر ہے
روایت کا تحفظ کرنے کے لیے
میں شناختی کارڈ بننے سے پہلے مار دیا جاؤں گا

جس رات مجھے قتل کر دیا جائے گا
وہ عورت، جسے ماں کہا جا سکتا ہے
جو حفاظتی تدابیر کے بغیر
شناختی ادارے کے بڑے افسر کے ساتھ
بے ارادہ مدہوشی پہ رضامند ہو جائے گی

تم مسجد کے سائے میں سوکھ جاؤ گے

جب تم جمعہ پڑھ رہے ہوتے ہو
میں تیس دن کی اجلی روشنی میں

Scanned with CamScanner

کائنات کے [illegible] سے خوشبو کشید کر رہا ہوتا ہوں
میں اپنی چھت سے دیکھتا ہوں
ایوانِ صدر کے باغیچے میں رنگ نہیں ہیں
وہ خون میں زنجیر یاری میں تمہاری دھڑکنیں دفن ہیں

آسمان پر ایک ہی درخت ہے
جسے تمہارے سجدے سیراب کرتے ہیں
اپنی جبیں یہاں جتنی بھی کشادہ کر لو
اس کے پھل ہمیشہ کائنات سے باہر گر جاتے ہیں
بار بار آسمان مت دیکھو
آنسوؤں کی بیریں کاشت کرنے سے آنکھیں نہیں اگتیں
فوجی وردیوں کے سائے میں پروان چڑھی
اس صدی کو کیا معلوم
کہ تم پچھلی نسل کا کمایا ہوا خسارہ ہو

میں سفید پھولوں کے اس باغ کا خدا ہوں
جو میرے وجود میں بے مہار اگ آیا ہے
پھر بھی آوازوں کے عجائب گھر میں
میرے آنسوؤں کی کوئی گنتی نہیں

جب دھرتی مجھے واپس بلائے گی
میں اپنی بینائی ان پھولوں کو دے جاؤں گا
جو اس وطن کی زندہ قبر پر اگے

Scanned with CamScanner

اور میری اداسیوں پر مسکراتے رہے

سرزرد مینڈکوں کی دوستی اب بے مصرف ہے
تمھارے چہرے پر برص پھیل رہا ہے
آؤ تمھاری بنجر روح میں بہار پھونکنے کے لیے
کچناروں کی تازہ کونپلیں چننے چلیں

شہری روشنیوں میں وحشی خواب

جب تمام روشنیاں سو جاتی ہیں
اور دوست نیند کی گٹھڑی اٹھائے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں
نیلی شام اپنی آنکھوں سے نکل کر
اداس گلیوں میں بے لباس ہو جاتی ہے
کچے انڈے کی زردی سا سورج
اڑتے پرندوں کے پروں میں ڈوب جاتا ہے
اور بلیاں اپنی جماہیوں میں کود جاتی ہیں
میں بھی کھڑکیوں سے جھانکتا ہوں
اور نیم وحشی خواب اٹھائے باہر نکلتا ہوں

مسکراتے بازاروں کی دھیمی بھنبھناہٹ سے گزرتے ہوئے
ساحل مجھے آوازیں دیتا ہے
جہاں سمندر کے دوسرے کنارے پر

میں اپنے تاریک وطن کو دیکھتا ہوں
میرا معصوم خوبصورت وطن
جہاں سوچوں میں گیدڑ بیٹھے ہیں
بے کسی اپنے باسی دانتوں سے ہمیں کاٹتی ہے
جہاں گھٹن ہر رات کئی جذبوں کا قتل کرتی ہے
ہوٹلوں کی غلیظ کرسیاں ایک محرومی پر آزردہ رہتی ہیں
اور روزانہ ایک دہشت گلیوں میں لاشیں پھینک جاتی ہے
تب میں بے اختیار پانی کی گہرائی چاہتا ہوں

سمندر کا سریلا گیت
شانت لہجے میں تمہارا انتظار کر رہا ہوتا ہے
تمہارے آنے تک
میں ان گنت راستوں سے ملاقات کرتا ہوں
اور رنگین خواب سے تمہارے وجود میں کھو جاتا ہوں
یہاں ایک شانتی مجھے بار بار چومتی ہے
روشنی مجھے بانہوں میں بھر لیتی ہے
میں تمہاری عظیم دنیا کا باشندہ بن جاتا ہوں
تب کوئی دھن پرائی نہیں لگتی
کوئی سمت اجنبی نہیں رہتی
تمہاری سفید جلد میری آنکھوں کی چاندنی بنتی ہے
اور میرا آنند رس تمہیں قوس قزح بنا دیتا ہے
اس نئی دنیا میں آزاد پھرتے ہوئے
ہم نئی منزلوں کی دریافت، کئی راستوں کا چاند بنتے ہیں

کہ اچانک میرے بدن میں غیر متوقع دھماکے کی آواز
ہمارے وجودوں میں لکیریں کھینچ دیتی ہے
میری سوچ میں کیڑے رینگنے لگتے ہیں
قبریں مجھ پر قہقہے لگاتی ہیں
اور میں پھر ... تم سے دور ہوا
اپنے ہی وحشی خواب کا ایندھن بن جاتا ہوں

ڈوبتا سورج اور خالی قبر

کوئی گیت مجھے نہیں گنگنا رہا
کوئی دھن میری ترجمانی نہیں کر رہی
کوئی خواب مجھے نہیں دیکھ رہا
مسکراہٹ کے پیچھے ایک بے اطمینان دھڑکن
ادھورے پن کے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی ہے

تمہاری لاش میرے وجود میں لیٹی ابھی تک سو رہی ہے
میں کسی سمت نہیں بھاگ سکتا
تم مجھے چاروں اطراف سے گھیر لیتی ہو
ایک غیر متوقع موت کی گود میں لیٹے ہوئے
میں بے قابو ہوتے ہوئے تیرے درد سے تڑپنے لگا ہوں

ایک بے بسی مجھے دہرا رہی ہے
کون میری سانسوں کا چور
میرے برفیلے وجود میں اتر آیا ہے؟
جب آنسوؤں میں بجلی سمٹی
میرے برف ہوتے راڈوں میں گونج اٹھے گی
میں بہت قطرہ قطرہ
سانس کی آہستگی کے ساتھ
تمھاری لاش میں جذب ہو جاؤں گا

رات اور چاند کی سنگت میں

سوئے شہر کی زخمی روح میں
جب رات کی گہری خاموشی ڈرانے لگتی ہے
چوک کے روشن بلب کے نیچے
میں بھٹکے سایوں کو اپنی تنہائی کے گیت سناتا ہوں
اور بلب سے کہتا ہوں
دیکھ میرے شیشے کے مصنوعی چاند
دیکھ مجھے
بازاروں میں پھرتے پاگل بڈھے کی دانش
اور سڑک پر گرے پڑے آوارہ کتے کی آنکھیں
جن میں چاند اور چیزوں کے مردہ خواب سلگتے ہیں
میرا درد سمجھتی ہیں

دروازے کے پاس گرے سنبل کے بوجھل پھولوں میں
میری مرجھائی آواز پڑی ہے
میں کیچڑ سے آلودہ جوتوں میں سوتا ہوں
اور اس لڑکی کو اپنانے کی خواہش کرتا ہوں
جس کے بدن میں دیہی سیبوں کی باس رہتی ہے
جو سر پہاڑوں کے پیچھے ویران سڑک پر
بیوہ رات کے بنجر پن پر روتی ہے
تنہائی کی رہ بجھی تیلیوں میں بنی آنکھ پروتی ہے

میرے شیشے کے مصنوعی چاند
دیکھ مجھے
میں پھولوں اور پرندوں کا ہمزاد
مٹی کی زرخیزی کا ہمراز
لیکن من مرضی سے دو لمحے بھی جی نہیں سکتا
دو روحوں کو ایک بدن میں سی نہیں سکتا

مکھن کی ٹکیا سا چاند
میں جس کی لو میں دیکھتا ہوں
جینے کی حسرت میری سانس میں درد کی چٹکی ہوتی ہے
خوشی کسی آوارہ کتے کے خوابوں میں سوتی ہے

Scanned with CamScanner

قطب شمالی کا موسم سرما

(بانس بورلی کے لیے)

اس دن، زندگی کو ہم نے
اپنے گرد جمی سفید حقیقت میں دیکھ
دور افق تک پھیلی ایک سفید حسرت
ہمارے بے حس وجودوں میں حواس کی طرح اُتر گئی تھی

یہ زندگی کا پہلا تجربہ تھا
جمے ہوئے خاموش لمحے کے پاتال میں
کسی شکاری کی چاپ سنائی دی
اس دن کے بعد
ہم نے برفانی دنوں کی سردیاں
ایک بارہ سنگھے کے دل میں بسر کیں
اور باقی ماندہ زندگی
دور افق پر اڑتے سنہری پرندوں کے خواب میں

Scanned with CamScanner

انیس اشفاق

اعراف

بتانے والے نے کسی کو یوں بتانا شروع کیا:

اس ہسپتال کو، جسے شہر سے دور ایک سنسان مقام پر زمین کے ایک بہت بڑے قطعے پر بنایا گیا تھا، بہت کم لوگوں نے دیکھا تھا لیکن جن لوگوں نے دیکھا تھا ان میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا بندوبست کن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے۔ اس ہسپتال میں الگ الگ امراض سے متعلق کئی وارڈ تھے۔ انھیں میں ایک ایسا وارڈ بھی تھا جس کی طرف بہت کم لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ یہ وارڈ باہر سے بہت پرانا اور بوسیدہ نظر آتا تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ اس وارڈ میں صرف دو بستر تھے اور ان دو بستروں پر دو ایسے مریض تھے جنھیں گمنام علاقوں سے لایا گیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان مریضوں کو وہاں رہتے ہوئے برسوں گزر چکے ہیں لیکن ابھی تک وہ شفایاب نہیں ہوئے ہیں، اور اسی لیے ابھی تک انھیں اس ہسپتال سے چھٹی نہیں دی گئی ہے۔ وارڈ کی طرف آنے جانے والے بتاتے ہیں کہ انھوں نے وہاں کبھی کسی معالج کو نہیں دیکھا۔ لیکن وارڈ کے مریض اپنے معالجوں کو اچھی طرح جانتے تھے۔ مریضوں کی نگہداشت کرنے والی نرسیں بھی وہاں کبھی نظر نہیں آئیں لیکن مریضوں کے آس پاس قرینے سے رکھے ہوئے سامان کو دیکھ کر صاف معلوم ہوتا تھا کہ نرسیں مریضوں کی نگہداشت کرتی رہتی ہیں۔ وارڈ کی صفائی کرنے والے مہتروں اور جمعداروں کو بھی کبھی کسی نے نہیں دیکھا لیکن وارڈ کے اندر کبھی گندگی نظر نہیں آئی۔

ان مریضوں کو جو گمنام علاقوں سے یہاں لائے گئے تھے، یہ نہیں معلوم تھا کہ انھیں یہاں

شامل نہ کیا گیا ہو۔ یہ دونوں کی طرح ایک مدت تک وارڈ میں رہنے کے بعد بھی ان سے کسی نے نہیں پوچھا تھا کہ وہ کب سے مرض میں مبتلا ہیں اور ان مریضوں سے بھی آپ معالجوں نے بھی نہیں پوچھا کہ ان کا مرض کیا ہے اور یہ جاننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ انھیں یہاں سے کب چھٹی ملے گی۔ ان دونوں مریضوں نے اس وارڈ کو اپنا دائمی ٹھکانا سمجھ لیا تھا اور اب انھیں اپنے شفایاب ہونے کی بھی کوئی فکر نہیں تھی۔

بتانے والے نے آگے بتایا:

اس وارڈ کی طرف کبھی کبھی آنے والے معالجوں میں سے ایک معالج نے اپنی یادداشتوں میں ان مریضوں کا حال اس طرح قلمبند کیا ہے:

"مجھے اس وارڈ کے معالجوں میں سے ایک معالج کے طور پر مقرر کیا گیا تھا۔ پہلی بار جب میں اس وارڈ میں داخل ہوا تو میں نے دو بستروں پر دو بہت کمزور اور نحیف مریضوں کو لیٹے ہوئے پایا۔ میرے داخل ہوتے ہی دونوں نے ایک پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ میری طرف دیکھا۔ میں نے ان کی کیفیت معلوم کی تو وہ خاموش رہے۔ میں نے ان کا معائنہ کیا، ضروری ہدایتیں دیں اور کچھ دوائیں تجویز کیں۔ میں جب تک ان کے پاس موجود رہا، وہ دونوں کوئی لفظ بولے بغیر مسکراتے رہے۔ معائنے کے بعد جب میں اٹھ کر چلنے لگا تو دونوں میں سے کسی نے اپنی بیماری کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں پوچھا۔ لیکن اگر وہ پوچھتے بھی تو میں انھیں کچھ نہ بتا پاتا، کیونکہ مجھے خود بھی نہیں معلوم تھا کہ ان کا مرض کیا ہے۔ جتنی دیر میں ان کے پاس بیٹھا رہا، ان دونوں نے آپس میں کوئی بات نہیں کی۔ دونوں کی صورتیں الگ الگ تھیں لیکن دونوں کی آنکھوں میں ایک ہی طرح کی چمک تھی۔ بیماروں کی آنکھوں میں اس طرح کی چمک دیکھ کر مجھے حیرانی ہوئی۔ لیکن اس چمک کے پیچھے وہ اذیت بھی دکھائی دے رہی تھی جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ دونوں کے چہرے زرد ہو رہے تھے اور ان پر جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ ان جھریوں پر بہت باریک لکیریں ایک دوسرے کو اس طرح کاٹ رہی تھیں کہ ان کے چہروں پر چھوٹے چھوٹے خانے بن گئے تھے۔ دونوں کی آنکھیں دھنسی ہوئی تھیں اور ان کے گرد سیاہ حلقے پڑے ہوئے تھے۔ صاف رنگتوں والی ان عورتوں کی آنکھوں کے گرد پڑے ہوئے سیاہ

Scanned with CamScanner

حلقے بہت خوبصورت معلوم ہو رہے تھے۔ لیکن مجھے یاد ہے کہ ان سیاہ حلقوں کو دیکھ کر مجھے وہ پھندے یاد آنے لگے تھے جنھیں ماہر شکاری خطرناک اور خونخوار جانوروں کو قابو میں کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں نے فوراً ان کی طرف سے اپنی نگاہ ہٹا لی تھی۔ پھر میں نے ان کے جسموں پر نگاہ ڈالی، جہاں گوشت کے نام پر صرف ہڈیاں تھیں۔ ہڈیوں سے جھانکتے ہوئے ان کے جسم لوہے کی باریک تیلیوں سے بنے ہوئے کسی زنگ آلود پنجرے کے اندر قید خستہ حال پرندوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ وارڈ سے باہر نکلتے وقت ایک بار پھر میں نے انھیں پلٹ کر دیکھا۔ میرے اس طرح پلٹ کر دیکھنے پر وہ دونوں ایک ساتھ مسکرائیں۔ ان کی سرد اور سپاٹ مسکراہٹوں کو دیکھ کر خوف کی ایک سرد لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ میں تیزی کے ساتھ اس وارڈ سے باہر نکل آیا۔ اس دن کے بعد سے میں نے طے کر لیا تھا کہ اب میں ان مریضوں کو دیکھنے نہیں جاؤں گا۔ لیکن ہسپتال کے منتظمین کا حکم تھا کہ میں ان مریضوں کا خیال رکھوں اور انھیں یقین دلاتا رہوں کہ وہ جلد سے جلد صحت یاب ہو جائیں گے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی ہسپتال کے منتظمین کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہاں کے دوسرے معالجوں کی طرح مجھے بھی روز کے روز ہدایتیں مل جاتی تھیں کہ آج مجھے کن کن مریضوں کو دیکھنا ہے۔ لیکن ان مریضوں میں ہسپتال کے منتظمین کی خصوصی دلچسپی تھی۔ مجھے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ میری ہی طرح دوسرے معالج بھی اس وارڈ کے مریضوں کو دیکھنے آتے ہیں لیکن میں نے اپنے سوا کسی اور معالج کو وہاں کبھی نہیں دیکھا اور نہ ہی کبھی ان مریضوں نے مجھے بتایا کہ ان کے دوسرے معالج کون ہیں اور وہاں کب کب آتے ہیں۔ میں بہت دنوں تک اس ہسپتال میں معالج کے طور پر کام کرتا رہا اور جب میں نے وہ ہسپتال چھوڑا، اس وقت دونوں مریض اسی وارڈ میں موجود تھے۔"

بتانے والے نے یہ باتیں جیسے بتائیں، ایک دن یہ باتیں اس نے مجھے بتائیں۔ میں نے اس معالج کی یادداشتیں حاصل کریں اور انھیں پڑھنے کے بعد اس معالج کو شہر میں بہت ڈھونڈا لیکن نہ تو وہ مجھے کہیں ملا اور نہ کسی نے اس کے بارے میں مجھے ٹھیک ٹھیک بتایا۔ البتہ اس تلاش کے دوران ایک دن اتفاقاً مجھے اس ہسپتال کے معالجوں میں سے ایک اور معالج کے ہاتھ کے لکھے ہوئے

Scanned with CamScanner

کچھ ورق مل گئے۔ یہ معالج بھی اسی وارڈ کے لیے خصوصی طور پر مقرر کیا گیا تھا لیکن اس کے مندرجات میں ان مریضوں کا جو حال لکھا گیا تھا وہ پہلے والے معالج کی یادداشتوں میں لکھے ہوئے احوال سے مختلف تھا۔ اس معالج نے لکھا تھا:

''میں جس ہسپتال میں معالج کے طور پر مقرر ہوا ہوں وہاں ایک ایسا وارڈ ہے جو کسی مردہ گھر سے مشابہ ہے۔ باہر سے دیکھنے پر یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ اس کے اندر سانس لیتا ہوا کوئی مریض موجود ہے۔ میں نے اپنی پوری ملازمت میں کسی بھی ہسپتال کے کسی بھی وارڈ میں ایسی الم ناک ویرانی کبھی نہیں دیکھی۔ وارڈ کے آس پاس بہت سے درخت ہیں لیکن ان کی شاخوں پر پرندے کبھی نہیں بیٹھتے اور میں نے انسانوں کو بھی ان درختوں کے سائے میں بیٹھے ہوئے نہیں دیکھا۔ وارڈ کے دوسری طرف ایک وسیع میدان ہے جس میں دور تک کوئی درخت نظر نہیں آتا۔ یہ میدان اگرچہ اسی ہسپتال کا حصہ ہے لیکن اس پر کوئی عمارت نہیں بنائی گئی ہے۔ ہسپتال میں کام کرنے والے بتاتے ہیں کہ رات ہوتے ہی اس میدان پر سائے رینگتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ انھیں سایوں کے خوف سے دن میں بھی کوئی اس میدان کی طرف نہیں جاتا۔ لیکن وارڈ میں رہنے والے مریضوں کو اکثر میں نے اس میدان میں چہل قدمی کرتے دیکھا ہے۔ ایسا کئی بار ہوا کہ جب میں ان مریضوں کے وارڈ میں داخل ہوا تو انھیں وہاں سے غائب پایا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ ٹہلنے کے لیے میدان کی طرف گئے ہیں۔ دونوں مریض ایک ہی طرح کے تھے اور مرض کی تشخیص نہ ہونے کے باوجود ظاہری آثار کی بنا پر کہا جا سکتا تھا کہ دونوں ایک ہی مرض میں مبتلا ہیں۔ میں جب تک ان کے علاج پر مقرر رہا ان کے مرض کی تشخیص نہیں کر سکا لیکن وہ دونوں ایک دوسرے کے مرض کو سمجھتے تھے اور شاید وہ دونوں ایک دوسرے سے اپنے مرض کے بارے میں باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ میں نے اکثر انھیں ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھا تھا لیکن وارڈ میں داخل ہونے پر مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے انھوں نے اپنی گفتگو کا موضوع بدل لیا ہے۔ لیکن موضوع بدلتے بدلتے کچھ لفظ ان کی گفتگو میں ایسے آجاتے جن سے بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا تھا کہ ان کی پہلے کی گفتگو کا موضوع کیا تھا اور میں ان کی پہلے کی گفتگو کے موضوع کے بارے میں سوچ کر یہ سوچنے لگتا کہ یہ موضوع کیا رہا ہوگا۔ جو کچھ میں سوچتا وہ کچھ اس طرح ہوتا:

Scanned with CamScanner

''دونوں ابھی اپنی بیماری کے بارے میں بات کر رہے ہوں گے اور ان معالجوں کا مذاق اڑا رہے ہوں گے جو ان کا مرض معلوم کرنے اور انھیں پوری طرح ٹھیک کرنے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔ یا مرض میں بہت جلد مر جانے کے خیال سے وہ دونوں ایک دوسرے کی زندگیوں کے بارے میں بہت پوچھ گچھ کر رہے ہوں گے اور ایک دوسرے سے بات کر کے اور بھی اندر ہی اندر دکھ رہے ہوں گے۔ یا پوچھ رہے ہوں گے کہ مرض میں ابھی وہ اور کتنے دن تک زندہ رہیں گے۔''

معالج کی یادداشتوں میں آگے لکھا تھا:

''میں جب جب اس وارڈ میں جاتا، دونوں مریضوں کو خوش خوش ایک دوسرے سے باتیں کرتے دیکھتا۔ ان کی گفتگو کے موضوع بھی عجیب و غریب ہوتے۔ وہ عجیب الخلقت جانوروں کے بارے میں باتیں کرتے، ان خوفناک جنگلوں کا ذکر کرتے جہاں ہر وقت اندھیرا چھایا رہتا ہے اور جن کے گھنے اور لمبے درختوں سے خوفناک آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں، اور وہ ایسے سمندروں کے قصے سناتے جہاں ہر وقت سیاہ آندھیاں اٹھتی رہتی ہیں۔ میں نے انھیں ایسے پہاڑوں کے بارے میں بھی باتیں کرتے سنا جن کی چوٹیاں کٹے ہوئے سروں کی طرح معلوم ہوتی ہیں۔ ان کی بات چیت میں ایسی زمینوں کا بھی ذکر آتا جن پر آسمان سے ہمیشہ خون برستا رہتا ہے''۔

دوسرے معالج نے اپنی یادداشتوں میں بس یہیں تک ان مریضوں کا حال لکھا تھا۔

مریضوں کا یہ حال جان لینے کے بعد پہلے کی طرح میں نے اس معالج کو بھی شہر میں بہت تلاش کیا لیکن کوشش کے باوجود وہ کہیں نہ مل سکا۔ یہ بڑی حیرانی کی بات تھی کہ دونوں معالج اسی شہر کے تھے لیکن شہر میں کوئی ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ معالجوں کی یادداشتوں میں لکھے ہوئے مریضوں کے احوال نے میرے اندر ان مریضوں کو قریب سے دیکھنے کا اشتیاق پیدا کر دیا۔ میں اس ہسپتال کے بارے میں بالکل نہیں جانتا تھا جہاں یہ مریض داخل کیے گئے تھے، اس لیے سب سے پہلے میں نے اس ہسپتال کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ ہسپتال شہر سے دور ایک غیر آباد علاقے میں واقع ہے لیکن بتانے والوں کو ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم تھا کہ اس غیر آباد علاقے کی طرف شہر کا کون سا راستہ جاتا ہے۔ جب مجھے ہسپتال کی طرف جانے والے راستے کا کوئی سراغ نہیں

[illegible]

مجھے روک کر مجھ سے کہا:

''تم تو بیمار نہیں ہو؟''

"نہیں،" میں نے کہا۔

"پھر تم اندر نہیں جا سکتے، اندر صرف بیماروں کو لے جایا جاتا ہے،" اُن میں سے ایک پہریدار نے آگے بڑھ کر سختی سے کہا۔

"یہاں مریض کی دیکھ بھال باہری لوگ نہیں کرتے،" پہریداروں میں سے ایک بولا۔

"میں باہری نہیں ہوں،" میں نے کہا۔

"لیکن تم اندر کے بھی نہیں ہو،" سب سے آگے والا پہریدار بولا۔

"مجھے اُن مریضوں سے، جن کی دیکھ بھال کے لیے میں یہاں آیا ہوں، ملنا ہے،" میں نے کہا، اور پھر اُن پہریداروں کو مریضوں کی وہ تفصیل بتائی جو مجھے معالجوں کی لکھی ہوئی یادداشتوں سے حاصل ہوئی تھی۔ یقین کے ساتھ بتائی ہوئی میری تفصیل پر پہریداروں کو یقین آ گیا اور انھوں نے مجھے اندر جانے کی اجازت دے دی۔ اجازت ملتے ہی میں تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا اسپتال کے اُس حصے کو ڈھونڈنے لگا جس کا کچھ کچھ نقشہ معالجوں کی یادداشتوں میں پیش کیا گیا تھا۔ کافی دور چلنے کے بعد بہت کچھ فاصلے پر پھیلی ہوئی اسپتال کی عمارتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ یہیں سے ایک بڑا میدان شروع ہوتا تھا۔ یادداشتوں کے مطابق اسی میدان کے بعد اُن دونوں مریضوں والا وارڈ تھا۔ میں نے میدان کے اُس طرف نگاہ دوڑائی تو مجھے دھندلی دھندلی سی ایک عمارت نظر آئی۔ میں نے جلدی جلدی اُس میدان کو طے کرنا شروع کیا۔ جیسے جیسے میدان ختم ہوتا جاتا، مریضوں والی عمارت کے نقوش واضح ہوتے جاتے، یہاں تک کہ میں وارڈ کے بالکل قریب پہنچ گیا اور اب میں نے دیکھا کہ درختوں کے ایک جھنڈ کے پیچھے جو عمارت موجود ہے اُس کی دیواریں جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہیں اور اُن پھٹی ہوئی جگہوں میں کچھ پیڑ اُگ آئے ہیں جن کی جڑوں نے اُن پھٹی ہوئی جگہوں میں دراڑیں اور بھی پیدا کر دی ہیں۔ وارڈ کی دیواروں پر جگہ جگہ کائی جمی ہوئی تھی اور جہاں کائی نہیں تھی وہاں پھٹی ہوئی دیواروں سے پانی رسنے کی وجہ سے نمی کے نشانات صاف نظر آ رہے تھے۔ وارڈ کا بیرونی دروازہ بہت پرانے زمانے کا معلوم ہوتا تھا جس کے دونوں پٹوں کے درمیانی حصوں پر جہاں وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے، لوہے کے دو بڑے بڑے کڑے لٹک رہے تھے۔ انھیں کڑوں میں قفل جیسا کچھ ڈال کر دروازے کو مقفل کیا جاتا ہوگا۔ دروازے کے دونوں پٹوں پر بہت عمدہ قسم

کی علامت سی کھنی گئی تھی لیکن اس کا بڑا حصہ مٹ چکا تھا۔ جو تھوڑی سی باقی رہ گئی تھی، اس سے اس کی عمدگی کا اندازہ ہوتا تھا۔ ہسپتال کی نئی طرز کی عمارتوں کے مقابل اس چہار دیواری میں یہ پرانی طرز کی عمارت عجیب سی معلوم ہوتی تھی اور اسی لیے یہ خیال گزرتا تھا کہ ہسپتال بننے سے پہلے یہ عمارت اس میدان میں موجود رہی ہوگی اور اسی عمارت سے چہار دیواری والے میدان کی شناخت کی جاتی رہی ہوگی، اسی لیے ہسپتال کے منتظمین نے میدان کی پرانی شناخت کو باقی رکھنے کی غرض سے اسے منہدم کرنے کے بجائے ایک وارڈ میں بدل دیا۔

وارڈ کے دروازے پر پہنچ کر میں ایک لمحے کے لیے رکا۔ اندر داخل ہونے سے پہلے میں نے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ عمارت کے آس پاس کوئی نہیں تھا۔ یہاں تک آنے والا اور یہاں سے آگے جانے والا راستہ خالی پڑا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں سے اس طرف سے کسی کا گزر نہیں ہوا ہے۔ دروازے پر کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد میں ذرا ذرا سا اندر داخل ہوا اور اندر میں نے وہی دیکھا جو مجھے یادداشتوں میں دکھایا گیا تھا۔ دو الگ الگ بستروں پر وہ دونوں مریض لیٹے ہوئے تھے۔ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید یہ ان کے آرام کا وقت تھا۔ صاف اور سفید چادروں پر لیٹے ہوئے دونوں مریض دو مقدس بچوں کی طرح معلوم ہو رہے تھے۔ مریضوں سے اپنی نگاہ ہٹا کر میں نے پورے وارڈ کا جائزہ لینا شروع کیا۔ وارڈ بہت بڑا تھا جس کے ایک حصے کے بیچوں بیچ بچھے ہوئے دونوں مریضوں کے پلنگ تھے۔ دوسرے حصے میں ایک میز تھی جس کے ایک طرف تین کرسیاں تھیں اور دوسری طرف ایک بڑی کرسی۔ یہ نرسوں اور معالج کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ مریضوں کے بستروں کے پاس پلنگ کی اونچائی کی تپائی نما الماری تھی جو عموماً وارڈوں میں مریضوں کے کھانے پینے کی چیزوں کو رکھنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔ اس الماری کے پہلو میں مٹی کا ایک ستون بھی تھا جس کے اوپر کا گول حصہ خاصا پھیلا ہوا تھا۔ ستون پر ایک طرف ایک صراحی رکھی تھی جس کے منھ کو سفید رنگ کے ایک چھوٹے سے جالی دار کپڑے سے ڈھک کر اس پر خوبصورت نقش و نگار والے تانبے کے ایک کٹورے کو اوندھا رکھ دیا گیا تھا۔ ستون کے بیچوں بیچ خوشنما بیل بوٹے والی چینی کی طشتریوں میں کچھ پھل اور میوے رکھے تھے اور ستون پر ایک منقش گلدان تھا۔ دوسری جانب کے پاس ایک چھوٹا سا آئینہ جس کی پشت پر کے بیشتر حصے کا پارہ اپنی جگہ چھوڑ چکی تھی۔ دونوں

[illegible] مجھے بڑی حیرت ہوئی [illegible] ... صاف [illegible] ... تھیں [illegible] ... تھی، [illegible] ... جانے والی [illegible] کی تفصیل تھی [illegible] حالتوں کے اندراجات تھے۔

[illegible] کرتے میں نے [illegible] میں نے بہت کم عمارتوں میں دیکھی تھی [illegible] کر رہی تھی [illegible] بڑے حصے میں صرف [illegible] اور [illegible] ویرانی [illegible] دو بڑی پنکھے ایک خاص طرح کی [illegible] پڑی ہوئی گرد صاف نظر آ رہی تھی۔ [illegible] کی خاص طرح کی آواز سے ایک عجیب سا خوف [illegible] آنے کا وقت قریب آ پہنچا تھا [illegible] کے گزرنے کے بعد بھی [illegible] آنکھ کھل گئی۔ بیدار ہوتے ہی [illegible] ایک ساتھ مجھ سے پوچھا:

"[illegible] ہو؟"

"[illegible]" میں نے ایسے ہی کہہ دیا۔

[illegible] ان میں سے ایک [illegible] ہوئے بولا۔ "تم [illegible]

[illegible]۔"

"[illegible]" اب میں نے اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے [illegible] دے کر کہا۔

"تو ... [illegible] ... ہو؟" وہ ... [illegible]

... بھی میں نے ... [illegible] ...

... [illegible] ...

... میں ... [illegible] ... [illegible]

گئے ہیں۔

میری اس بات پر وہ دونوں ہنس دیے۔

"تمہارے پہلے والے معالج کہاں ہیں؟" پہلے مریض نے پوچھا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

وہ ... [illegible] ... "ہمارے بہت سے معالج ... [illegible] ... بتانے میں کامیاب نہیں ہوا۔"

"تم جیسے..." اب میں نے سچ بتا دینے ہی میں ... [illegible] ... آپ کا معالج نہیں ہوں۔"

"پھر کون ہو تم؟"

"میں صرف... یہ دیکھنے آیا ہوں کہ آپ کے پہلے معالج نے..." ... [illegible] رکھتے ہوئے میں نے کہا، "جو کچھ آپ کے بارے میں لکھا ہے، وہ ٹھیک ہے یا نہیں۔"

"لیکن پہلے والے معالج ہیں کہاں؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

"بتانا... مجھے نہیں معلوم، میں نے ان کی یادداشتوں میں آپ کا حال پڑھا ہے۔"

"انھوں نے ہمارے بارے میں کیا لکھا ہے؟"

"وہی جو انھوں نے یہاں دیکھا تھا۔" یہ بتانے کے بعد میں نے کہا، "لیکن ایک بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔"

"وہ کیا؟" دونوں ایک ساتھ بولے۔

"ان معالجوں نے ایک سی بات نہیں لکھی ہے۔"

"ایک سی بات لکھ بھی نہیں سکتے۔" پہلا مریض بولا۔ دونوں ... [illegible]

تھے۔"

"یہ بات نہیں ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

"آپ کے بارے میں ان کے بیانات الگ الگ ہیں۔"

"مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ایک معالج کا بیان دوسرے سے مختلف ہے،" میں نے کہا۔ پھر ان سے پوچھا،

"مجھے یہ بتائیے کہ وارڈ کے دوسری طرف کوئی میدان ہے؟"

"میدان؟" دونوں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں ایک ساتھ کہا۔ پھر بولے، "میدان تو کوئی نہیں ہے۔"

"لیکن دوسرے معالج نے اس میدان کا حال لکھا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ دونوں وہاں چہل قدمی کے لیے جایا کرتے تھے۔"

"ہم کسی میدان ویدان میں نہیں جاتے۔ بستر سے کبھی اترتے بھی ہیں تو اسی وارڈ میں رہتے ہیں۔"

"تو دوسرے معالج کا بیان غلط ہے؟"

"یہ اس کے ذہن کی اپج ہے۔"

"خیر، چھوڑیے ان باتوں کو، یہ بتائیے کہ آپ لوگوں کے لیے کوئی اور معالج مقرر ہوا؟"

"نہیں۔ مگر ہم نے آج سے تمھیں اپنا معالج مان لیا۔"

"علاج معالجے سے میرا کوئی تعلق نہیں،" میں نے کہا۔ پھر کہا، "آپ کہیں تو میں آپ کی تیمارداری کر سکتا ہوں۔"

"ہمیں کسی تیماردار کی ضرورت نہیں ہے،" ان میں سے ایک بولا۔ پھر بولا، "معالج ہی ہمارا تیماردار ہے۔"

"اور وہ بھی مقرر نہیں ہوا،" میں نے اس کا جملہ ختم ہوتے ہی کہا۔

"ہو بھی گیا تو کیا فائدہ۔ مرض کا تو ہمارے پتا چلتا نہیں،" دوسرے مریض نے بہت بیدلی

Scanned with CamScanner

سے کہا۔

"لیکن معالج کی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ دوائیں آپ کو دی جاتی ہیں۔"

"دی جاتی ہیں، اور ہم یہ جانے بغیر کہ ہمارا مرض کیا ہے، انہیں استعمال بھی کرتے ہیں۔"

پہلا والا بولا۔

"آپ دونوں یہاں کب سے ہیں؟" میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

"ہمیں نہیں معلوم۔ لیکن آنے جانے والے بتاتے ہیں کہ جب سے یہ ہسپتال بنا ہے ہم اس وقت سے یہاں ہیں۔"

"اور آپ کی رہائش؟" میں نے مزید پوچھا۔

"یہیں رہتے ہیں۔ اور جب تک زندہ ہیں شاید یہیں رہیں گے۔" [illegible]

"میرا مطلب ہے کہ آپ لوگ یہاں آئے کہاں سے؟"

"ہمیں کہیں سے لایا گیا تھا۔ کہاں سے لایا گیا تھا یہ نہیں معلوم۔" [illegible]

باتوں کے دوران وہ دونوں مریض اپنی دوائیں بھی کھاتے رہے [illegible] کے لیے وہ پان بھی کھاتے رہے جو بچے پلاسٹک کی تھیلیوں میں [illegible] تھے۔

میں بہت دیر تک اُن دونوں مریضوں سے باتیں کرتا رہا اور اُن کے معالج کے آنے کا انتظار کرتا رہا لیکن بہت دیر تک انتظار کرنے کے بعد بھی ان کا معالج نہیں آیا۔ میں نے سوچا کہ اب مجھے چلنا چاہیے، اور یہ سوچ کر جیسے ہی میں نے اٹھنے کا ارادہ کیا، دونوں مریض ایک ساتھ بولے

"بیٹھو۔ اتنی جلدی کیا ہے"۔

"اب مجھے چلنا چاہیے۔" میں نے کہا۔

"تم یہیں رہ سکتے ہو، ہمارے ساتھ۔"

"لیکن..." یہ کہہ کر میں نے پورے وارڈ پر اس طرح نگاہ ڈالی جیسے پوچھ رہا ہوں سوؤں گا کہاں۔

رہتے تھے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا ... دونوں مریضوں سے تھا "ہم میں سے کسی کو اعتراض ہوگا تو چلے جانا۔"

اور پھر جس سے مجھے یہ جواب اور ایک تکیہ دے دیا۔ اور میں اس سے میں اسی وارڈ میں ان کی دیکھ بھال کرنے لگا۔ اور جب مجھے ان کی دیکھ بھال کرتے کئی دن ہو گئے اور دوائیں ختم ہونے لگیں تو مجھے یہ فکر ستانے لگی کہ ... کیا ہوگا۔ جب یہ فکر شدید بڑھنے لگا تو میں نے ان سے کہا:

"معالج کہیں آئے؟"

"آئے گا۔" دو بولے۔

"دوائیں ختم ہو رہی ہیں" میں نے تشویش جتائی۔

"دوائیں ختم ہونے سے پہلے آئے گا، اور دوائیں بھی لائے گا۔" انھوں نے بڑے یقین کے ساتھ کہا۔

"آپ کو کیسے معلوم؟"

"ہم ہسپتال کے طور طریقوں سے واقف ہیں، یہاں سب کام اسی وقت ہوتے ہیں جب انھیں ہونا چاہیے۔"

"تو معالج آئے گا؟"

"ضرور آئے گا۔"

یہ سن کر میں چپ ہو گیا۔ اب مجھے اس میدان کو دیکھنے کی فکر تھی جس کا ذکر کرتے ہوئے دوسرے معالج نے بتایا تھا کہ دونوں مریض اکثر وہاں چہل قدمی کے لیے جایا کرتے ہیں۔ لیکن جب سے میں اس وارڈ میں آیا تھا، یہ دونوں مریض اس میدان کی طرف نہیں گئے تھے۔ میں نے طے کیا کہ میں اس میدان کو اس وقت دیکھنے جاؤں گا جب یہ دونوں مریض آرام کر رہے ہوں گے۔ اور جب ان کے آرام کا وقت آیا، میں دوسرے معالج کے بتائے ہوئے راستے کے مطابق اس میدان کو دیکھنے نکل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے واقعی ایک میدان نظر آیا لیکن یہ نظر نہیں آیا کہ وہ میدان کہاں جا کر ختم ہوتا ہے۔ اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ میدان کہاں ختم ہوتا ہے، میں اس میدان میں

[illegible]

[illegible]

[illegible]

"ہم لوگ... کہاں تھے؟"

"میدان میں۔" یہ سن کر وہ دونوں ہنس دیے۔

"ہم یہاں سے نکلے ہی نہیں۔"

"لیکن آپ وہاں تھے۔"

خاموشی۔

"آپ وہاں تھے۔ میں نے آپ دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

"ہم وہاں نہیں تھے۔" انھوں نے زور دے کر کہا۔ پھر مجھے تنبیہ کرتے ہوئے کہا، "اب اس میدان کی طرف مت جانا۔"

"کیوں؟"

"طلسم ہے۔ [illegible] پورے میدان میں ایک طلسم ہے، اس طرف کوئی نہیں جاتا۔"

"لیکن میں تو گیا۔"

"گئے تو گئے، لیکن آئندہ مت جانا۔"

"لیکن کیوں؟"

Scanned with CamScanner

"ہم کچھ زیادہ نہیں جانتے لیکن بتانے والے بتاتے ہیں کہ یہاں ان مریضوں کی روحیں بھٹکتی ہیں جو یہاں صحت یاب ہونے کے لیے آئے تھے۔"

اس کے بعد میں نے ان سے کوئی سوال نہیں کیا۔ اپنی چٹائی بچھائی اور تکیہ سر کے نیچے رکھ کر لیٹ گیا۔ لیٹتے ہی مجھے ان مریضوں کی دواؤں کا خیال آیا لیکن اس سے پہلے کہ میں ان مریضوں سے ان کی دواؤں کے بارے میں پوچھتا، میں نے دیکھا کہ ان کے پاس اگلے کئی دنوں کی دوائیں موجود ہیں۔ نئی دوائیں دیکھ کر میں نے ان دونوں کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔ میرے اس طرح دیکھنے پر ایک مریض بولا:

"معالج آیا تھا۔"

"کب؟" میں نے پوچھا۔

"جب تم میدان کی طرف گئے تھے۔"

"آپ دونوں کو دیکھا؟"

"ہاں۔"

"کچھ پتا چلا مرض کا؟"

"نہیں، چلنے کا بھی نہیں۔"

"دوائیں بدلیں؟"

"نہیں، وہی پہلے والی دوائیں ہیں۔"

باتیں کرتے کرتے میں نے محسوس کیا کہ ان مریضوں کے بستروں کی چادریں بہت صاف ہیں۔ انھیں شاید کچھ دیر پہلے بدلا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وارڈ میں ہر طرف صفائی تھی اور فرش بھی دھلا دھلا سا معلوم ہو رہا تھا۔ مریضوں کے اسٹولوں پر چیزیں بھی سلیقے سے رکھی ہوئی تھیں اور معالج کی میز کا سامان بھی قرینے سے لگا تھا۔ اس پر رکھے ہوئے کاغذوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ابھی ابھی رکھا گیا ہے۔ میں نے قریب سے ان کاغذوں کو دیکھا تو ان میں مریضوں کی حالتوں کے تازہ اندراجات تھے۔ میں ان اندراجات کو پڑھ سکتا تھا لیکن پڑھ کر یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ یہ تحریریں مرض سے متعلق ہیں یا دواؤں سے۔ میں جان لیوا امراض میں دی جانے والی بہت سی دواؤں سے

Scanned with CamScanner

بارے میں جانتا تھا لیکن کاغذوں کے اندراجات میں ان میں سے کوئی دوا موجود نہیں تھی۔

مریضوں سے باتیں کرنے اور روز کی بدلی ہوئی حالت کا جائزہ لینے کے بعد میں پچھلے پہر اپنی چٹائی پر آ کر لیٹ گیا۔ میں نے سونے کا ارادہ کیا لیکن نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ پھر بھی میں آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔ چٹائی پر کئی طرح پڑے پڑے بہت سا وقت گزر گیا۔ رات بہت سو چکی تھی لیکن دونوں مریض جاگ رہے تھے۔ ان دونوں کی آوازیں میرے کانوں میں آ رہی تھیں۔ مجھے سوتا ہوا جان کر وہ دونوں دھیمی آواز میں باتیں کر رہے تھے لیکن میں ان کی سرگوشیاں صاف سن سکتا تھا۔ وہ دونوں اپنی آئندہ کی زندگیوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ ان کے نزدیک یہ زندگیاں انہیں مر جانے کے بعد ملنے والی تھیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ دونوں ایسی دنیاؤں میں پہنچ گئے تھے جنہیں ان زمینوں پر نہیں دیکھا جا سکتا۔ ان دنیاؤں میں وہ سفید لباسوں میں ملبوس ایسے لوگوں کو دیکھ رہے تھے جن کے گرد روشنیوں کے ہالے تھے۔ وہ ان دنیاؤں میں ایسے شاداب جنگلوں میں گھوم رہے تھے جن کے درختوں کی شاخوں پر یاقوت آویزاں تھے۔ وہ ایسے باغوں کی سیر کر رہے تھے جن کی نہروں کے شفاف پانیوں میں نیلے آسمان کا عکس صاف نظر آ رہا تھا جس میں اڑتی ہوئی بدلیوں کے سنہرے پروں پر ستارے چمک رہے تھے۔ اور وہ ایسے دریاؤں کے ساحلوں پر کھڑے تھے جن کی خوش رنگ موجوں پر بہتی ہوئی کشتیوں میں سوار لوگ آسمان کی طرف رخ کیے خوش الحانی کے ساتھ آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر رہے تھے۔ وہ ایسی شاہراہوں سے گزر رہے تھے جن پر آسمان سے وہ پاک پیغمبر اتر رہے تھے جن کی عباؤں سے نور برس رہا تھا۔ اور وہ ایسی وادیوں میں چل رہے تھے جن میں نورانی صورتوں والی بیبیاں فروکش تھیں اور ان کی رداؤں پر آفتاب اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔

ان کی گفتگو میں دکھائی ہوئی دنیاؤں کا ہر منظر مجھے بہت صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں ان مناظر کی خوشنمائی میں ایسا کھویا کہ مجھے نیند آ گئی۔ گہری نیند کے بعد صبح جب دیر سے میری آنکھ کھلی تو مجھے اپنے سارے بدن میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ چٹائی سے اٹھتے اٹھتے میں نے محسوس کیا کہ میرے بدن کا ہر حصہ دکھ رہا ہے۔ مجھے یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ اگر یہ تکلیف بڑھ گئی تو میں ان مریضوں کی دیکھ بھال کیسے کروں گا۔ انہیں اپنی دوائیں دو بار دینی ہوتی تھیں جو میں نے طے کیا تھا کہ میں انہیں

وقت پر دوا دی جاتی رہے گی اور تمہیں تجویز کی ہوئی دوا بھی صحیح مقدار میں صحیح وقت پر دی جائے گی۔ دونوں مریض بیدار ہو چکے تھے لیکن میں نے ان پر یہ ظاہر نہیں ہونے دیا کہ میں تکلیف میں مبتلا ہوں۔ ہمت اور قوت کا میں بڑی سختی سے مظاہرہ کر رہا تھا لیکن پھر بھی مجھے اٹھتے ہوئے دونوں مریضوں نے تاڑ لیا کہ مجھے کوئی تکلیف ہے۔

"ٹھیک تو ہو؟" ایک مریض نے پوچھا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"نہیں، تم جیسے تھے ویسے نہیں ہو۔" دوسرا بولا۔

"نیند نہیں آئی۔ سر بھاری ہے۔"

"نہیں کوئی اور بات ہے۔" پہلا مریض بولا۔ "تم ٹھیک سے کھڑے نہیں ہو پا رہے ہو۔"

"ہاں... لگتا ہے کروٹ بدلتے ہوئے... کمر میں چک آ گئی ہے۔" میں نے کہا۔ پھر ان کی تسلی کے لیے کہا، "چلنے پھرنے سے ٹھیک ہو جائے گی۔" یہ کہتے کہتے میں لڑکھڑا گیا۔ مجھے لڑکھڑاتا ہوا دیکھ کر دونوں مریضوں نے مجھے سنبھالنے کے لیے اپنے بستروں سے اترنے کی کوشش کی لیکن وہ ایسا نہ کر سکے اور بے چارگی کے عالم میں میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان میں سے ایک بولا۔

"لیٹ جاؤ۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ معالج آیا تو ہم اس سے تمہاری تکلیف بتائیں گے۔"

میں سمجھ چکا تھا کہ میں دیر تک کھڑا نہیں رہ سکوں گا، اس لیے میں پھر چٹائی پر لیٹ گیا۔ میری تکلیف بڑھتی جا رہی تھی اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بدن کے کون سے حصے کو دبا کر اپنی تکلیف دور کروں۔ دونوں مریض میری بڑھتی ہوئی تکلیف سے پریشان تھے اور جیسے جیسے میرے منہ سے کراہیں نکلتیں، ان کے چہروں کی رنگت بدلنے لگتی۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے لفظ میرے منہ سے نہیں نکل رہے تھے لیکن آنکھیں بار بار وارڈ کے دروازے کی طرف اس امید میں اٹھ رہی تھیں کہ شاید کوئی معالج اس طرف نکل آئے۔ لیکن کوئی معالج اس طرف نہیں آیا اور میری آنکھیں وارڈ کے دروازے سے لگی کی لگی رہ گئیں۔ اس کے آگے مجھے کچھ یاد نہیں۔ تکلیف کی شدت کی وجہ سے شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش آنے پر مجھے بتایا گیا کہ میں کئی دن تک بے ہوش رہا اور میری یہ حالت دیکھ کر

[illegible]
اس نے کہا:

"معالج تم بہت دیر سے آئے۔"

[illegible]

"پھر کون ہو تم؟"

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]
ان سے پوچھا

[illegible]

"پہلے ہم یہیں تھے۔"

"اسی ہسپتال میں؟"

[illegible]

"وہ یادداشتیں۔۔۔؟"

"ہمیں نے قلمبندی کی تھیں۔"

[illegible]

[illegible]

"پہلے ... مریضوں کو کیا شکایت تھی؟"

Scanned with CamScanner

"پتا نہیں چل سکا۔ یہ بات شاید ہم نے اپنی یادداشتوں میں لکھی ہے اور شاید تم نے پڑھی بھی ہو گی۔"

"پڑھی ہے۔" پھر میں نے خود کلامی کے سے انداز میں کہا، "پتا نہیں وہ دونوں یہاں سے ٹھیک ہو کر نکلے یا نہیں، یا انھیں اسی حالت میں چھٹی دے دی گئی۔"

یہ سن کر وہ بولے، "ٹھیک ہو کر ہی نکلے ہوں گے۔"

یہ سنتے ہی میں وہاں سے باہر نکل آیا۔ شام ہو چکی تھی۔ میں ہسپتال سے باہر آنے کے بجائے اس میدان کی طرف چل پڑا جس کے بارے میں دونوں مریضوں نے بتایا تھا کہ وہاں کوئی طلسم ہے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا اور میں اس میدان میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ اچانک مجھے اس میدان میں وہ منظر دکھائی دینے لگے:

میں سفید لباسوں میں ملبوس ایسے لوگوں کو دیکھ رہا تھا جن کے گرد روشنیوں کے ہالے تھے، میں ایسے شاداب جنگلوں میں گھوم رہا تھا جن کے درختوں کی شاخوں پر ماہتاب آویزاں تھے، اور میں ایسے باغوں کی سیر کر رہا تھا جن کی نہروں کے شفاف پانیوں میں نیلے آسمان کا عکس صاف نظر آ رہا تھا اور جن میں اڑتی ہوئی پریوں کے سنہرے پروں پر ستارے چمک رہے تھے، اور میں ایسے دریاؤں کے ساحلوں پر کھڑا تھا جن کی خوش رنگ موجوں پر بہتی ہوئی کشتیوں میں سوار لوگ آسمان کی طرف سر اٹھائے خوش دلی کے ساتھ آسمانی صحیفوں کی تلاوت کر رہے تھے، اور میں ایسی شاہراہوں سے گزر رہا تھا جن پر آسمان سے وہ پاک چہرے اتر رہے تھے جن کی عباؤں سے نور برس رہا تھا، اور میں ایسی وادیوں میں چل رہا تھا جن میں نورانی صورتوں والی بی بیاں فروکش تھیں اور ان کی رداؤں پر آفتاب اپنا سایہ کیے ہوئے تھے۔

میں چلتا جا رہا تھا اور یہ منظر ایک کے بعد ایک میری آنکھوں کے سامنے آتے جا رہے تھے اور مجھے نہیں معلوم کہ اس طرح چلتے چلتے میں اس میدان میں، جسے ان مریضوں نے طلسم کا میدان کہا تھا، کہاں تک نکل گیا۔

❁ ❁

اخلاق احمد

ماڈرن کوارٹرز کا ماسٹر

ماسٹر کے گھر کے قریب پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی اندر گلی میں لے جانے سے انکار کردیا۔

''پچھلی بار کسی نے سامان پھینک دیا تھا صاحب جی،'' اس نے حتی الامکان ادب کے ساتھ کہا۔ ''اور اس سے پچھلی بار ٹمیں چھوکرے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے'' مظہر نے ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ چھوکرے کیا ہوتا ہے؟ ذرا دیکھ بھال کر بولا کرو۔''

ڈرائیور خاموش بیٹھا رہا۔

ٹائی کی گرفت سے نجات پا کر مظہر کار سے باہر نکل آیا۔ تیز، چبھتی دھوپ اور کراچی کی مخصوص نم ہوا۔ وہ جب بھی ماسٹر سے ملنے آتا تھا، ڈرائیور کسی نہ کسی بہانے ناگواری کا اظہار کرتا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں اپنے غصے پر قابو پا لیتا تھا۔ یہ بات بھی اسے ماسٹر نے ہی سکھائی تھی۔ ''غریب آدمی کے غرور پر ناراض مت ہوا کرو پیارے،'' اس نے کہا تھا۔ ''سارا غرور ہی بیساکھیوں کے سہارے کی خوشی ہے۔ خوش ہونے کے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ صاف ستھرے کپڑوں پر، جمعے کی نماز پڑھ لینے پر، گھر میں گوشت پکنے پر، بچے کی سینڈو بنیان پر، ہر چیز پر ان کی گردن اکڑ جاتی ہے۔ اس پر برا نہیں منانا چاہیے۔''

گلی کے کونے پر اب ایک نیا احاطہ نظر آ رہا تھا۔ بلدیہ کی دیوار پر پہلے سے بھی زیادہ سفیدی کردی گئی تھی۔ ہر کوئی زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرنے کی فکر میں تھا۔ تجاوزات بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ پیلے رنگ کے کوڑا دان پہلے ہی بڑھتے احاطوں کے اندر کہیں غائب ہو گئے تھے۔

جہاں اس نے اپنا سارا لڑکپن گزارا تھا۔

وہ مال میں جانے کی بجائے پہلی گلی میں مڑ گیا، کسی ارادے کے بغیر۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا، ٹانگیں یہ حل خود راستہ ڈھونڈ لیتی تھیں جیسے گھنٹی کی نیند ہے۔ چالیس برس گزر گئے تھے، وہ اتنی مدتوں سے یاد خود بخود اپنی طرف [illegible] درمیان تنگ گلیوں میں [illegible] کے ساتھ چلتے چلتے اسے ایسا محسوس کرتا یوں آگے چلتا تھا جیسے جھیل پر تیرتا ہو۔

ماسٹر صاحب کی دکان اور دوکان پردے کے پیچھے چھپی ہوئی تھی جو تختے [illegible] کترنوں اور بھوں اور پٹے ہاتھوں [illegible] ٹکڑوں کا سامان [illegible] ایک کمی دھونی سی جیتا تھا۔

منظور نے پہنچتے ہی دو تین بار دہرایا، پھر پردہ ہٹا کر اندر داخل ہو گیا۔

مشین چلاتے ہوئے ایک عورت نے سر اٹھا کر پوچھا، "کون؟"

"ماسٹر صاحب ہیں؟" منظور نے بے دردی سے مخاطب کیا۔ "میں [illegible] ہوں۔"

"[illegible] ہاتھ روم گیا ہوا ہے۔ ابھی آجائے گا۔"

وہ عورت [illegible] تھی۔ منظور نے اندازہ لگایا [illegible] ماسٹر کی [illegible] تھی۔ ماسٹر نے [illegible] شادی کر لی ہوگی؟ شاید وہ عادی ہو گیا ہوگا۔ آدمی بیس سال کی عمر تک [illegible] کا عادی ہو جاتا ہے۔

منظور نے دروازوں کی قطار پر نگاہ ڈالی۔ ماسٹر کا کوارٹر سب سے خستہ حال نظر آتا تھا۔ بائیس سال پہلے وہ سوچ سکتا تھا کہ [illegible] مگر چالیس سال پہلے سوچنے کی فرصت ہی کسے تھی [illegible] تھی۔ منظور نے پیچھے پلٹ کر دیکھا اور اپنے ہی دل میں ہنسا۔ چالیس سال پہلے تو زندگی کا ذائقہ ہی کچھ اور تھا۔ [illegible] میں ایک میلا پردہ کوارٹر کے قریب ہی [illegible] سکتا تھا۔ بچپن [illegible] میں تار کی پڑی تھیں [illegible] سے پہلے ہاتھ دھونے پڑتے تھے۔ چوکھٹوں پر [illegible] سفید چادریں، چوڑی [illegible] والی بڑی دری، تام چینی کی پلیٹیں اور [illegible] ہنڈیا سے اٹھتی گرم شوربے کی خوشبو۔

ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا اور ماسٹر نمودار ہوا۔

Scanned with CamScanner

وہ پہلے سے زیادہ عمر رسیدہ لگ رہا تھا اور اس کے دبلے پتلے سیاہی مائل چہرے پر ہڈیاں سی ابھری ہوئی محسوس ہوتی تھیں۔ مگر اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی اور بے پناہ توانائی تھی۔

''اب اتوار کے روز؟'' ماسٹر ہنسا۔ ''اتوار کو تو مجھے ہفتے بھر کی آمدن کا حساب کرنا ہوتا ہے، سیٹھ۔''

وہ مجھے مدتوں منتظر رہنے کے بعد جسم کی ہڈیوں کی چبھن محسوس کی۔

''چار ماسٹر، سیٹھ لوگ کوئی کام نہیں کرتے۔ ملازم کرتے ہیں سارا حساب کتاب۔''

ماسٹر نے قہقہہ مارا۔ ''کیا فٹ بات کہی ہے پیارے، خوش رہو۔''

پھر وہی گلیوں کا سفر تھا۔ کوارٹروں کے بیچ میں اندر اترتی گلیاں۔ ماسٹر سے دوستی کے تیں چالیس برس سے کبھی اسے گھر کے اندر آنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ باہر وہ اسی طرح چل پڑتے تھے۔ منظر نے کبھی اس کی بیوی کو نہیں دیکھا تھا، بچوں کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس اتنا جانتا تھا کہ ماسٹر کا ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی۔ بیٹا بجلی کمپنی میں ملازم ہو چکا تھا۔ بیٹی شاید بی اے کر چکی تھی۔ کبھی کبھی منظر کو یہ سب بہت عجیب لگتا تھا۔ چالیس برس پرانے دوست، جو ایک دوسرے کے گھر والوں کی صورتوں سے آشنا نہ تھے۔

نیم دائرے میں گھومتی پتلی گلی ختم ہوئی تو صلاح الدین ایوبی ہوٹل آ گیا۔ دیوار پر ایک بہت بڑے فریم میں صلاح الدین ایوبی کا پوسٹر آویزاں تھا: گھوڑا، تلوار اور صلاح الدین ایوبی۔ تصویر کے سارے رنگ اڑ چکے تھے اور صلاح الدین ایوبی کی تلوار ایک سوکھی ڈنڈے جیسی لگتی تھی۔ ساتھ ہی ایک پوسٹر شاہ رخ خان کا تھا، ایک مادھوری ڈکشت کا۔ اور دو چھوٹے فریم: ''یہاں مزدوروں کو روزانہ اجرت دی جاتی ہے۔'' اور ''ہوٹل میں بیٹھ کر سیاسی گفتگو کرنا منع ہے۔'' کرسیاں وہی پرانی تھیں، اور میزیں بھی۔

کاؤنٹر کے پیچھے سے ایوب کالا نکل آیا۔ ''آؤ آؤ، آج تو شہزادہ آیا ہے۔ بڑے دن بعد شکل دکھائی ہے بھئی...''

''بس یار، کام دھندے میں مصروف رہتے ہیں۔ کیا کریں۔''

ایوب کالا بولا، ''صحیح کہہ رہا ہے تو... اس سسرے شہر میں ہر شخص پھنس پڑا ہے، اور دوڑ رہا

بھی سال چھ مہینے میں آجاتا ہے۔ اپن تو نکل ہی نہیں پاتے ہیں اس کتے کام سے۔ اچھا اور بتا، کیا حال ہے؟ سنا ہے بڑا ٹاپ قسم کا ہوٹل بنالیا ہے تو نے؟ ... بڑا والا لونڈا بتا رہا تھا ایک دن۔ دوستوں کے ساتھ گیا تھا تیرے ہوٹل۔"

"کب؟" منظر نے کہا۔

"دو تین مہینے پہلے۔ بتا رہا تھا، ایک سے ایک گاڑیوں کی لائنیں لگی رہتی ہیں۔ میں نے پوچھا، منظر چچا سے ملا کہ نہیں؟ تو ٹال گیا۔ بولا، وہ شاید تھے ہی نہیں۔ میں نے کہا، ابے وہ تیری طرح نہیں ہے۔ اپنے ہوٹل پر نہ بیٹھے۔ یوں کہہ کہ تجھے شرم آ رہی تھی سلام کرتے ہوئے۔ خوب سنائیں سالے کو...."

منظر نے کہا، "زیادہ مت سنایا کر اولاد کو۔ کسی دن جواب مل گیا تو چھٹی ہو جائے گی۔"

ایوب کالا ساکت کھڑا رہ گیا۔

"مسٹر ان ایکشن۔" منظر مسکرایا۔ "سالا جملہ نہیں، بھالا مارتا ہے۔"

کاؤنٹر کی طرف جاتے جاتے ایوب کالا دھیمی آواز میں بولا، "تھوڑی بہت تو سنانی پڑتی ہیں یار...."

دور ایک میز پر کچھ مزدور ٹائپ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ان کے ساتھ والی میز پر تین لڑکے سر جوڑے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے اور کنکھیوں سے منظر کو دیکھ رہے تھے۔ منظر جانتا تھا، وہ کیا کہہ رہے ہوں گے۔ انھی کوارٹروں سے اٹھ کر دولت مند بن جانے والا شخص، جو اپنے ماضی کو نہیں بھولا۔ اس کے ہوٹل اور اس کی گاڑی اور اس کی شان و شوکت کے بارے میں مبالغہ آمیز گفتگو۔ "ابے، چوتیس کے بلاک میں رہتا تھا، دوسری والی گلی میں۔ ابا بتاتے ہیں، پڑھائی میں بہت تیز تھا۔" ان کوارٹروں میں رہنے والے ہیروز کی تلاش میں رہتے تھے۔ مشہور لوگ، مقبول لوگ، جو کئی دن تک گفتگو کا موضوع بن سکیں۔ خود منظر کو آج تک بہت سے لوگ یاد تھے۔ ٹی وی اداکار ظہور احمد تھا جو اپنے بھائی سے ملنے آتا تھا۔ اور گلوکار ایم کلیم، جو ذرا آگے رہتا تھا۔ برسوں پہلے ایک شام کرکٹر نذیر جونیئر نے ان کی پچ پر بالنگ کرائی تھی: سرخ گیند کی ناقابلِ یقین آف اسپن۔ پھر ریڈیو پاکستان کا وہ صداکار اور گلوکار تھا، صادق الاسلام۔ منظر کو سب لوگ یاد تھے، اور وہ جوش و خروش

Scanned with CamScanner

تھی، جو لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے سب چہروں پر رقص کرتا تھا۔

ماسٹر نے دو مسکہ بند منگوائے، اور دودھ پتی۔

"مجھے پتا ہے،" ماسٹر نے کہا، "تیری جان نکل رہی ہوئی مسکہ بند دیکھ کر۔ تجھے اپنا کولیسٹرول یاد آ رہا ہوگا جس کی وجہ سے تو صبح دوپہر شام گھاس کھاتا رہتا ہے۔ پر جان لے، یہ نرم، ملائم بند، یہ نیوناؤں مکھن کی تہہ اور یہ گرم چائے۔ اسے کھائے بغیر زندہ رہنا زندگی تو نہیں ہے۔"

منظر ہنسا۔ "تیس سال پہلے تو کلیجی کے بارے میں یہی کہتا تھا۔ وہ جو توے پر بھون کر"

"اے ہاں!" ماسٹر نے کہا۔ "وہ بھی طوفان ہوتی تھی یار"

"اور اس سے پہلے یعقوب بھائی کے گولے گنڈے کے بارے میں۔۔"

ماسٹر نے قہر آلود نظروں سے اسے دیکھا۔ "تجھے تو بیوی ہونا چاہیے تھا۔ اتنی پرانی پرانی باتیں پوری سینگی کے ساتھ یاد رکھتا ہے تو۔ یا پھر تاریخ دان ہونا چاہیے تھا۔۔۔"

"تاریخ تجھے کبھی معاف نہیں کرے گی، ماسٹر،" منظر نے کہا۔ "تو نے میری زندگی کا پہلا کالا چشمہ توڑ دیا تھا۔ ماموں امریکہ سے لائے تھے وہ چشمہ۔"

"تیرے ماموں خالی ہاتھ آئے تھے امریکہ سے۔ بولٹن مارکیٹ سے خریدے تھے سارے تحفے انھوں نے۔ اور تاریخ تجھے بھی معاف نہیں کرے گی بیٹا! تو نے میرا نام ماسٹر رکھا تھا۔ تو جانتا تھا مجھے ہر وقت پڑھتا دیکھ کر۔ آج ساری دنیا مجھے ماسٹر کہتی ہے، ایک اپر ڈویژن کلرک کو۔ گلی کے لونڈے ماسٹر صاحب کہہ کر سلام کرتے ہیں۔ اور مجھے اندھا مت سمجھ۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تو میرے مسکہ بند کا تجھے دلا میں کھا رہا ہے۔"

کوئی تاریکی سی تھی جو منظر کو شرابور کرتی جاتی تھی، چہروں کا رنگ اتارتی جاتی تھی، بے بسی کا اور پژمردگی کا اور اداسی کا رنگ۔ ایک مرجھایا ہوا پودا انگڑائی لے کر کوئی سرسبز چیز، چھین رہا تھا۔

اس نے سر جھٹک کر قہقہہ لگایا۔ چھ سات ماہ کے دوران پہلا بھرپور قہقہہ۔

"اچھا، اب بات بتا،" ماسٹر نے چائے کا گھونٹ لے کر کہا۔ "کیا پریشانی لاحق ہے تجھے؟"

منظر دم بخود رہ گیا۔ پھر اس نے سنبھل کر کہا، "ایسی کوئی خاص بات تو نہیں ہے"

ماسٹر نے کہا۔ "دو طرح کی ہوتی ہیں پریشانیاں۔ ایک تو روزمرہ کی پریشانی ہوتی ہے۔

Scanned with CamScanner

جیسے میں پریشان ہوں کہ بجلی کا بل زیادہ آگیا ہے، اس کی قسطیں کرنی ہیں۔ ڈپٹی ڈائریکٹر نے سالانہ انکریمنٹ رکوا دی ہے۔ موٹر سائیکل کا پچھلا ٹائر بالکل ختم ہو چکا ہے۔ دیکھئے تو پریشان ہوتا ہوگا۔ مالک مکان زیادہ رشوت مانگ رہا ہے۔ ڈرائیور پٹرول کی جعلی رسیدیں دے رہا ہے۔ بالٹی گوشت بنانے والا کاریگر بھاگ گیا ہے۔ یہ پریشانیاں تو عام پریشانیاں ہیں۔ ان پر تم ضائع کرنا بیکار بات ہے۔ پر تیرا منہ بتا رہا ہے کہ معاملہ کوئی بساط ناپ کا ہے۔ ملا ہاتھ۔ صحیح کہہ رہا ہوں نا؟"

منظر کو دس برس پرانی بات یاد آئی۔ ماسٹر نے اس وقت بھی اس کے چہرے سے بھانپ لیا تھا کہ معاملہ سنگین ہے۔ خلع کا مطالبہ واقعی سنگین معاملہ تھا، اور بات بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ماسٹر نے اسے پیچھے ہٹ جانے کا مشورہ دیا تھا، جس پر منظر بھڑک اٹھا تھا۔ ماسٹر کی باتوں نے اس کے دل میں گہری خراشیں ڈال دی تھیں۔ اس نے کہا تھا، "غلطی تیری ہے پیارے، تیرے انجن کی ٹیوننگ ایک دم آؤٹ ہے۔ تو غریب آدمی ہے جسے مقدر نے دولتمند بنا دیا ہے۔ اور وہ خاندانی امیر ہے جسے پیسہ بے دردی سے خرچ کرنے کی اور آزاد رہنے کی اور اپنی مرضی چلانے کی عادت ہوتی ہے۔ تو اب کورٹ میں نہیں رہتا، تجھے ان پیسے والوں کے رنگ ڈھنگ سیکھنے ہوں گے، کیونکہ تجھے اب وہیں رہنا ہے۔ برداشت کرنے کی عادت ڈال، سمجھا؟ ذرا آنکھیں بند رکھنے کی بھی۔ ورنہ منہ کے بل گرے گا اور سب تالیاں بجائیں گے۔ اس بیوی کو چھوڑ دے گا تو دوسری کیا آسمان سے لائے گا؟ وہ بھی ایسی ہی ہوگی۔ کسی محلوں سے آئے گی۔" اور بھی بہت کچھ کہا تھا ماسٹر نے۔ کڑوی، کسیلی۔ زہر میں بجھے جملے۔۔

ماسٹر نے کہا۔ "کیا سوچ رہا ہے بے؟"

"سوچ رہا ہوں تو کتنا..."

ماسٹر ہنسا۔ "سب یار ایسے ہی ہوتے ہیں۔ یار کی نظر صرف نظر نہیں ہوتی پیارے، ایکسرے ہوتی ہے۔"

کبھی کبھی منظر کو ماسٹر کی باتوں پر حیرت ہوتی تھی۔ وہ بچپن سے ایسا ہی تھا: کھرا اور اکھڑ دانشمند۔ یہ دانائی اس نے صرف زندگی سے حاصل نہیں کی تھی، ان بوسیدہ سیکنڈ ہینڈ کتابوں سے بھی جمع کی تھی جو ریگل چوک پر ہر چھٹی کے دن فروخت ہوتی تھیں۔ مقدر نے اسے ایک سرکاری محکمے کا یو ڈی سی بنا دیا تھا ورنہ تنگ دستی نے اسے سنبھلنے کا اور سکھ کا سانس لینے کا موقع ہی نہ دیا تھا، مگر ماسٹر نے بھی

ہتھیار نہیں ڈالے تھے۔

منظر نے کہا: "مسئلہ ماہ نور کا ہے یار..."

ماسٹر اچھل پڑا: "گڑیا کا؟ اسے کیا ہوا؟"

"اسے کچھ نہیں ہوا ہے،" منظر نے کہا، "اس کی ٹینشن میری گھر والی کو ہو رہی ہے۔"

ماسٹر نے کہا: "بیٹیاں تو ساری عمر کی ٹینشن ہوتی ہیں یار۔ جانتے ہو میں نے کبھی ان سے محبت کرنا نہیں چھوڑا تھا۔ وہ شادی ہو کر چلی جاتی ہیں، ان کی اپنی زندگی ہو جاتی ہے، لیکن بچے بڑے ہو جاتے ہیں تو ماں باپ کی ٹینشن ختم نہیں ہوتی۔ تم ذرا بتاؤ تو سب سمجھ جاؤ گا۔"

منظر نے کچھ سوچ کر کہا: "یار، تو تو مجھے ڈرا رہا ہے۔"

ماسٹر نے جھک کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے: "مجھے معاف کر، جب تک نہیں بتاؤ گا میں آگے نہیں جاؤں گا۔"

"وہ شادی کرنا چاہتی ہے،" منظر نے کہا۔ "ابھی تیس سال کی بھی نہیں ہوئی ہے۔ یہ بچپن سے ہمارے گھر میں رہی۔ ہم نے کسی اور کے گھر نہیں دیکھے۔ میں چاہتا ہوں کہ پہلے ڈگری پوری کرے۔ ابھی دو سال باقی ہیں۔ پھر جو چاہے کرے۔ لیکن اب اسے شادی کا بھوت سوار ہے..."

ماسٹر بالکل ساکت بیٹھا تھا، کسی پتھر کے بت کی طرح۔

منظر نے کہا: "لڑکا اس کا کلاس فیلو ہے۔ چوڑی دار پاجامے جیسی پتلون پہنتا ہے، ہاتھوں میں رنگ برنگے کڑے ہیں۔ پلاسٹک کا تاج ہے، ایک نمبر کا۔ فیملی بہت پہلے ان کے باپ سے پچیس سال پہلے۔ تب ہاؤس پر کان ٹھول تھی۔ سمجھ رہے ہو؟ لندن اماروں میں۔ یہ بات پرانے تب ہی تو تھی۔ اب بھی چھوٹی تاجر ہی رہے لیکن بہت بڑے ہو گئے ہیں۔ پورے کے پورے بکتے ہیں۔ سب کچھ ہاں ہے۔ لوٹ مار کی کیپ میں ان کے دو بہت بڑے ہاؤسز ہیں۔ سارے کے سارے چلتے ہیں۔ شراب، ان کر پیتی کی دریت میں اور سب ادھر ہاں جاتا ہے بکاؤ ہے، ہاں گھما تا ہے اور ...

کہاں کہاں..."

ماسٹر بدستور ساکت بیٹھا تھا۔

منظر نے کاؤنٹر کی جانب دیکھ کر اشارہ کیا۔ ذرا سی دیر میں ایک بچہ ان کے سامنے دو کپ چائے پٹخ کر چلا گیا۔

ماسٹر بولا، "بس؟ یا ابھی باقی ہے اسٹوری؟"

منظر نے گرم چائے کا گھونٹ بھر کر کہا، "تو مجھے اچھی طرح جانتا ہے یار۔ میں کوئی تنگ دل، تنگ نظر باپ نہیں ہوں۔ مگر بزدل ہونے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کوئی باپ اولاد کی اور بچہ بچی کی دھمکیاں برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے کہا نا یہ کہ..."

ماسٹر نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "اسٹوری کو خواہ مخواہ پھیلانے کی کوشش نہ کر۔ میں سمجھ گیا ہوں تیری بات۔"

منظر کو ماسٹر کا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی تھی جو کرختگی محسوس ہوتی تھی۔

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔

ماسٹر چھت کو دیکھتا رہا اور پتلی پتلی انگلیوں سے میز پر طبلہ بجاتا رہا، یوں جیسے کہیں دور بیٹھی کوئی دھن سن رہا ہو۔ مگر منظر جانتا تھا کہ وہ کسی سوچ میں غرق تھا۔ یہ اس کا خاص انداز تھا۔

ہوٹل کے کچن سے ایک چھناکے کی آواز آئی۔ شاید برتن دھونے والے لڑکے نے کوئی کپ توڑ دیا تھا۔

کاؤنٹر پر بیٹھا ایوب کالا چلایا، "توڑ دے، سارے برتن توڑ دے، تیری ماں جہیز میں لائی تھی نا؟ سب توڑ دے۔"

ماسٹر جیسے کسی گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔ اس نے کہا، "دیکھ پیارے، کچھ باتیں تو تیری بالکل چریوں والی ہیں۔ چریا سمجھتا ہے نا؟ لڑکا زنانہ ٹاپ پہنے تو کیا ہو؟ آج کل یہی چل رہا ہے۔ بالیاں پہنتے ہیں لڑکے۔ اور چوڑیوں جیسے کڑے اور ایک دم ٹائٹ قمیص۔ بیوٹی پارلر جاتے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے میری جان۔ یاد ہے تجھے، ہم لوگ بیل باٹم پتلونیں پہنا کرتے تھے؟ چوبیس انچ کا پائنچہ۔ ساری پتلون غرارہ لگتی تھی لیکن ہم سارے شہر میں اکڑ کر پھرتے تھے۔ پھر جینز آ گئی تھی۔ ایک ہی لائٹ ہاؤس سے خریدتے تھے، ہاتھ پیر پھولے ہوئے ہوتے تھے کہ کوئی جاننے والا نہ دیکھ لے۔ تیرے ابا نے تو ایک دفعہ تیری جینز اور پرنٹڈ قمیصوں کو آگ بھی لگا دی تھی۔"

"ہاں ہاں آگے بول" منظر نے کہا۔ "دانت نکالنے بیٹھ جاتا ہے سالا!"

ماسٹر ہنسا۔ "برا لگ رہا ہے نا؟ گڈ۔ بلکہ ویری گڈ۔ دل خوش ہو گیا۔ اچھا، دوسری بات یہ ہے کہ اگر لڑکے کا باپ پہلے لنڈے کے کپڑے بیچتا تھا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ اب کروڑ پتی تو بن گیا ہے نا۔ اور تو خود کیا تھا؟ تیرے گھر میں اتوار کے اتوار گوشت پکتا تھا۔ کالج میں تیرے پاس فیس کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ ناولٹی سینما میں سب سے اگلی سیٹوں پر بیٹھ کر فلمیں دیکھتا تھا تو۔ یاد ہے نا؟ یا بھول گیا ہے؟"

منظر خاموش بیٹھا اسے دیکھتا رہا۔

ماسٹر نے اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارنے کی کوشش کی، گردن کھجائی اور بولا۔ "تو نے بتایا نہیں لیکن میں سمجھ گیا ہوں کہ تو نے گھر میں لفڑا کیا ہے۔ سٹوری تو یہ سنا رہا ہے کہ ثریا نے گھر میں ہنگامہ کر رکھا ہے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ ہنگامہ خود تو نے کیا ہے۔ اب تو سمجھتا کیوں نہیں ہے؟ وہاں نہیں چلتی یہ مار دھاڑ، چیخ پکار۔ یہاں کوارٹروں میں ٹھیک ہے۔"

منظر نے بیزاری سے کہا: "پھر؟"

ماسٹر نے ٹھنڈی ہو جانے والی چائے کا ایک بڑا گھونٹ لیا اور بولا۔ "پھر یہ کہ تجھے عقل سے کام لینا ہوگا۔ اب یہ مت پوچھنے بیٹھ جائیو کہ عقل کہاں سے آئے گی۔ دیکھ، ثریا ابھی غصے میں ہے اور ناسمجھ ہے۔ لیکن وہ جوان بھی ہے اور... اور بیٹی بھی ہے۔ باپ کے لیے سب سے مشکل کام بیٹی کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ جانتا ہے کیوں؟ کیونکہ بیٹی میں اس کی جان ہوتی ہے۔ سالا اتنی محبت کرتا ہے بیٹی سے کہ عقل سے بالکل پیدل ہو جاتا ہے۔ دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچاتا ہے مگر بیٹی کی بات آ جائے بیچ میں تو خچر کی طرح ہنہنانے لگتا ہے، دولتیاں جھاڑنے لگتا ہے۔ سچی بات بتاؤں؟ تیرا یہ جو چہرہ ہے نا، یہ تھوڑا تھوڑا خچر جیسا ہو گیا ہے..."

منظر نے جسم و جاں کی پوری قوت کے ساتھ پھٹ پڑنے کی خواہش پر قابو پایا اور کرسی سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھا رہا۔ ماسٹر کو سیدھے راستے پر رکھنے کے لیے اس سے اچھی تکنیک کوئی نہیں تھی۔

ماسٹر مسکرایا، یوں جیسے مقابلہ کرنے والے کسی اچھے کھلاڑی کو داد دے رہا ہو۔ "بچہ! تو نے

Scanned with CamScanner

کہا۔ "دو کام بتاتا ہوں تجھے۔ سمجھ لے، دو وارداتیں کرنی ہیں۔ پہلے ایک واردات، پھر دوسری۔ سمجھ رہا ہے نا؟"

منظر نے سر ہلا دیا۔

ماسٹر نے کہا: "پہلی واردات تو آج ہی کر ڈال۔ گھر جا کر بیوی سے کہہ کہ تجھے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ ایک مرد ہو دل والی ایکٹنگ چاہیے، سمجھا؟ پھر بیوی کو ساتھ لے کر ثریا کے پاس جا۔ آج رات ہونے سے پہلے پہلے ثریا کو گھر میں ہونا چاہیے۔ دونوں کو بتا دے کہ تجھے شادی پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ شرط صرف یہ ہے کہ ثریا شادی سے پہلے ماسٹرز کرے گی۔ بس، اس چھوٹی سی شرط پر راز جان جاتا ہے، کیا فائدہ ہوگا اس سے؟"

"ہنگامہ دو تین سال کے لیے ٹل جائے گا،" منظر نے سوچتے ہوئے کہا۔

ماسٹر ہنسا۔ "عقل سے تھوڑے، اس سے بھی بڑا فائدہ ہوگا۔ دو تین سال میں ثریا تھوڑی اور سمجھدار ہو جائے گی۔ ظالم باپ کی مخالفت ختم ہو گی تو وہ اپنی آنکھوں پر لگا ضد کا چشمہ اتار دے گی۔ جوانی میں سب ازلی گھوڑے ہوتے ہیں میری جان۔ اپن بھی ایسے ہی تھے۔ سب ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اور دو تین سال میں تو دنیا بدل جاتی ہے۔ ثریا پڑھے گی تو اس کی آنکھیں کھلیں گی۔ وہ بے شمار لوگوں سے ملے گی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ ابھی وہ بس اس لونڈے کو دیکھ رہی ہے۔ تیرا کام ہے اسے دنیا کی اونچ نیچ دیکھنے کے قابل بنانا۔ بغیر لفظوں کے یہ سمجھانا کہ دنیا بہت بڑی ہے۔ تو جانتا ہے نا کہ کروڑوں والوں کی کیسی زندگی ہے؟ صاف ستھرے علاقے ہیں اور بنگلے ہیں اور لشکارے مارتی گاڑیاں ہیں۔ اور اس سے بھی آگے دبئی ہے اور امریکہ ہے اور نہ جانے کیا کیا ہے۔ یہ سب کیسے پتا چلا تجھے؟ تو اس کنویں سے نکلا، تبھی پتا چلا نا؟ ثریا بھی نکل جائے گی اپنے کنویں سے۔ تھوڑا ٹائم لے گا۔ ویسی ہی پیار شروع کر، تاکہ تیرے دماغ کی گرمی کم ہو۔ سمجھا؟"

منظر نے سر کھجا کر کہا: "ویسے میں خود بھی یہی سوچ رہا تھا کہ..."

ماسٹر نے کہا: "تو تو کیا، تیرا پورا خاندان یہ نہیں سوچ سکتا۔ ایک ایک کو جانتا ہوں میں۔"

باہر دھوپ ڈھلنی شروع ہو گئی تھی۔

منظر نے خفیف سا ہنس کر کہا: "کہہ تو رہا ہے تو۔ میں کبھی بھی اس طرح نہیں سوچ سکتا تھا۔ ... دی ..."

رہ کر وہ اپنے فیصلوں کو پوری ہوشیاری سے نہیں دیکھ سکتا۔''

ماسٹر نے ایک دفعہ پھر اپنی انگلیاں چٹخائیں اور بولا: ''کیونکہ تو ایک خاص عمر کی بات ہے، تو ابھی نہیں سمجھے گا۔ پورے بھائی، وہ دوسری واردات کیا تھی؟ ہمیں تو وہی بتا رہا ہوں تجھے۔ دوسری واردات یہ ہے کہ اگر دو تین سال بعد بھی گڑیا اپنی بات پر قائم رہے اور وہ خدا کی ذات رہے تو تجھے وہ کرنا ہے جو عقلمند باپ کرتا ہے... یعنی ان دونوں کی شادی۔''

''شادی؟'' منظر نے کہا، مگر

''ہاں بیٹا شادی۔'' ماسٹر نے کہا۔ ''تین سال بعد تجھے پورا اندازہ ہو گا، تو خوشی کا مطلب کیا ہوگا کہ سب تیرے ان دونوں میں گڑیا بھی اور تیری بیوی بھی اور دونوں خاندان بھی۔ سمجھ رہا ہے نا؟ ورنہ یہ کام نہیں کرنا ہے۔ بیٹا اگر ایسا کرے گا تو تیرا انجام وہی ہوگا جو ہشتو قصوں میں ان کا ہوتا ہے۔ باپ کو زندگانی ایسے ہی گزارنی ہوتی ہے شہزادے، ٹوپی ڈراما چلانے رکھنا ہوتا ہے۔ ٹوپی ڈراما سمجھتا ہے نا؟ دلوں کو خوش رکھنا پڑتا ہے۔ ہر وقت مسکرانا پڑتا ہے۔ اکا دکا کوششیں کرنی پڑتی ہیں آدمی کو، اور بس۔ کوئی گڑیا سمجھ جاتی ہے کوئی نہیں سمجھتی۔ آدمی اور کیا کر سکتا ہے؟''

منظر کے من میں پوچھنے کی آرزو بہت شدید تھی مگر اس نے پوچھنے کی بجائے یہ محسوس کیا تھا کہ ماسٹر بالکل ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ مدر بھر کی اشتعال کی آگ یا آخر بجھ جائے گی۔ تب شاید سب کچھ اسی طرح ہوگا جیسے سلطان احمد نے اولڈ ہوٹل میں گزرنے والی اس گرم، روشن دوپہر میں اس آتش دان کے پیچھے ناچوں میں اور پرانی یادوں کے رس میں لتھڑی اس خوشبو اور صداقت میں انھوں نے سوچا تھا۔

سات آٹھ ماہ بعد منظر نے پھر اس دروازے پر دستک دی۔ میلے، مدوضع پردے کی اوٹ میں پیچھے دروازے پر۔

تھوڑی دیر بعد اندر سے ایک کرخت آواز آئی: ''کون ہے؟''

''وہ... قیصر صاحب ہیں؟ میں منظر ہوں۔''

تھوڑی دیر خاموشی چھائی رہی۔ منظر کسی جواب کا انتظار کرتا رہا۔

Scanned with CamScanner

اندر سے کچھ گھسیٹنے کی آوازیں آئیں۔ جیسے کوئی کرسی یا کوئی پلنگ کھسکایا جا رہا ہو، یا کچھ اور۔ منظر دل ہی دل میں مسکرایا۔ ہو سکتا ہے بیوی نے ماسٹر کو باندھ کر ڈال دیا ہو... اور اب اسے گھسیٹ کر دروازے تک لا رہی ہو۔

پھر کنڈی کھلنے کی آواز آئی، اور اس کے بعد دروازہ کھل گیا۔

ماسٹر کی بیوی نے دروازے کی اوٹ سے کہا، ''اندر آجاؤ۔''

ایک لمحے کے لیے منظر کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ اندر آجاؤ؟ کیا مطلب ہے؟ اندر کیوں آجاؤ؟ کیا... کیا ماسٹر بیمار ہے؟

ادھ کھلے دروازے سے اس نے ماسٹر کی بیوی کو چادر سنبھالتے، چپلیں گھسیٹتے، اندر جاتے دیکھا۔

اندر وہی بوجھل، ہوا سے اور دھوپ سے محروم گھروں کی بو۔ اور وہ بے ترتیبی بھی، جس کی منظر کو توقع تھی۔ دیواروں پر اور چھت پر سفیدی کی پپڑیاں جو رفتہ رفتہ ٹوٹ کر گرنے کے لیے تیار تھیں۔

منظر کسی مشینی آدمی کی طرح آہستہ آہستہ آگے چلتا گیا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم۔ ہر طرح کے احساس سے عاری۔ صحن کے بعد برآمدہ تھا جہاں دو تین کرسیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور آگے دو کمرے، جو نیم تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ برآمدے کے کونے میں نل کے پاس میلے کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ منظر آخری بار اس گھر کے اندر اس وقت آیا تھا جب ماسٹر کی اماں کا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا اور محلے کی عورتیں زار و قطار رو رہی تھیں۔

''قیصر... کہاں ہے؟'' منظر نے پوچھا اور اپنی آواز کی کپکپاہٹ پر حیران ہوا۔

''وہ چلا گیا... تمہارا ماسٹر۔'' ماسٹر کی بیوی نے کہا۔ وہی کرخت آواز۔ اس نے چادر کو یوں لپیٹ رکھا تھا کہ صرف اس کا سانولا چہرہ نظر آتا تھا۔ ''اب تو چھ مہینے ہونے والے ہیں...''

''کہاں چلا گیا؟'' کسی اختیار کے بغیر منظر نے پوچھا۔

ماسٹر کی بیوی نے دبی ہوئی آواز میں چیخ کر کہا، ''کہاں چلے جاتے ہیں لوگ؟ وہیں چلا گیا ہے وہ۔ اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی؟... رانی کو ڈر کے چلا گیا ہے۔ دو وقت کی کسی قبر میں جا کے سو گیا ہے سور کا بچہ...'' وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگی۔

Scanned with CamScanner

منظر کو محسوس ہو رہا تھا کہ زمین شق ہوتی جا رہی ہے اور وہ کرسی سمیت اندر دھنستا جا رہا ہے۔ کوئی بھنور تھا جو ایک جنونی رفتار سے گھمائے جا رہا تھا، گھمائے جا رہا تھا۔

نہ جانے ماسٹر کی بیوی نے خود پر کب قابو پایا۔ نہ جانے وہ خود سوچنے سمجھنے کے قابل کب ہوا۔ منظر کو بس یہ یاد تھا کہ وہ ہلنے جلنے کی قوت سے محروم بدن کے ساتھ کرسی پر ترچھا پڑا ہوا تھا اور اس کا سر پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔

ماسٹر کی بیوی چادر لپیٹے سامنے بیٹھی تھی مگر اس کی آواز جیسے کہیں دور سے آ رہی تھی۔

"میں نے اس سے کہا تھا کہ رشتہ برا نہیں ہے۔ لڑکا درزی کے پاس کام کرتا ہے تو کیا ہوا، کل اپنی دکان کھول لے گا۔ پھر رانی کو بھی پسند تھا وہ لڑکا۔ مگر ماسٹر کہتے کہ بی اے پاس بچی کو میٹرک پاس سے بیاہ دوں، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ رانی کو ذرا اس سے کہے، جس دن وہ اپنی دکان کھول لے گا، اس دن بات کرنا۔ اس سے پہلے نہیں۔ بات تو ٹھیک تھی۔ میں نے بھی اس رات یہی سوچا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن رانی نے کچھ اور ہی سوچ لیا تھا۔ میں فجر میں اٹھی تو رانی کی... رانی کی لاش پنکھے سے لٹک رہی تھی اور..." وہ چادر میں منہ چھپا کر پھر رونے لگی۔

منظر نے سر جھٹک کر دماغ پر چھائی دھند کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہ سب کچھ غیر حقیقی لگ رہا تھا، جیسے ابھی آنکھ کھل جائے گی، جیسے ابھی ماسٹر کی بیوی اور یہ بوسیدہ گھر اور یہ پورا منظر ایک جھپکتے میں غائب ہو جائے گا۔

ماسٹر کی بیوی نے خود پر قابو پا کر کہا، "میں پاگلوں کی طرح پچھاڑیں کھا رہی تھی، چلا رہی تھی۔ میرے بیٹے کا بھی برا حال تھا۔ مگر وہ چپ تھا۔ تمہارا ماسٹر... میں نے اسے گالیاں دیں۔ گھر میں لوگ بھرے ہوئے تھے۔ مجھے عورتیں گھسیٹ کر دوسرے کمرے میں لے آئیں... پولیس آئی تھی... محلے والوں نے ہی سب کچھ سنبھالا..."

آہستہ آہستہ منظر کے بدن میں دوڑتی سنسناہٹ کم ہوتی جا رہی تھی، اعصاب قابو میں آتے جا رہے تھے۔ لیکن ایک تجسس تھا جس نے اسے بدستور جکڑ رکھا تھا۔

ماسٹر کی بیوی کے چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں اور آنکھوں میں زندگی کی سب سے

بڑی ہار کا اعتراف۔

منظر نے کہا "اور... ماسٹر...؟"

ماسٹر کی بیوی نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا "وہ نہ رہ سکا وہ... میں بے غیرت تھی، جھیل گئی مگر اس کو بیٹی کا دکھ ساتھ لے گیا۔ سانس کا اٹیک ہو گیا تھا اسے... منہ کھول کھول کر سانس لیتا تھا... اس کے سینے میں سے ایسی آوازیں آتی تھیں کہ بس... ڈاکٹروں نے بتایا بھی تھا... دمہ... پانی بھی نکلوایا میں نے... مگر اس کی حالت بگڑتی گئی... آخر میں تو وہ ماتھا پیٹتا تھا اس طرح جیسے کوئی... زور زور سے... چھت کو دیکھ کر کہتا تھا، میں نے ہی وراثت ہی ختم کر دی... بار بار کہتا رہا... بس... میں سمجھ گئی تھی کہ اب وہ بچے گا نہیں... پھر وہ... چلا گیا۔"

منظر اس کی ہچکیاں سنتا رہا اور خاموش بیٹھا رہا۔ اس کی آنکھوں میں ماسٹر کا چہرہ تھا، وہ سن... ذہن میں ہزاروں بکھری یادیں تھیں اور اس کے سامنے برباد ہو جانے والا ایک گھر تھا۔

نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ پانچ، دس منٹ۔ یا آدھا گھنٹہ۔

ماسٹر کی بیوی نے چونک کر کہا "معاف کرنا۔ میں چائے..."

منظر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ "نہیں۔"

ماسٹر کی بیوی نے کہا "بیٹے نے فون کیا تھا تمھارے ہوٹل کے نمبر پر۔ سوئم کے بعد میں نے ہی ڈھونڈ کر نکالے تھے کچھ نمبر... وہ تمھارا بہت ذکر کرتا تھا۔ شاید تم تک خبر نہیں پہنچی۔"

منظر اچانک اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ کارڈ بیٹے کو دے دینا۔" منظر نے اپنا کارڈ بڑھایا۔ "کسی بھی دن آ جائے، مجھ سے مل لے۔ مجھے آنے میں بہت دیر ہو گئی، مگر خیر... ٹھیک ہو جائے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دور سڑک پر کھڑی کار کے مؤدب ڈرائیور نے اس کے لیے دروازہ کھولا۔

منظر نے کہا، "تم گاڑی لے جاؤ۔ میں آ جاؤں گا۔"

ڈرائیور کی سمجھ میں نہ آیا۔ "آپ کیسے آ جائیں گے سر؟"

منظر نے گرج کر کہا، "دفع ہو جاؤ... اس گاڑی سمیت میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

ڈرائیور مڑا، گاڑی میں بیٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے کار نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

Scanned with CamScanner

منظر کچھ دیر وہیں کھڑا رہا۔

پھر اس نے جیل روڈ کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

تھڑوں پر سیمنٹ کے بلاک بنانے والے مزدوروں اور فلو ٹری آتش کے درختوں سے ٹپکتے مینہ میں کھیلتے بچوں اور مٹھائی کی دکان پر سیاہ تیل میں سموسے تلتے کاریگروں اور موتی مسجد میں داخل ہوتے متقی نمازیوں میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ ان کے درمیان سے ایک شکستہ شخص گزر رہا ہے جس کی آنکھوں سے آنسو بہتے بہتے تھم جاتے ہیں اور جس کا دل دکھ سے لبالب بھرا ہوا ہے اور جس کا ماسٹر اس کے ساتھ ہاتھ کر گیا ہے۔

❀❀

معظم شیخ

بلّو

ہم نے چھت پر چڑھے ہونا جلتی دوپہر میں اور پاگلوں کی طرح ہنستے کھیلتے بھاگتے وقت گزارنا۔ کبھی اس نے آگے آگے ہونا تو کبھی میں نے۔ اس نے بھاگنا تو میں نے اس کی قمیض کا کونا پکڑ لینا، کھلکھلاتے اس نے رک جانا، مڑنا، برابر جھکتے ہوئے مجھ پر گدگدی کا حملہ کر دینا۔ میں نے قمیض چھوڑ دینی، اب میں نے ہنسنا، گر پڑنا، مگر اس نے گدگدانا نہ چھوڑنا، اور اسی بہانے چمٹنے کی کوشش کرنا... مجھے یہی باتیں تو پسند تھیں اس کی۔

کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ایک دن میں نے محسوس کیا کہ اس کھیل کے دوران اس کا دھیان کہیں اور ہے۔ میں نے اس کے دھیان کی سمت دیکھا تو دور، دو تین چھتیں چھوڑ کر، جہاں کبوتروں کا ڈربا تھا، شیخوں کا لڑکا، اپنی گھنی داڑھی سمیت، اپنے گھر کی منڈیر کے آس پاس گڈیاں اڑانے کے بہانے ہماری طرف تکتا نظر آیا۔ مجھے جلن محسوس ہوئی۔ آہستہ آہستہ یہ معمول بن گیا۔ جب اس کا دھیان منڈیر کے اس پار ہوتا، میں نے اسے انگلیاں مار کر گدگدانا کہ وہ میری طرف متوجہ ہو۔ گدگدانے سے اسے ضرور کچھ ہوتا تھا اور وہ فوراً ہی کھل اٹھتی تھی۔ اسی طرح کھیلتے کھیلتے میں نے اکثر اس کی چھاتیوں کو بھی چھو لینا، یا اس نے اس طرح نزدیک آنا کہ میرا ہاتھ وہاں لگے، مگر اس نے ایسے ظاہر کرنا جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو۔ مگر میں اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکوں۔ میری سڑکوں پہ تعلیم شروع ہو چکی تھی۔

حقیقت تو یہ تھی کہ وہ مجھ سے کافی بڑی تھی اور میں اس کی بغلوں تک آتا تھا۔ وہ اکثر بہانے

Scanned with CamScanner

سے مجھے گلے لگا لیتی اور میں، اس کے کھیل میں خاموشی سے شریک، اس کی دھڑکتی چھاتیوں کے جھٹکوں سے اپنے سر پر لیتا رہتا تھا۔ دوسروں کے سامنے میں اسے 'باجی' کہہ کر پکارتا تھا مگر یہ لفظ میں بڑی مشکل سے چباتا اور حلق سے نیچے اتارنے کی کوشش کرتا۔ مگر ایک دفعہ تو باجی کا لفظ مچھلی کے کانٹے کی طرح اٹک گیا جس دن اس نے مجھے شیخوں کے لڑکے کو اس کا رقعہ دینے کو کہا، "کہنا، سکندر بھائی، یہ بلّو باجی نے آپ کے لیے دیا ہے۔" بلّو کو اس کا نام کیسے معلوم پڑا؟ میں سوچتا ہی رہا۔ وہ جب شام کو دودھ لینے کے لیے ہمارے گھر کے سامنے سے گزرا، میں نے اسے بنا کچھ کہے رقعہ تھما دیا اور بھاگ آیا۔ غصے سے میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، مگر میں ڈرتا تھا کہ بلّو کہیں مجھ سے بات کرنا، کھیلنا نہ چھوڑ دے۔

محلے کے لڑکے سکندر کو انگریز بندر کہہ کر بلاتے تھے پیار سے۔ پر اس کی ایک اور وجہ بھی تھی: وہ گوری رنگت کا تھا۔ جس کے باوجود میرے اندر ایک پُرخوف احساس مجھے یہ بتاتا تھا کہ بلّو کا یہ راز میں افشا نہیں کر سکتا۔ یکدم مجھے اس بات کا احساس بھی ہوا کہ سکندر کی گڈیاں جو ہماری چھت آ کر کبھی کبھی گر جاتی ہیں، اور بلّو اس کی کنیاں دیتی ہے، اصل میں سکندر کا رقعے بھیجنے کا طریقہ ہے۔ وہ رقعے گڈیوں کے شہتیروں میں بندھے ہوتے تھے مگر جب ہوا نہیں ہوتی تھی تو گڈیاں نہیں اڑائی جا سکتی تھیں۔ میں نے عشق کی گردان کے پہلے الفاظ بھی ان ہی رقعوں سے سیکھے۔ ان ہی سے مجھے پتا چلا کہ محبت نامہ کیا ہوتا ہے۔ جب سیڑھیاں اترتے ہوئے ایک رقعہ پڑھنے لگا: "آپ کا محبت نامہ ملا، کئی بار پڑھا، آنکھوں میں آنسو آ گئے،" تو مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ کئی محبت نامے رلانے کا کام بھی کرتے ہیں۔ مگر اس بات کی سمجھ مجھے بہت دیر بعد آئی۔

پھر شیخوں کے لڑکے نے منڈیریں ٹاپ کر ہماری چھت پر آنا شروع کر دیا۔ شام ہونے سے پہلے گھر کے مردوں کے گھر لوٹنے سے پہلے، بلّو نے مجھے ساتھ لے کر چھت پر دھلے کپڑے اتارنے کے بہانے آنا تو سکندر پہلے ہی سے ساتھ والی دیوار کے پیچھے چھپا ہوتا۔ اپنی منڈی نکال کر اس سے ہولے سے بلّو کو پکارتا۔ بلّو سے اشارہ کرتا اور اس سے دیوار کو پھلانگ آتا۔ ہم تینوں سے آدھ گھنٹہ ایک کونے میں کھڑا رہتا۔ بلّو نے پیچھے سے مجھے اپنی آغوش میں لے لیتا، جیسے میں ڈھال ہوں، اور سکندر کے ساتھ سرگوشی میں باتیں کرتی۔ بلّو کے جسم کے لمس نے میری گھٹن پر حاوی آ جاتا، اور میں

Scanned with CamScanner

نے یہ بھول جانا کہ وہ اوپر اس کے لیے آئی ہوئی ہے۔

ایک دفعہ سکندر نے میری قمیض کے بٹنوں کو چھوتے چھوتے بنو کی انگلیاں پکڑ لیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھامے رکھے۔ اس دن وہ سکندر کو کہتی رہی کہ اپنے گھر میں سے کسی کو بنو کے گھر بھیجے۔ وہ کہتا رہا کہ وہ یہ کام باہر جانے کے بعد کرے گا، کیونکہ ابھی وہ سیٹل نہیں ہوا ہے۔ بس دو تین ماہ کا کھیل ہے، وہ کہتا رہا۔ ایک سہ پہر دونوں نے آنکھوں آنکھوں میں کوئی فیصلہ کیا اور بنو نے مجھے بڑے پیار سے کہا: ''طارق، چپکے سے جا اور میرے میز کی دراز سے میری چھوٹی پرس لے آ۔ کسی کو پتا نہ چلے۔''

مجھے جیسے فرشتے نے بتا دیا ہو کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں سیڑھیاں اترتا وہیں لوٹ آیا اور آ کر دروازے کے پیچھے چھپ گیا۔ میں سانس روکے کھڑا رہا اور میرے کانوں میں سی کی کھسر پھسر کی آوازیں آنے لگیں۔ پھر ان کے کپڑوں کے رگڑ کھانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرے کان مزید کھڑے ہو گئے۔ مجھے ''بس بس'' اور ''نہیں، کچھ نہیں ہوتا، جان'' ''جان من'' ''نہیں'' ''بس اب بار'' کی آوازیں سنائی دیں۔ میں نے ہمت کر کے سر تھوڑا سا باہر نکالا تو دیکھا، سکندر نے بنو کو دیوار سے لگایا ہوا ہے اور اسے چومے جا رہا ہے اور اس کے ہاتھ بنو کی چھاتیوں کو بھینچ رہے ہیں۔ پھر میرے دیکھتے دیکھتے، سکندر کا ایک ہاتھ بنو کی قمیض اٹھاتے ہوئے اس کی شلوار کے اندر جانے کی کوشش کر رہا ہے اور بنو کا ہاتھ اسے روکنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دونوں کے ہاتھ کچھ دیر گتھم گتھا رہے پھر بنو کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ سکندر کے ہاتھ اندر اندھیرے میں غائب ہو گیا اور بنو نے اپنے پنجے اس کی کمر میں گاڑ دیے اور جیسے غنودگی کے عالم میں اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ کچھ دیر اس کی آنکھیں بند رہنے کے بعد ایک جھٹکے کے ساتھ کھلیں اور اس نے سکندر کے کندھے کو کاٹا۔ میں گھبرا کر، کچھ بوکھلاہٹ کے ساتھ سیڑھیاں اترنے لگا۔

بھاگتا واپس آیا تو دونوں الگ ہو چکے تھے۔ پھر بھی دونوں کی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں، جیسے وہ بھی میرے ساتھ سیڑھیاں چڑھ کر آئے ہوں۔ اس دن جب سکندر منڈیریں پھلانگتا ہوا واپس گیا، وہ میرا سارا سکون اور چین بھی اپنے ساتھ لے گیا۔ میرے دل میں اس کے لیے بددعائیں اٹھنی شروع ہو گئیں۔

Scanned with CamScanner

ایک مہینے بعد سکندر کا امریکہ کا ویزا لگ گیا۔ مجھے لوگوں سے پتا چلا کہ وہ ماضی میں جمعیت اور جماعت اسلامی کا ممبر تھا ورنہ اس کے لیے امریکی ویزا لگنا معمولی سی بات تھی۔ بلو آتے جاتے سکندر کا ذکر کرتی تو میں اس سے چپ رہتا۔ وہ میری جلن کو سمجھتی تھی، اسی لیے اس کا ذکر بڑھاتی نہیں تھی۔ مگر مجھے اس کے اداس ہونے سے علم تھا کہ وہ سکندر کی کمی محسوس کرتی ہے جس کو میری موجودگی پورا نہیں کر سکتی۔ میں اداس اداس سا رہتا۔

میں نے یہ تو آپ کو بتایا ہی نہیں کہ بلو کے ساتھ میرا کیا رشتہ تھا۔ اس کا باپ میری ماں کا دور کا بھائی لگتا تھا اور اس کی ماں رشتے میں دور کی پھوپھی۔ ایک سال ہوا تھا میرے باپ کا انتقال ہوئے۔ گاڑی تیزی سے مڑی اور آ کر لگی میرے باپ کی سائیکل کو۔ جمعہ کی چھٹیوں میں میری ماں بیوہ ہو گئی۔ ہم بلو کے گھر رہنے آ گئے۔ یہاں میری ماں کو سکول میں پڑھانے کی نوکری بھی مل گئی تھی۔ لو ادھر ہم آئے، بلو جو اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹی تھی اور شروع ہی سے ہماری جوڑی سی بن گئی۔ سالوں سے بعد ہم نے تقریباً تمام وقت اکٹھے گزارا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا جب تک وہ منحوس منظر پر نہیں آیا۔ میں تو ٹی وی دیکھتے دیکھتے بلو کے ساتھ ہی سو جایا کرتا تھا۔

شروع شروع میں جب ہم یہاں آ کر رہنے لگے میری صحت کچھ اچھی نہیں تھی۔ میں گندا مندا بھی رہتا تھا۔ قمیض کے بٹن ٹوٹے ہوتے تھے، جوتوں کے تسمے کھلے، بال بکھرے ہوئے، سکول کے کام میں پیچھے۔ بلو نے میرا خیال رکھنا شروع کیا اور ایک دو بار تو نہلایا بھی۔ اس نے مجھے جانگیا پہنا کر پانی کے ڈونگے بھر بھر میرے اوپر ڈالے، صابن کی جھاگ میرے جسم پر ملی اور پھر تولیے سے خشک بھی کیا۔ یہ سکندر کے منظر پر آنے سے پہلے کی بات ہے۔ ایک دفعہ ہم دونوں گھر پر اکیلے تھے۔ گھر کے سارے بڑے چھوٹے کسی واقف کار کی میت پر گئے ہوئے تھے۔ اس دن نہلاتے وقت بلو نے اپنے کپڑے بھی اتار دیے۔ تب ہی پہلی دفعہ میں نے اس کی چھاتیوں اور ان کی تنی ہوئی گولائیوں کو غور سے دیکھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس کے بعد سے میرے ہاتھوں میں مسلسل ان کو چھونے کا تجسس رہتا تھا۔ اسی دن مجھے اس کی ناف سے نچلے حصے میں اگے ہوئے بال بھی نظر آئے اور احساس ہوا اپنے جسم پر بالوں کی کمی کا۔ اس نے نہانے کے دوران جب مجھے اپنے بالوں کے درمیان گہرے رنگ کا شگاف دکھایا اور بتایا کہ یہاں سے بچے پیدا ہوتے ہیں تو اس کی نظر میری

چھوٹی بلی کی تختی کی طرف اٹھ گئی۔ تب اس نے ہنستے ہوئے، بغیر شرم کے کہا، میں نالی کے پاس جا کر بیٹھ کر پیشاب کروں۔ میں جا کر بیٹھ گیا مگر پیشاب آیا کوئی نا۔ مجھ میں شرمندگی کا احساس بڑھ گیا اور سختی نرمی میں بدل گئی۔

دن گزرتے گئے۔ سکندر کا خط کوئی نہ آیا۔ بلو کے چہرے کی زردی زور پکڑتی گئی۔ اس کی گہری آنکھیں، زیادہ گہری ہو گئیں انتظار میں، اور جیسے درخت کے تنے اپنی عمر کے دائرے گہرے رنگ میں لکھتے چلے جاتے ہیں، اس کی آنکھوں کے نیچے بھی ہر نئی انتظار کی رات ایک نیا حلقہ چھوڑتی گئی۔ میں اسے ہنسانے کی کوشش کرتا، مگر وہ چھوٹی موٹی ہنس کر، تھوڑا بہت کھیل کر، مجھے اسکول کا کام کروا کر، پھر بستر میں بیٹھ جاتی تھی جیسے کالج کا کام کر رہی ہے۔ میں اسے بازار سے ٹافیاں، برف کے گولے، سموسے لا کر دیتا، جو اس نے میرے دل سے قبول تو کر لیے مگر ان کو آدھا کھاتا، آدھا بغیر چبائے ہی نگل جاتا۔ چار ماہ کا عرصہ کافی لمبا ہوتا ہے۔ جب اس نے مجھ سے ایک دن کہا، "شاید سکندر مر گیا ہے" تو مجھے جھٹکا لگا، یہ سوچتے ہوئے کہ شاید میری ہی کوئی بددعا اسے لگ گئی۔ میں کئی دن تک یہ بوجھ لیے پھرتا رہا۔

اس رات بھی میں ٹی وی دیکھتا دیکھتا بلو کے ساتھ اسی کے بستر میں سو گیا۔ مگر سونے سے پہلے، مجھے خوب یاد ہے، میں دھیرے دھیرے اپنا ہاتھ اس کی نچلی چھاتی کی گولائی تک لے گیا اور سکون سے نیند کی آغوش میں اتر گیا۔ جب میں اچانک جاگا تو مجھے لگا کہ میرا ہاتھ کسی کی گرفت میں ہے۔ کمرے کی بتی بجھ چکی تھی۔ مگر فوراً میں نے جانا کہ میرا ہاتھ اس کے نچلے بالوں پر ہے اور شلوار کا ڈھیلا ناڑا میرے ہاتھ کے اوپر سے رینگتا ہوا گزر گیا ہے۔ میں نے بلو کو یہ نہ پتا چلنے دیا کہ میں جاگ پڑا ہوں۔ پہلے وہ میری انگلیاں بالوں میں پھیرتی رہی۔ پھر میری شہادت کی انگلی پکڑ کر نیچے کو سرکاتی ہوئی لے گئی جہاں میری انگلی گیلی ہو گئی۔ میں سانس روکے لیٹا رہا۔ میں ابھی اس سارے واقعے کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس نے میری انگلی اور نیچے کر کے اندر کو گھسا دی۔ مجھے لگا جیسے چولہے کی آنچ چڑھ گئی ہو اور میں نے لاشعوری طور پر ہاتھ پیچھے کھینچا، جھٹکے کے ساتھ۔ پھر کچھ دیر ہم دونوں ساکت بیٹھے رہے۔ حالانکہ میری چوری پکڑی گئی تھی، نہ اس نے میری انگلی چھوڑی، نہ میں نے چھڑائی۔ پھر آہستہ آہستہ وہ میری انگلی دوبارہ اپنی تنہائی کے ایندھن میں لے گئی، اور میری انگلی وہاں

جلتی رہی۔

اس دن کے بعد سے بتو نے میرے ساتھ کھیلنا پہلے کم کیا، پھر بالکل ہی چھوڑ دیا۔ میں نے بھی باہر لڑکوں کے ساتھ سڑک پر کرکٹ کھیلنا شروع کر دیا۔ سبق سمجھنے کے لیے بھی بتو کا بڑا بھائی میری مدد کرتا تھا۔ میں اور بتو دور ہوتے گئے۔ اس سال کے آخر میں میری امی کی دوسری شادی ہو گئی اور ہم وہ گھر چھوڑ کر شہر کے دوسرے سرے پر آ گئے۔ بتو کے گھر والوں سے سال میں ایک آدھ بار ملنا ہوتا تھا۔ بتو کبھی میری طرف دیکھتی بھی تھی تو پتھرائی نظروں سے۔ کچھ ہی عرصے بعد بتو کی شادی ہو گئی وہ کراچی چلی گئی۔ آہستہ آہستہ وہ میرے ذہن سے مٹ گئی۔

نہ جانے کتنے سالوں بعد وہ مجھے یاد آئی۔ میں تب کافی بڑا ہو چکا تھا۔ جسم پر بے تحاشا بال اُگ آئے تھے، لمبی لمبی قمیصیں پہنتا بھدے سٹائل پر۔ کالج پاس کر چکا تھا۔ اچھے نمبر نہیں آئے تھے، مگر سوتیلے باپ نے سفارش وغیرہ ڈھونڈ کر مجھے سنٹرل ڈاک خانے میں عام سی نوکری دلوا دی۔ جیسے جیسے خطوں کو چھوتا گیا، انگلی کی جلن لوٹنے لگی، اس کے بعد بتو کی یاد بھی، اس کی بے وفائی کا کرب بھی۔ آخر خطوں پر مہریں دھرتا تو ان پر نام پڑھتا کہ شاید بتو کا نام نظر آ جائے۔ مگر یہ سوچ کر ہنستا کہ مجھے تو اس کا اصل نام بھی یاد نہیں۔ رات کی تنہائی میں مجھے اس کے جسم کا قرب اور لمس خوابوں میں آتا اور بے قرار رکھتا۔ سارا دن انگلی میں آگ سی سلگتی رہتی۔ سیدھے ہاتھ سے کوئی بھی چیز ٹھیک طریقے سے نہ پکڑ پاتا۔ امی ٹوکتیں، گلاس پکڑتے وقت یوں انگلی نہ کھلی رکھا کرو، نحوست ہوتی ہے۔

آج میرا بیاہ ہوا ہے اور میری بیوی، کمرے کے اندھیرے میں، کپڑے اتارے، چادر کے نیچے میرا انتظار کر رہی ہے۔ میں اس کے پاس ہی بیٹھا ہوں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ہم بستری کی، عشق سازی کی، پہلی سیڑھی کہاں سے چڑھوں۔ کیا کہوں؟ کہاں سے بات شروع کروں؟ میری ٹانگوں کے درمیان سختی میں ایک مزیدار گرمی اپنا احساس دلا رہی ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اس گرمی پر رکھ دوں مگر پھر میرا دھیان اپنی انگلی کی طرف چلا جاتا ہے جہاں اس کی برسوں پرانی سلگاہٹ بڑھتی جا رہی ہے۔ دماغ چاہتا ہے کہ یہی انگلی اس کے نچلے بالوں میں پھیرتا ہوا، آہستہ آہستہ اس کے اندر، گہرائی میں اتار دوں۔ شاید یہ جلن اگر بجھتی نہیں تو کم از کم کمزور ہی پڑ جائے۔

Scanned with CamScanner

سہ ماہی کتابی سلسلے "آج" کی اشاعت ستمبر 1989 میں کراچی سے شروع ہوئی اور اب تک اس کے 65 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ "آج" کے اب تک شائع ہونے والے خصوصی شماروں میں گابرئیل گارسیا مارکیز، "سرائیوو سرائیوو" (بوسنیا)، نرمل ورما، اور "کراچی کی کہانی" کے علاوہ عربی، فارسی اور ہندی کہانیوں کے انتخاب پر مشتمل شمارے بھی شامل ہیں۔

"آج" کی مستقل خریداری حاصل کر کے آپ اس کا ہر شمارہ گھر بیٹھے وصول کر سکتے ہیں اور "آج" کی کتابیں اور "سٹی پریس" کی شائع کردہ کتابیں 50 فیصد رعایت پر خرید سکتے ہیں۔
(یہ رعایت فی الحال صرف پاکستانی سالانہ خریداروں کے لیے دستیاب ہے۔)

چار شماروں کے لیے شرح خریداری (بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان میں: 600 روپے
بیرون ملک: 70 امریکی ڈالر

آج کے کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

اس کے علاوہ ماہنامہ "شب خون" الٰہ آباد
کے بھی کچھ پچھلے شمارے محدود تعداد میں دستیاب ہیں

Scanned with CamScanner

خالد طور

سکائی لیب

(ناول)

Scanned with CamScanner

1

پینتیس برس کی عمر میں تنہائی تگ و دو کے بعد مجھے ملک کے نشریاتی ادارے میں پروڈیوسر کی حیثیت سے ملازمت مل گئی۔ تمام نئے پروڈیوسروں کو اسلام آباد میں پشاور موڑ کے قریب واقع اسٹاف ٹریننگ سکول بلوا لیا گیا۔ سکول کے انچارج کی رسمی تقریر اور تعارف کے بعد پتا چلا کہ باقاعدہ ٹریننگ ایک ہفتے کے بعد شروع ہوگی۔ اسلام آباد سے تقریباً پچاس کلومیٹر دور کھوڑ کی آئل فیلڈ ہے، جہاں میرے بھائی فیلڈ انجینئر تھے۔ کھوڑ میں میرا بچپن گزرا ہے اور مجھے اس علاقے سے ذہنی لگاؤ بھی ہے۔ میں کھوڑ چلا گیا۔ جولائی 1979 کی نو تاریخ تھی۔ رات کے وقت خبروں میں بتایا گیا کہ امریکہ کی سکائی لیب میں فنی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور خلائی انجینئرز اسے دور کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ امریکہ اور سوویت یونین کے علاوہ دنیا بھر کے لیے یہ معمول کی ایک دلچسپ خبر تھی۔ اس خلائی لیب کو 1974 میں خلا میں پہنچایا گیا تھا اور اسے 1983 میں واپس زمین پر اترنا تھا۔ 10 جولائی کو صبح خبروں میں یہی خبر دنیا بھر کے لیے تشویش کا باعث بن گئی۔ بتایا گیا کہ سکائی لیب کا فنی نقص دور کرنے کی تمام کوششیں ناکام ہو رہی ہیں اور یہ خلائی لیبارٹری زمین کے کسی حصے پر بھی گر سکتی ہے۔

خبر نشر ہونے کے نوے منٹ بعد بھائی کے گھر کام کرنے والی ملازمہ نے مجھے بتایا کہ باہر شکور اسنگلاں والا[1] آیا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی وہ کبھی بھی مجھ سے ملنے بھائی کے بنگلے پر نہیں آیا کرتا تھا۔ "شاید اسے پتا چل گیا ہے کہ مجھے ریڈیو میں ملازمت مل گئی ہے،" میں نے سوچا۔ "بھائی کے ذریعہ نے یہ خبر پھیلا دی ہوگی۔ شاید شکور مجھے مبارک باد دینے آیا ہوگا۔" کمپنی کی کالونی کے کوارٹروں سے پہلے ایک احاطہ نما بازار ہے۔ بازار کی جنوبی سمت ڈسٹرکٹ بورڈ کا پرائمری سکول

[1] اسنگل: پنجابی زبان میں مویشیوں کو باندھنے کے لیے لوہے کی موٹی زنجیر کو کہتے ہیں۔

ہے۔ بازار سے آنے والی سڑک پر ایک دوسرے سے ملحق اسپتال اور ورکرز کلب ہیں۔ دونوں عمارتوں کے درمیان کلب کا وسیع لان حائل ہے۔ بازار کے احاطے میں گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا ڈپو ہے اور چاروں جانب دکانیں ہیں۔ شمال کی جانب شیر علی کا چھوٹا سا ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل کے ساتھ اندر جاتی ہوئی گلی بیس قدم پر بائیں ہاتھ مڑ جاتی ہے جہاں دو کچے مکان ہیں۔ ان مکانوں کے درمیان بھی ایک چوڑی گلی ہے۔ انھی مکانوں میں دوسرا گھر شکورے سنگلاں والے کا تھا۔ کانوں میں مقامی لوگوں کے یہی دو گھر تھے۔ پہلا مکان احمد خان ڈھولی کا تھا جس نے نصف مکان ضلع صوابی پختونخوا کے رہنے والے نثار خان کو دے رکھا تھا۔ نثار خان کمپنی کے ٹرانسپورٹ سیکشن میں ٹرک ڈرائیور تھا۔ اسے کوارٹر نہیں مل سکا تھا اور اس کے بیوی بچے صوابی ہی میں تھے۔ نثار خان ہر مہینے احمد خان ڈھولی کو پچیس روپے کرایہ دیتے ہوئے کمپنی کے لیبر افسر کو پشتو میں گالی دیا کرتا تھا۔ شکورے کا گھر آبائی تھا۔ اس کے باپ غفورے (عبدالغفور) نے دس مرلے زمین پر تین کمروں کا گھر بنایا تھا۔ ہوٹل کے عقب میں اس نے گلی میں کھلنے والی ایک کمرے کی دکان بنائی تھی جس میں وہ سنگل اور زنجیریں بنایا کرتا تھا۔ غفورا اپنے کام کا ماہر مانا جاتا تھا۔ ویلڈنگ کے بغیر بھی وہ سنگل کے حلقے اس طرح آپس میں جوڑ دیا کرتا تھا کہ دھنی کے طاقتور بیل بھی اسے نہیں توڑ سکتے تھے۔

دبلا پتلا شکورا اپنے باپ کا ہم شکل تھا۔ گورا چٹا لمبوترے چہرے پر پتلی اور لمبی ناک، دھنسی پتلوں اور لمبی سی آنکھوں والا۔ اس کے ابرو بھی گھنے تھے۔ آنکھیں اندر دھنسی رہتی تھیں، شاید اسی وجہ سے اس کی پلکیں گھنی نظر آیا کرتی تھیں، لیکن حیرت یا غصے کی حالت میں اس کی آنکھیں پوری کھل جایا کرتی تھیں۔ شکورے کی آنکھوں میں ہمیشہ ہر حالت میں وحشت سی نظر آیا کرتی تھی۔ خوشی ہو یا غم، حیرت ہو یا غصہ، اس کی آنکھوں کا ہر تاثر وحشت زدہ سا رہا کرتا تھا۔ وہ بہت غصیلا تھا لیکن جتنی جلدی اسے غصہ آیا کرتا تھا، اتنی جلدی ہی اتر بھی جایا کرتا تھا۔ میں نے کبھی کسی کو اس قدر زود رنج نہیں دیکھا۔ ناپسندیدہ بات یا حرکت پر وہ فوراً ہی چیخنے لگتا تھا، گندی گالیاں دیتا تھا۔ یہ عادت بچپن ہی سے اس کے ساتھ تھی۔ وہ چیختے ہوئے، گالیاں دیتے ہوئے فوراً ہی خاموش بھی ہو جایا کرتا تھا۔ کسی تاسف کی بات پر وہ فوراً ہی رونے لگتا تھا۔ اس کا قد لمبا تھا۔ سر پر سیاہ گھنے بال پیچھے سے گول کٹے رہتے تھے اور چھتے گردن کے پیچھے دائیں بائیں جھولتے رہتے تھے۔ وہ پکا نہیں ادھ تھا۔ غصے کی حالت میں

Scanned with CamScanner

اس کی سیدھی مانگ سے نیچے پیشانی پر گہری شکنیں نمودار ہو جایا کرتی تھیں۔ مجھے حیرت تھی کہ وہ صبح صبح مجھے کیوں ملنے آیا ہے۔ میں نے دراصل تو جانا ہی تھا شکورے سے ملنے کو تھا۔ میں بھاگی سے نکل کے لان سے ہو کر گیٹ پر پہنچا تو سامنے سڑک کی دوسری طرف ہاکی گراؤنڈ کے بنگلے کے پاس شکورا کھڑا تھا۔ وہ تیزی سے میری سمت آیا۔

"کیا بات ہے شکورے؟" میں نے کسی رسمی علیک سلیک کے بغیر کہا۔ "آج صبح صبح میری یاد کیسے آ گئی؟"

"تیرے آنے کی خبر مجھے مل گئی تھی،" شکورے نے کہا۔ "وہ خبریں سنی ہیں تو نے؟"

"ہاں سنی ہیں،" میں نے کہا اور شکورے کی آنکھیں تھوڑی سی کھلیں۔

"وہ کیا خبر ہے؟" شکورے نے کہا۔ "امریکہ کی کون سی چیز گرنے والی ہے؟"

"سکائی لیب؟" میں نے قدرے حیرت سے کہا۔ "ہاں شکورے، وہ خراب ہو چکی ہے اور زمین پر گرنے والی ہے۔ لیکن تو کیوں پریشان ہے؟ وہ یہاں نہیں گرے گی۔" شکورے کی آنکھیں بھنچ کر دو چمکتی ہوئی لکیریں بن گئیں۔

"اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں،" میں نے کہا۔ "وہ کھوڑ پر نہیں گرے گی۔"

شکورے کے چہرے پر ناگواری سی ابھری۔ وہ مڑا اور ایک لفظ کہے بغیر ہاکی گراؤنڈ کے بنگلے کے پاس چلا گیا۔ پھر اس نے مڑ کر مجھے دیکھا۔

"خبریں سنتا رہ،" اس نے کہا۔ "اور جو خبر بھی آئے، مجھے ضرور بتانا۔"

وہ ہاکی گراؤنڈ کے ساتھ ساتھ، بنگلوں کی قطاروں سے گزرتی ہوئی بالائی کے کوارٹروں کی سمت جاتی ہوئی تارکول کی چھوٹی سی سڑک پر تیز تیز قدموں سے چلا گیا۔ سکائی لیب میں شکورے کی دلچسپی فوری طور پر سمجھ نہ سکا، لیکن بات پر ذرا سا غور کرنے پر میں پریشان ہو گیا۔

2

شکورا اور میں بچپن میں کھوڑ کے پرائمری سکول میں پڑھا کرتے تھے، لیکن یہ ساتھ صرف تین برس تک ہی رہا۔ ایک روز سبق یاد نہ کرنے پر ماسٹر محمد جان نے شکورے کی ہتھیلی پر اس قدر زور

Scanned with CamScanner

سے بید ماری کہ شکورا چیخ اٹھا۔

"ہاں ادا، میں چینڈی۔" "(ہائے میں تیری۔)"

شکورے نے ماسٹر محمد جان کو گندی گالی دی اور ماسٹر محمد جان نے ساری جماعت کے سامنے شکورے پر شدید تشدد کیا۔ اگلے روز شکورا اپنے باپ کے ساتھ سکول آیا۔ غفور بہت غصے میں تھا لیکن جب ماسٹر محمد جان نے اسے بتایا کہ شکورے نے اسے ماں کی گندی گالی دی تھی تو غفور ٹھنڈا پڑ گیا۔ پھر ماسٹر محمد جان سے تھوڑی دیر بحث کے بعد اس نے شکورے کو جماعت کے ساتھ ٹاٹ پر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن شکورا باپ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"نہیں پڑھنا مجھے،" شکورے نے اپنی باریک چبھتی ہوئی آواز میں کہا۔ "بس نہیں پڑھنا۔ مجھے سنگل بنانے سکھا دے۔"

غفور کبھی شکورے کو اور کبھی ٹاٹ پر بیٹھے لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے شکورے کے کندھے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔

"سوری یار . . ."[2] (سسری کے . . .) "سنگل ہی بنانے تھے تو تین سال سکول میں مار . . ." اس نے سارے لڑکوں کے سامنے گندی سی بات کی۔ پھر اس کے چہرے پر غم کا تاثر ابھرا۔ اس نے اپنے تصور میں شکورے کو فوج کا کوئی افسر، عدالت کا مجسٹریٹ ورنہ جانے کیا کیا دیکھا ہو گا۔ وہ مڑ جھٹکے سے سکول کے بیرونی دروازے سے نکل گیا۔ شکورا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ ماسٹر محمد جان نے اسے نہ روکا۔ سب لڑکوں کے سر بیرونی دروازے کی سمت مڑے ہوئے تھے۔

"بہت اچھا ہوا ہے،" ماسٹر محمد جان نے کہا۔ "حرامی میرے سکول کو گندا کر دیتا۔"

مجھے سکول سے شکورے کے اس طرح چلے جانے کا دکھ تھا۔ اگلی صبح وہ باپ کی کاٹ پر ایک چھوٹی سی چوکی پر بیٹھا سنگل اور زنجیریں بنانا سیکھ رہا تھا۔

---

2 یہ گالی شمالی پنجاب میں دیہاتی طعنے کے طور پر عموماً دیتے ہیں کہ تو تو سالی کا ہے۔

3

شکورے کی ماں مر چکی تھی۔ غفورے نے دوسری شادی نہیں کی تھی یا موقع نہ پائی تھی، معلوم نہیں۔ میں میٹرک کا امتحان دے کر کھوڑ میں نتیجے کا انتظار کر رہا تھا کہ شکورے کا باپ چند روز چارپائی پر پڑے رہنے کے بعد مر گیا۔ کھوڑ گاؤں سے برادری والے آئے۔ انھوں نے نہ شکورے کی ماں کے مرنے پر کوئی توجہ دی تھی اور نہ غفورے کی موت ان کے لیے اہم تھی۔ آئے، تدفین میں شرکت کی، چلے گئے۔ پھر آئے قل کے پھل کھائے اور پھر چلے گئے۔ پندرہ برس کا شکورا اپنے باپ کا فن سیکھ چکا تھا۔ پانچ چھ دن بعد وہ باپ کی چوکی پر نہائی[3] کے سامنے بیٹھا سنگل اور زنجیریں بنا رہا تھا۔ دائیں ہاتھ سے چمڑے کی مشک نما دھونکنی سے انگیٹھی میں کوئلے دہکاتا، کوئلوں پر لوہے کی سلاخوں کو تپا کر سرخ کرتے ہوئے بائیں ہاتھ سے چمٹے کی مدد سے سرخ سلاخ نہائی پر رکھتے ہوئے، دھونکنی چھوڑ کر، ہتھوڑا اٹھا کر مطلوبہ زاویے سے وہ سلاخ کا حلقہ بناتا تھا اور پھر دوسرے حلقے سے جوڑ کر سلاخ کو اس چابکدستی سے کاٹ دیتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ ہر حلقہ دوسرے حلقے میں کاٹھی لگا دیتا تھا۔ کچھ ہی دنوں میں وہ باپ ہی کی طرح سنگل اور زنجیریں بنانے کا ماہر سمجھا جانے لگا اور ارد گرد کے دیہات سے وہ گاہک جو اس کے باپ کے پاس آیا کرتے تھے اس کے پاس بھی آنے لگے۔

شکورے کی ذہنی صحت پر پہلی بار مجھے اس دن شک ہوا تھا جب میں اسے شادی کی مبارک باد دینے اس کی دکان پر گیا تھا۔ بی اے کا امتحان دے کر میں کھوڑ گیا تو پتا چلا کہ شکورے کی شادی اس کی خالہ زاد شیداں (رشیدہ) سے ہو گئی ہے۔ شیداں شکورے کی بیوہ خالہ کی بیٹی تھی اور کھوڑ گاؤں کی رہنے والی تھی۔ شیداں کو میں بچپن سے جانتا تھا۔ سانولی، گول چہرے والی، متوازن ناک اور گول گول تیز آنکھوں والی شیداں بے حد شرارتی لڑکی تھی۔ بچپن ہی میں وہ جگت باز مشہور ہو گئی تھی۔ گاؤں کی تمام لڑکیاں اس کے سامنے پھیکی پڑ جاتی تھیں۔

مجھے یاد ہے، سکول کے دنوں میں جب جمعے کے روز آدھی چھٹی ساری ہو جاتی تھی تو میں شکورے کے ساتھ کھوڑ گاؤں کے باہر ایک کھلے ریتیلے میدان میں جایا کرتا تھا۔ وہاں سکول کے سب لڑکے موجود ہوتے تھے۔ کھوڑ گاؤں کی لڑکیاں بھی آ جایا کرتی تھیں۔ گرمیوں کی دوپہروں میں تو

3 اہرن، وہ ٹھیہ جس پر رکھ کر لوہا کوٹتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

وہاں جانا ممکن نہیں ہوتا تھا لیکن بہار، خزاں اور سردیوں میں ریتیلا میدان لڑکوں کی ایک بڑی شکارگاہ بن جایا کرتا تھا۔ میدان میں سانڈوں[4] کے بکثرت بل تھے۔ لڑکے مضبوط دھاگوں کے پھندے بنا کر سانڈوں کے بلوں پر رکھ دیا کرتے تھے۔ مضبوط ریشمی ڈور جیسے دھاگوں کے دوسرے سروں کو پکڑ کر کچھ دور ریت پر بے حس و حرکت لیٹ جایا کرتے تھے۔ جب کوئی سانڈا خوراک کی تلاش میں بل سے باہر آتا تھا تو اس کا دبلا سر پھندے سے نکل آتا تھا لیکن پچھلا موٹا دھڑ پھنس جاتا تھا۔ سانڈا واپس بل میں جانے سے بچنے کے لیے باہر نکل کر بھاگنے کی کوشش کرتا تھا۔ پھندا اس کی گردن پر مضبوطی سے جکڑا جاتا تھا۔ وہ اِدھر اُدھر بھاگتا، اچھلتا، قلابازیاں کھاتا، اپنی کانٹے دار دم زور زور سے ریت پر پٹختا تھا لیکن پھندے سے نہیں نکل پاتا تھا۔ ہر بار سانڈا پکڑے جانے کے بعد لڑکے خوشی سے ناچنے لگتے تھے۔ کئی لڑکے تختیاں آپس میں ٹکرا ٹکرا کر اس رقص میں تال دیا کرتے تھے۔ اس سے پہلے کہ سانس رک جانے پر سخت جان سانڈا مر جاتا فوراً پھندا کاٹ دیا جاتا تھا۔ اس مقصد کے لیے لڑکوں کے پاس قلم تراشنے والے چھوٹے تیز چاقو ہوتے تھے۔ سانڈے کو چھوڑ دیا جاتا تھا۔ ایک بار سہ پہر کی دھوپ سے تپتے میدان میں ایک سخت دل لڑکے نے پھندے میں جکڑے سانڈے کے سر پر تختی مارنا شروع کر دی۔ شیداں، جو اپنی سہیلی ذکو (ذکیہ) کے ساتھ کھڑی تھی، غصے میں دوڑ کر اس کے پاس آئی۔

"چھوڑ اسے، چھوڑ۔ تو اپنے چاچے[5] دا تیل کڈھ کے ویچنا اے؟" (چھوڑ دو اسے، چھوڑ دو۔ تم نے اپنے باپ سے تیل لے کر دھونا ہے؟)[6] لڑکوں نے قہقہے لگائے اور اس لڑکے کو کئی دن تک یہی جملہ کہہ کہہ کر ستاتے رہے۔ ایک بار جمعے کے روز میں سکول سے نکلا تو سامنے شکورا کھڑا تھا۔ اس کا باپ مسجد میں گیا ہوا تھا۔ میں اور شکورا ریتیلے میدان میں پہنچے۔ کئی لڑکے سانڈے پکڑنے میں مصروف تھے۔ وہاں گاؤں کی کئی لڑکیاں موجود تھیں۔ شیداں اور ذکو بھی تھیں۔ شیداں نے شکورے کو دیکھا تو سیدھی ہماری طرف آئی۔

"دکانے آں بند کیتاں ای؟" (دکان کو بند کیا ہے؟) شیداں نے کہا اور شکورے نے ... میں

---

4 سانڈے: گوہ کی قسم کے چھوٹے چھپکلے۔

5 شمالی پنجاب کے دیہاتی باپ کو چاچا کہتے تھے۔ شاید اس لیے کہ پرانے زمانے میں کوئی اسے برا سمجھتا تھا یا وہ کسی کو بھی باپ کہنا پسند نہیں کرتے۔

6 اس جملے سے مراد ہے: شمالی پنجاب کے دیہاتوں میں کوئی برا کام کرنے پر یہ جملہ کہہ کر قہقہے لگائے جاتے ہیں۔

سر دائیں بائیں ہلایا۔

"دکانے آں کھلی چھوڑ آیا ایں؟ آج شام میں ماسٹر تداں کنوی ڈی پئی۔" (دکان کھلی چھوڑ آیا ہے، آج شام ماسٹر تجھے ہنڈیا میں ڈالے گا۔)

میں جب میٹرک میں تھا تو ایک دن شکورے نے مجھے کھوڑ گاؤں چلنے کی دعوت دی۔ اس دن میں نے ان دنوں کے فیشن کے مطابق لمبی نوک والے بوٹ، کسی ہوئی پتلون اور شرٹ پہن رکھی تھی۔ کھوڑ گاؤں سے پہلے ریتیلے میدان کے کنارے پر کنواں ہے۔ اسی کنویں پر بعد میں بابا علی نے مسجد بنوائی تھی۔ راستہ کنویں کے پاس سے ہو کر گزرتا ہے۔ کنویں پر لڑکیاں پانی بھر رہی تھیں۔ ان میں شیداں اور ذکو بھی تھیں۔ شیداں نے مجھے دیکھا تو گھڑا نیچے رکھ دیا۔ اب وہ بچی نہیں تھی، بڑی ہو چکی تھی لیکن اس کی آنکھیں بچگانہ انداز میں چمکیں۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"ہا وے — تیری تے ہوا بند ہو گئی ہوسی" (ہا وے، تیری تو ہوا بند ہو گئی ہو گی) کنویں پر کھڑی لڑکیوں نے ہنسنا شروع کر دیا۔ مجھ سے بھی نہ رہا گیا۔

"شیداں توں میری گل من یا نہ من، تیرے اندر کسی بڈھی میراثن نی روح اے۔" (شیداں تو میری بات مان یا نہ مان، تیرے اندر کسی بوڑھی میراثن کی روح ہے) میں نے جواب دیا۔ کنویں پر قہقہے بلند ہوئے۔ سب سے اونچے قہقہے ذکو کے تھے؛ وہ خود بھی میراثن تھی۔

شکورے کی شادی پر میں بہت خوش تھا۔ بار بار یہی احساس ہو رہا تھا کہ اب شکورے کا گھر قہقہوں سے گونجے گا۔ اس کی بے رنگ تنہا زندگی رنگین ہو جائے گی۔ میں شکورے اور شیداں کو مبارکباد دینے اس کی دکان پر گیا۔ وہ نہائی کے سامنے چوکی پر بیٹھا زنجیر بنا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے ہتھوڑا ایک طرف رکھ دیا۔ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا، پھر اٹھا، میری طرف آیا۔ میں سمجھا، وہ مجھ سے بغلگیر ہونا چاہتا ہے لیکن اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر مجھے گالیاں دینا شروع کر دیں۔

"ہوتو میرا یار ..." اس کی آنکھیں غصے سے پوری کھل گئیں۔ "ہوتو میر جگری یار اور نہ آئے میری شادی پر ... تیری میں ..." اس نے مجھے گندی گالی دی۔

بہت سمجھایا کہ شکورے، میرے امتحان ہو رہے تھے اور مجھے کسی نے اطلاع بھی نہیں دی تھی، اطلاع دی ہوتی بھی، تو بھی میں نہیں آ سکتا تھا، میرے پرچے ہو رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

"تیرے پرچوں کی ماں۔" اس نے متخنوں کو گالی دی۔ "دفع ہو جا!" اس نے میرے سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر مجھے پیچھے کی سمت دھکیلا۔ "شکل غائب کر۔"

وہ مجھ سے منہ پھیر کر چوکی پر جا بیٹھا۔ اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا۔ شیداں کو میرا بیٹا جننے کی حسرت میرے دل ہی میں رہ گئی۔ مجھے چھ دن شکورے کو منانے میں لگے۔

4

سکائی لیب میں اس کی دلچسپی بے معنی نہ تھی۔ مجھے اس کے اس جنون کا احساس ہو رہا تھا جس کا بھیانک پس منظر بھی تھا۔ دوسری بار مجھے شکورے کی ذہنی صحت پر اس وقت شک ہوا جب شیداں زچگی میں تھی۔ میں ان دنوں پنجاب یونیورسٹی لاہور میں زیر تعلیم تھا۔ ہمیشہ کی طرح چھٹیاں گزارنے گھر آیا۔ شام کے وقت میں بازار گیا تو راستے میں مجھے شکورا نظر آیا۔ وہ بدحواسی کے عالم میں تیز تیز قدموں سے شیخ جی کے ہوٹل کے قریب سے آ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دوڑا۔

"شکر ہے ربا!" میرے قریب آنے پر اس نے بدحواسی میں کہا۔ "شکر ہے تو آ گیا ہے۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ چل، میرے ساتھ چل۔" اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں خوف تھا۔

"کیا ہوا شکورے؟" میں بھی گھبرا گیا۔ "خیر تو ہے؟"

شکورے نے خوف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا۔

"کئی دنوں سے شیداں ماں کے پاس ہے۔" اس کی آواز بھی تھرتھرا رہی تھی۔ "ابھی ابھی اللہ دتہ آیا تھا گاؤں سے۔ اس نے بتایا ہے کہ شیداں کو دردیں شروع ہو گئی ہیں۔ بچہ پیدا ہونے والا ہے اسے... یار میں بہت ڈر رہا ہوں۔"

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کی بدحواسی پورے بدن پر نمایاں تھی۔

"اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے شکورے؟" میں نے کہا۔ "ٹھیک کہہ رہے ہو، مجھے ابھی اس کا تجربہ تو نہیں ہے لیکن میرے خیال میں ہر باپ بننے والا شخص اس موقعے پر ڈر جاتا ہوگا۔"

تھوڑی دیر بعد میں بھی تیز قدموں سے شکورے کے ساتھ گھوڑا گاؤں جا رہا تھا۔ راستے میں عبدی کا گھر تھا۔ وہ بھائی کے ساتھ پائپ لائن پر جانے والے ورکرز میں سے ایک تھا۔ میں نے

Scanned with CamScanner

دروازہ کھٹکھٹا کر اسے باہر بلایا اور کہا کہ جا کر بھائی کو بتا دے کہ میں شکورے کے ساتھ کھوڑ گاؤں جا رہا ہوں، شیداں کو بچہ ہونے والا ہے۔ ابھی گاؤں دور ہی تھا کہ شکورے نے مجھے بتایا کہ شیداں کا آٹھواں مہینہ چل رہا تھا کہ درد بھی شروع ہو گئی ہیں۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ میں نے سن رکھا تھا کہ آٹھواں مہینہ زچگی کے لیے خطرناک ہوتا ہے۔ شکورا چند قدم آگے جا کر رک گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔ میں اس کے قریب گیا۔

''شکورے،'' میں نے کہا،''شیداں کو کمپنی کے اسپتال میں لے جانا ہوگا... فوراً''

''کیوں؟'' شکورے نے گھبرا کر پوچھا۔

''آٹھویں مہینے میں زچگی خطرناک ہوتی ہے۔'' میری آواز میں بھی گھبراہٹ تھی۔'' چل واپس چل، اسپتال سے ایمبولینس لے لیں گے۔ شیداں کو اسپتال پہنچا کر میں ڈاکٹر شیروانی کو بلا لوں گا۔''

''نہیں،'' شکورے نے کہا۔'' کوئی ضرورت نہیں.. دائی منظوراں ہے اس کے پاس۔ سینکڑوں بچے جنوائے ہیں اس نے۔'' میرے ذہن میں اندیشہ سر اٹھا چکا تھا۔

''شکورے، میری بات مان لے،'' میں نے کہا۔''ڈاکٹر شیروانی خود کچھ نہ کر سکے تو کم از کم راولپنڈی بھیجنے کے لیے ایمبولینس تو دے ہی دیں گے۔''

شکورے نے غصے سے میری طرف دیکھا۔''دماغ پھر گیا ہے تیرا؟'' اس نے غصے سے کہا۔ ''مرد کو دکھاؤں شیداں؟''

''ڈاکٹر شیروانی بوڑھے ہیں، باپ جیسے ہیں شکورے،'' میں نے کہا۔

''بے شرم!'' شکورے نے جھنجھلاہٹ سے کہا'' بے حیا... مرد میری شیداں کو ننگا دیکھے؟ تجھے شرم نہیں آتی؟''

مجھے الفاظ نہیں مل رہے تھے کہ شکورے کو سمجھا سکوں۔

''شیداں اور بچے کی جان کو خطرہ ہے شکورے،'' میں نے کہا، اور شکورے نے پھر گاؤں کی طرف چلنا شروع کر دیا۔

''تجھے میں اپنے حوصلے کے لیے ساتھ لایا ہوں،'' اس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا، ''اور تو

مجھے ڈرا رہا ہے۔"

نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس کے قدم سے قدم ملا رہا تھا۔ ہم جب کھوڑ گاؤں کے قریب پہنچے، گاؤں کے باہر درختوں پر پرندے خاموش ہو چکے تھے۔ گہری شام میں گاؤں کی گلیاں تاریک تھیں۔ کنویں سے پہلے مشرقی سمت سے آنے والا برساتی نالہ، جو ایک نیم دائرہ بناتے ہوئے جنوب کی سمت نکل جاتا ہے، تاریک ہوتے ہوئے گھبراؤ کا احساس دلا رہا تھا۔ برساتی نالے سے اوپر تیسری گلی میں شیداں کی ماں کا گھر تھا۔ وہاں دائی منظوراں، شیداں کی ماں، دو رشتے دار عورتیں اور شیداں تھی۔ گھر میں کوئی مرد نہ تھا۔ شکورے کی بیوہ خالہ باہر آئی۔ شکورے کو تسلی دی۔ اندر سے ایک مستطیل چارپائی لائی جو کسی بچے کی طرح تھی۔ گھر کے اندر سے کبھی کبھی شیداں کے کراہنے کی آواز ابھر رہی تھی۔ گہری شام رات میں بدل چکی تھی۔ کچھ دیر بعد دائی منظوراں باہر آئی۔ خاصی موٹی عورت تھی۔ اس نے پانی گرم کرنے کے لیے لکڑیاں مانگیں جو ختم ہو چکی تھیں، اور شکورے کو کچھ ہدایات بھی دیں۔ گلی میں خاصی گرمی تھی۔ ہوا کا کوئی جھونکا شمال سے جنوب کی سمت گاؤں کی گلی میں داخل ہوتا تو بہت اچھا لگتا تھا۔ شیداں کے کراہنے پر میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ شکورا لکڑیاں لینے کے لیے بھاگا۔ میں بچھی ہوئی ان کی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ شیداں کی آواز رک رک کر آ رہی تھی۔ دس پندرہ منٹ میں شکورا لکڑیاں لے آیا۔ پھر گاؤں کی جنوب مشرقی گلی کی سمت دوڑا۔ اس بار اس نے خاصی دیر لگا دی۔ گاؤں کی گلیوں میں کتوں کے بھونکنے کے سوا تمام آوازیں مٹ سی گئی تھیں۔ شکورا پنساری کی دکان پر گیا تھا جو یقیناً بند ہو چکی ہو گی۔ اس نے پنساری کے گھر جا کر، اسے ساتھ لے کر، پھر دکان کھلوائی ہو گی۔ اسی لیے وہ تقریباً چالیس منٹ کے بعد بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پڑیا تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر شیداں کی ماں لالٹین اٹھائے باہر آئی۔ اس کے چہرے پر تشویش تھی۔ وہ پڑیا لے کر اندر چلی گئی۔ شکورا میرے پاس بیٹھ گیا۔ نہ جانے کتنا وقت گزر گیا۔ شیداں کے کراہنے کی آوازیں مجھے پریشان کر رہی تھیں۔

"شکورے،" میں نے کہا، "اب بھی وقت ہے، مان جا۔ میں جا کر ایمبولینس لے آتا ہوں۔"

"مغز پھر گیا ہے تیرا،" شکورے نے غصے میں کہا، "کہہ دیا ہے میں نے، شیداں کسی غیر مرد کے سامنے ننگی نہیں ہو گی۔"

Scanned with CamScanner

شیداں اب رو رو کر سسکیاں بھر رہی تھی۔ وہ گلی کے ساتھ والے کمرے میں تھی۔ کمرے کی آوازیں ہم تک پہنچ رہی تھیں۔ پھر اس کے کراہنے کے وقفے میں کمی ہونا شروع ہو گئی۔ میں کلائی کی گھڑی تو بازار جاتے وقت ہی کمرے کی میز پر بھول گیا تھا۔ وقت کا کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ گاؤں خاموش تھا۔

"شکورے،" میں نے منت کی۔ "کوئی مرد شیداں کو نہیں دیکھے گا۔ میں ڈاکٹر صاحب سے پنڈی کے لیے ایمبولینس مانگ لوں گا۔ وہ دے دیں گے۔ ہم شیداں کو راولپنڈی لے چلتے ہیں۔"

"نہیں... میں نے کہہ دیا کہ نہیں،" شکورے نے کہا۔ شیداں کے کراہنے کی بلند آواز ابھری۔ گزرتا ہوا وقت بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ رات اس قدر تاریک تھی کہ گلی میں دو تین فٹ تک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک برساتی نالے کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی گاؤں کی ہر گلی سے کتوں کی آوازیں آئیں۔ وہ دور دور سے بھونک رہے تھے۔ جس گلی میں ہم بیٹھے تھے، اس میں بھی ایک بھونکتا ہوا کتا دوڑتا چلا آ رہا تھا لیکن ہم سے کچھ دور رک کر وہ مڑا اور بھونکتا ہوا دوسری گلی میں مڑ گیا۔ پھر آہستہ آہستہ خاموشی چھا گئی۔ اسی خاموشی میں پہلی بار شیداں کی ایک وحشی سی چیخ سنائی دی۔ شکورے نے وحشت زدہ آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ اندھیرے میں اس کے چہرے پر پھیلا ہوا خوف پہلے سے کہیں زیادہ تھا۔ شیداں کی چیخ پھر سنائی دی۔

"بچہ ہو رہا ہے؟" شکورے کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

"مجھے نہیں معلوم،" میں نے جواب دیا۔ "کوئی تجربہ نہیں مجھے۔"

شکورے کی ماں باہر آئی۔ لالٹین اس کے بائیں ہاتھ میں تھی۔ شکورا اور میں کھڑے ہو گئے۔

"توں فکر نہ کر،" اس نے شکورے کا بازو دائیں ہاتھ سے پکڑا۔ "بچہ پُٹھا اے، کم اوکھا اے، منظوراں سدھا پئی کری اے، ہو ویسی۔" (بچہ اُلٹا ہے، کام مشکل ہے، منظوراں سیدھا کر رہی ہے، ہو جائے گا۔) وہ پھر اندر چلی گئی جہاں سے اب شیداں وقفے وقفے سے چیخ رہی تھی۔

"بے وقوف نہ بن شکورے۔" میں نے کہا۔ "ایک گھنٹے میں ہم راولپنڈی جا رہے ہوں گے۔ میں..."

"اس حالت میں لے کر جائیں؟" شکورا میری بات ختم ہونے سے پہلے چیخا۔ "مارنا ہے

شیداں کو؟"

شیداں کی چیخوں پر شکورا دہشت زدہ خوف سے آنکھوں سے کبھی مجھے، کبھی کمرے کی اس دیوار کی سمت جہاں سے شیداں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں اور کبھی آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ مجھے وقت کی کا دھیان کی احساس ہوا نہ جانے رات کے کتنے بج چکے تھے۔ میں اندازہ لگا رہا تھا کہ بارہ بج چکے ہوں گے۔ کمرے سے شیداں کی چیخوں کے ساتھ عورتوں کے بولنے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ پھر شیداں کی دونوں رشتے دار خواتین باہر آئیں۔ ان کے چہروں پر بھی خوف تھا۔ وہ گلی میں ایک سمت چلتے ہوئے اندھیرے میں روپوش ہوگئیں۔ ایک کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ عورتیں شاید اپنے اپنے گھر چلی گئی تھیں۔ شیداں کی چیخوں میں وقفہ کم ہو رہا تھا۔ اس کی چیخوں میں درد کے ساتھ خوف کا تاثر بھی تھا۔ ہوا میں کچھ تیزی سی آگئی تھی۔ کچے مکان کی دیوار اندھیرے میں بہت بلند محسوس ہو رہی تھی۔ شکورا اب بار بار دونوں ہاتھ جوڑ جوڑ کر ہتھیلیوں کو گھور رہا تھا، آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے رب کی سے دعائیں مانگ رہا تھا۔ مجھے گھڑی نہ ہونے سے بہت پریشانی تھی۔ اچانک شیداں کی بلند چیخ سنائی دی۔ شکورا گھبرا کر کھڑا ہوگیا۔ اندر دائی منظوراں نہ جانے کیا کر رہی تھی۔ پھر شیداں نے مدھم آواز میں چیخنا شروع کردیا۔ ہر گزرتا ہوا لمحہ عجب شکل محسوس ہو رہا تھا۔ پھر کمرے کے کچے کا دروازہ کھلا۔ مائی دائی منظوراں ہاتھ میں لالٹین پکڑے باہر آئی۔ اس کا چہرہ خوفزدہ تھا۔

"گل مینڈے وس دی نئیں آں چھ اوتے جنگ یا پنڈی گھن ونجو۔" (بات میرے بس کی نہیں ہے۔ اسے فتح جنگ یا راولپنڈی لے جاؤ)۔ گاؤں میں ایک ہی جیپ تھی۔ ملک یار محمد ٹرانسپورٹر کی پہلی بیوی، بیٹے عمر سکائی کی۔ شکورا کانپ رہا تھا۔ اس نے میری طرف دیکھا، پھر دائی منظوراں کی طرف۔

"سکائی دی منت کر،" دائی منظوراں نے کہا "جیپ دے چھوڑی ٹیم تھوڑا اے بچہ۔" (سکائی کی منت کر جیپ دے دے گی، وقت کم ہے۔)

"ٹھہرو، میں ایمبولینس..." میں نے کہنا شروع ہی کیا تھا کہ شکورا دیوانہ وار اس گلی کی طرف بھاگا اور میری نظروں سے اوجھل ہوگیا جہاں سکائی کی حویلی ہے۔ اندر سے شیداں کی دردناک چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ دائی منظوراں پھر اندر چلی گئی۔ مجھے شکورے پر سخت غصہ آرہا تھا۔ میری بات مان لیتا تو ہم راولپنڈی پہنچ چکے ہوتے یا پہنچنے والے ہوتے۔ دائی منظوراں سے کچھ سیدھا کرنے کے لیے

نہ جانے کیا کیا تھا، شیداں کی دردوز چیخیں بلند ہو رہی تھیں۔ میرے پاس اب اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ کھوڑ کے اسپتال میں جا کر ایمبولنس کے ڈرائیور کو جگاؤں۔ اس کی ڈیوٹی تو اسپتال ہی میں ہوتی تھی لیکن وہ ڈاکٹر قریب ہی اپنے کوارٹر میں جا کر سو جایا کرتا تھا۔ شکورا ابھی نہیں تھا۔ مجھ پر بے بسی کی کیفیت طاری تھی۔ شیداں کی دلدوز چیخ بلند ہوئی۔ میں اٹھا، اندازہ لگایا کہ اگر میں دوڑ کر ایک کلومیٹر دور کالونی میں جاؤں تو کتنا وقت لگے گا۔ شیداں کی پھر چیخ بلند ہوئی۔ دروازہ کھلا۔ دائی منظوراں ہانپتی ہوئی باہر آئی۔

"شکورا کتھے ہیں اے؟" (شکورا کہاں ہے؟) اس نے مجھ سے پوچھا۔ اس کی آواز میں خوف تھا۔

"ملکانی دی حویلی جیپ لین گیا اے" (ملکانی کی حویلی میں جیپ لینے گیا ہے)، میں نے جواب دیا۔

"رب خیر کرے، گل بہوں وگڑ گئی اے" (خدا خیر کرے، بات بہت بگڑ گئی ہے)، منظوراں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "شیداں تاں کھوڑ کوںپئی وی نہیں۔" (شیداں تو کھیپی کی کالونی سے آگے نہ جا سکے گی۔) وہ پھر اندر چلی گئی۔

شیداں کی چیخیں ناقابل برداشت ہو چکی تھیں۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ شکورے کے آنے پر سے زوردار تھپڑ ماروں۔

"اجڈ، گنوار، احمق کہیں کا" میرے ذہن میں اندیشہ خوف کا روپ دھار رہا تھا۔ بار بار یہ ہی خیال ذہن کو ڈس رہا تھا کہ شیداں مر جائے گی۔ میں بار بار اس خیال کو ذہن سے جھٹک رہا تھا لیکن وہ بار بار کوبرے کی طرح پھن اٹھا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ وقت سے متعلق میرا اندازہ غلط نکلا۔ مشرقی افق پر دھند، ہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ اتنا وقت گزر گیا اور پتا بھی نہ چلا۔ شکورے کا کچھ پتا نہ تھا۔ شیداں کی چیخیں اتنی بلند تھیں کہ گاؤں میں دور دور تک سنائی دے رہی ہوں گی۔ گاؤں کے لوگ چھتوں پر سو رہے تھے۔ مجھے ان کی بے حسی پر حیرت تھی۔ کوئی ایک عورت بھی آتی دکھائی نہ دی۔ کچھ دیر بعد نیم تاریک گلی میں شکورا کسی تصوراتی بھوت کی طرح بھاگتا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک موٹا کتا بھونکتا ہوا دوڑ رہا تھا۔ میں نے تیزی سے چھ نمبر چارپائی اٹھائی۔ شکورے کی ٹانگ کے قریب پہنچا ہوا کتا رک کر

Scanned with CamScanner

واپس چل پڑا اور کچھ دور جا کر گھبرا گیا، مڑا اور پھر جوتنے لگا۔

"ہائے او ... ہائے او" شکورا ہانپتا ہوا میرے قریب آیا۔ "ہائے نی تُو تھیں، ٹھنڈی میں"
(ہائے ری لمبی وقتی، تیری میں ...)، شکورے نے دوار قدمائی کو گالی دی۔ شکورے نے بتایا کہ اس نے حویلی کا گیٹ بار بار کھٹکھٹایا، مدد مدد پکارا، دہائی دی، منتیں کیں، کسی نے حویلی کا گیٹ نہیں کھولا۔ شکورے کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ سانس اکھڑا اکھڑا سا تھا۔ شیداں کی چیخوں سے گھر کی گارے اور بھوسے کی دیوار لرزتی محسوس ہو رہی تھی۔ مجھے پہلی بار اپنی ٹانگوں میں کپکپاہٹ محسوس ہوئی۔ اچانک گلی میں دو عورتیں اور دو بوڑھے نظر آئے۔ دھیمی روشنی میں وہ تیز تیز قدم اٹھا رہے تھے۔ میں اپنی ٹانگوں کی کپکپاہٹ پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا کہ شیداں کی دلدوز چیخ سنائی دی — انتہائی کربناک چیخ لیکن کسی نوزائیدہ کے رونے کی آواز نہ آئی۔ بھیانک خاموشی چھا گئی۔ بوڑھے اور عورتیں ہمارے قریب پہنچ گئیں۔

"کے ہویا؟" ایک بوڑھے نے پوچھا۔ ایک ادھیڑ عمر کی عورت آگے بڑھی۔ "منظوراں کدھر اے؟" (منظوراں کہاں ہے؟) اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، دائی منظوراں باہر نکلی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

"شیداں بے ہوش تھی گئی اے" (شیداں بے ہوش ہو گئی ہے)، دائی نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ "ڈھڈ دے وچ بچہ مر گیا اے۔ زہر پھیل ریہا اے۔ شیداں دا ڈھڈ نیلا تھی گیا اے۔" (پیٹ میں بچہ مر گیا ہے، زہر پھیل رہا ہے، شیداں کا پیٹ نیلا پڑ گیا ہے)۔ دونوں عورتیں تیزی سے گھر کے اندر گئیں۔ بوڑھے ہمارے پاس خاموش کھڑے تھے۔ دائی ان کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتی ہوئی عورتوں کے پیچھے اندر چلی گئی۔

"مولوی جی آں جگائیے؟" (مولوی جی کو اٹھائیں؟) ایک بوڑھے نے دوسرے کو دیکھتے ہوئے بے رخی سے کہا۔

"جگانا ای پوسی" (جگانا ہی پڑے گا)، دوسرے نے کہا اور وہ شکورے سے بنا لفظ کہے چلے گئے۔

شکورا پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھوں میں دہشت

تھی۔ پیشانی پہ شکنیں بہت گہری تھیں اور بدن تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میری ٹانگوں میں بے قابو کپکپاہٹ تھی۔ میرا وقت کا اندازہ قطعی طور پر غلط تھا۔ مشرقی افق پر دھند بہت اب دھیمی روشنی میں بدل رہی تھی۔ یہ بات تو میں جان ہی چکا تھا کہ بیٹے کے مر جانے کے بعد اب شیداں کا جینا اس دور دراز گاؤں میں ناممکن ہے۔ میرے ذہن میں بچھی پہیلی کو برا جھنکار رہا تھا اور میں بے بس تھا۔ بے بسی کا یہ احساس اذیت دہ تھا۔ گھر کے اندر ہو جانے والی خاموشی بھی جس کا سایہ بدن پر پھیل رہا تھا۔ پھر عورتوں کے آہستہ آہستہ بولنے کی آواز ابھری۔ ذہن میں بچھی الجھے ہوئے لوہے نے بار بار میرے ذہن کو ڈسنا شروع کر دیا۔ اندر سے شیداں کی ماں کے چیخنے کی آواز آئی۔

"ہال نی میئے بے دھیے (ہائے رے میری بیٹی) ہایا ہائے ہائے" شیداں کی ماں سر پیٹ رہی تھی کہ چھاتی معلوم نہیں۔ مائی منظوراں آہستہ سے باہر آئی۔ اس بار وہ بہت تھکی ہوئی اور غمزدہ تھی۔ اس کے سارے بدن پر کپکپاہٹ تھی۔

"بہوں افسوس اے پتر، شیداں لگ گئی اے۔ ایہہ تاں دنیا اے۔" (بہت افسوس ہے بیٹا، شیداں چلی گئی ہے۔ دنیا تو دنیا ہی ہے۔)[7]

شرقی افق پر صبح کی روشنی پھیل رہی تھی۔ گاؤں کے درختوں اور گلیوں سے صبح کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ شکورا تھوڑا سا آگے جھکا، دونوں ہاتھوں سے سر پکڑا اور گھٹنوں کے بل گلی میں مٹی پر بکھرے تنکوں پر بیٹھ گیا۔

"شکورے،" میں نے اس کا کندھا پکڑا۔ "شکورے" میں اس پر جھکا ہوا تھا۔ "حوصلہ کر شکورے، ہوش میں آ۔"

وہ تیزی سے اٹھا میرے بدن کو پیچھے کی سمت جھٹکا۔ اس نے کالر کے قریب سے میرا بازو پکڑا۔ زور سے گھمایا، میں بھی اس کے ساتھ گھوما اور اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔

"تیندی ماں ..." (تیری ماں ...) اس نے مجھے گندی گالی دی۔ میں چکر کھا کر گھر کی بیرونی دیوار سے ٹکرایا اور لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ میری کہنی پہ چوٹ آئی۔ مائی منظوراں یہ دیکھ کر جھٹکے سے دو

---

7 یہ پنجابی مصرعے ہیں جو دیہاتی کسی کے مرنے پر کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی نے بھی تو مر جانا ہے۔

قدم پیچھے کی۔ صبح کی بڑھتی ہوئی روشنی میں اس کے چہرے پر دہشت کی علامت نمایاں ہوئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے دھب دھب کرتی گلی میں دوڑی۔ تھڑے کے پاس شیداں کی ماں بیٹھی لرز رہی تھی، عورتیں رو رہی تھیں۔

''ہوش کر بہنیں شکورے'' (ہوش میں آ نا شکورے)[8] میں نے دائیں ہاتھ سے بائیں بازو کی ہڈی پکڑتے ہوئے کہا۔ پھر شکورے کے قریب گیا ''موت پر کسی کا زور نہیں'' (ہمارا تو بس ہم شیداں کو بچا نہیں سکے۔) مجھے احساس ہوا کہ میری رندھی ہوئی آواز بیٹھ گئی ہے، آنکھیں دھندلا گئی ہیں۔ شکورے نے بڑی کھلی ہوئی وحشت ناک آنکھوں سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے دونوں بازو اوپر اٹھائے، چہرہ بھی اوپر اٹھ گیا۔

''ہاں وے کوڑیا مقدرا، تیری میں۔ ''(ہائے او جھوٹے مقدر، تیری میں) اس نے مقدر کو گالی دی، پھر سر پر دوہتڑ مارنا شروع کر دیے۔ اسے سنبھالنا بہت مشکل تھا۔ میں نے اس کے دونوں بازو پکڑ لیے۔ وہ ایک دم ساکت ہو گیا بے حس و حرکت۔ میں گھبرا گیا۔

''شکورے'' میں نے جھنجھوڑ کر کہا۔ ''شکورے''

شکورے کے بدن میں حرکت ہوئی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر شدید غم کا تاثر تھا۔ پھر اس نے مشرقی افق کی سمت دیکھا جہاں صبح کے اجالے میں نیلاہٹ سی پھیل چکی تھی۔ شکورے نے سر کو جھٹکا دیا، میری طرف دیکھا۔ دو قدم چل کر وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ اس کی وحشت زدہ آنکھیں، جیسے آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ اس نے چہرہ میرے چہرے کے قریب لا کر سرگوشی سی کی۔

''آسمان کے پیٹ میں بچہ مر گیا ہے۔''

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شیداں کی شرارتیں ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی چیخیں کانوں کے کونے میں ڈوب چکی تھیں۔۔ شیداں مر گئی ہے۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔

---

[8] شمالی پنجاب میں یہ صدا مخصوص لہجے میں کسی صدمے سے ہوئے شخص کو متنبہ کرنے کے لیے بولا جاتا ہے تاکہ اسے احساس ہو جائے کہ وہ کچھ غلط کر رہا ہے۔

5

میرے ذہن میں ایک پریشان کن اندیشے نے جگہ بنا لی تھی۔ شکورے نے شیداں کی موت پر پاگل پن کی علامات ظاہر کر دی تھیں۔ کسی بھی انسان کے صحیح الدماغ ہونے کا پتہ ہیجانی کیفیت ہی میں چلتا ہے۔ ویسے تو اس دنیا میں جتنے بہیمانہ افعال کیے جاتے ہیں سب ہیجانی کیفیت ہی میں ہوا کرتے ہیں لیکن جرائم کرنے والوں کی ہیجانی کیفیت کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ایک سیدھے سادے دیہاتی میں جو غصے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے، ہیجانی کیفیت وہ اندر پیدا نہیں کر سکتی جس کا مظاہرہ شکورے نے کیا تھا۔ یہ درست ہے کہ غصہ ہمیشہ خوف میں بدل جایا کرتا ہے لیکن آسمان کو دیکھ کر جو جملہ شکورے نے کہا تھا، مجھے کئی دن پریشان کرتا رہا۔ وہ کہیں پاگل نہ ہو جائے، اس اندیشے سے میں بے چین تھا۔

شیداں کی موت کے بعد شکورا خاموش ہو گیا۔ پانچ چھ دن بعد وہ دکان پر بے دلی سے کام کرتا نظر آیا۔ وہ نہائی کے پیچھے چوکی پر خاموش بیٹھا رہتا تھا، اداس، غمزدہ۔ وہ گاہکوں سے بھی ہوں ہاں میں بات کرتا تھا۔ نہائی کے پاس انگیٹھی میں کوئلے دہکتے رہتے تھے۔ وہ بے دلی سے سنگل اور زنجیریں بناتا رہتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ معاش کے کھونٹے پر صبر و رضا کی حلقے بناتی ہوئی زنجیر سے بندھا ہوا مویشی ہے۔ کبھی دھونکنی دھونکتا تھا تو کوئلوں سے چنگاریاں اڑتی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ یہ چنگاریاں اڑ اڑ کر اس کے دل پر گر رہی ہیں۔ اس کے چہرے پر ہر وقت کرب سا رچا رہتا تھا۔ شیداں کی موت کے بعد ساتویں دن میں بازار کے احاطے میں شکورے کا پتہ کرنے گیا۔

"وہ خاموش ضرور ہے،" ہوٹل کے مالک شیر علی نے مجھے بتایا۔ "لیکن صبح ناشتے کے لیے آتا ہے، دوپہر کھانے کے لیے آتا ہے۔ رات کو وہ پورا کھانا نہیں کھاتا، چھوڑ جاتا ہے۔ صاحب، وہ شیداں کے ساتھ ہی مر گیا ہے۔"

"تم اس سے باتیں کیا کرو،" میں نے کہا۔ "اگر اس نے باتیں شروع کر دیں تو آہستہ آہستہ..."

اچانک ہوٹل کی پچھلی گلی میں شور مچا۔ میں اور شیر علی بھاگ کر پچھلی گلی میں گئے۔ شکورے کی دکان کے سامنے تین چار دیہاتی کھڑے تھے۔ وہ حیرت زدہ بھی تھے اور مسکرا بھی رہے تھے۔

شعور سے پرے پاگل پن کا دورہ پڑ چکا تھا۔ وہ گالیاں دے رہا تھا۔ غصے میں اس کی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ ماتھے پر شکنیں نمایاں تھیں۔

"ہاں او کوڑیے تقدیرے، جھنڈی میں ..." (ہائے او جھوٹی تقدیر، تیری میں ...) شکوران لی نہائی پر ہتھوڑا زور زور سے مار رہا تھا۔ اس کی ہر گالی ہتھوڑے کی ضرب پر ختم ہو رہی تھی۔ ہتھوڑا نہائی پر دھاڑ دھم بج رہا تھا۔

"ہاں نی تھیے کھوتے، جھنڈی میں ..." (ہائے ری موٹی گدھی، تیری میں ...) اس نے دائی منظوراں کو گالی دی۔

"ہاں نی لمی ہتھنیے، جھنڈی میں ..." (ہائے ری لمبی اونٹنی، تیری میں ...) یہ گالی دراز قد ملکانی کے لیے تھی۔

"ہاں او ہڈل کھچریا، جھنڈی میں ..." (ہائے او ہڈیوں والے خچر، تیری میں ...) اس نے ماسٹر محمد جان کو گالی دی۔

میں نے بہت کوشش کی کہ اسے روکوں، لیکن وہ ہتھوڑا نہائی پر پٹخ پٹخ کر گالیاں دے رہا تھا۔ میں نے اس کا بازو روکنے کے لیے دکان کے اندر جانے کی کوشش کی لیکن شیر علی نے مجھے پیچھے کھینچ لیا۔

"نہیں صاب،" اس نے چیخ کر کہا، "یہ غلطی نہ کریں۔ ہتھوڑا آپ پر بھی لگ سکتا ہے۔ یہ ہوش میں نہیں ہے۔"

دورہ پینتیس منٹ کا تھا۔ پھر وہ نڈھال سا ہو کر پیچھے کی سمت گر گیا۔ میں نے دکان میں جا کر ایک سمت پڑے مٹی کے گھڑے سے پانی نکالا۔ مٹی ہی کے بٹھل (پیالے) کو اس کے ہونٹوں پر لانے سے پہلے میں نے اس کے منہ پر چھینٹا مارا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے فوراً پیالہ پکڑا اور سارا پانی پی گیا۔

"تو کب آیا ہے؟" اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ میرا جی چاہا کہ اسے ہسپتال لے چلوں لیکن اس نے بالکل تندرست انسان کی طرح دھونکنی کو پکڑا۔

Scanned with CamScanner

'شتہ مکوتا!' شکورے نے دھوتی جھاڑتے ہوئے کہا۔ 'یہ وقت دھما ہے۔'

وہ اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ مجھے پریشانی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ شکورے نے بولنا تو شروع کر دیا ہے۔

پھر یہ سلسلہ پوری شدت سے چل نکلا۔ ہفتے میں کئی ایک دن شکورے پر دورہ پڑنے لگا۔ عموماً سہ پہر کے وقت اس کی وحشت زدہ غصیلی آنکھیں پوری کھل جاتی تھیں۔ وہ تپائی پر ہتھوڑے کو مار مار کر گالیاں دیتا تھا۔ ایک اور تماشا یہ ہوا کہ اس کا پڑوسی سالار خان اگر سہ پہر کو گھر میں ہوتا تھا تو وہ باہر نکل کر شکورے کی دکان کے قریب کھڑے ہو کر اسے پشتو میں گالیاں دینے لگتا تھا۔ یہ دوہرا تماشا بازار کے لوگوں کے لیے مفت کی تفریح بن گیا۔ جب بھی شکورے پر دورہ پڑتا تھا، سارے بازار کے لوگ وہاں بھیڑ سی لگا دیتے تھے۔ دکاندار اپنی دکانیں کھلی چھوڑ کر بھاگ آتے تھے۔ ان کے گاہک، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے اڈے کا عملہ، بسوں کے ڈرائیور، کنڈکٹر اور یہاں تک کہ مسافر بھی شکورے کی دکان کے آگے کھڑے ہو کر یہ تماشا دیکھتے تھے۔ خوب ہنستے تھے اور گلی قہقہوں سے گونجنے لگتی تھی۔ شکورا بھیڑ کو دیکھ کر انتہائی غصے میں اٹھ کر دروازہ بند کر دیا کرتا تھا۔ پھر اس نے دروازہ بند کرنا بھی چھوڑ دیا۔ غم و غصے کے سوا اسے کسی اور کیفیت کا احساس ہی نہیں رہتا تھا؛ شاید غم و غصے کا بھی نہیں، ورنہ وہ اس قدر شدید دیوانگی کا مظاہرہ نہ کرتا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ تصور میں اپنے ایذا رسانوں کے چہروں کو تپائی پر دیکھتا ہے اور ہتھوڑا مار مار کر ان کا کچومر نکالتا ہے۔ شاید یہی انتقام تھا جو وہ بے بسی میں لے سکتا تھا۔ شکورے کی دوسری شادی ممکن نہ رہی تھی وہ تنگی اور پاگل مشہور ہو چکا تھا، لیکن جبلی تقاضے سے انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی حسیاتی زندگی کو آسودہ کرنے کے لیے اس نے شیداں کی موت کے بعد جلد ہی کھوڑ گاؤں کی واحد فاحشہ عورت ڈکو (ڈکیہ) سے ناجائز تعلقات قائم کر لیے۔

6

یہ وہی ڈکو (ڈکیہ) تھی جو بچپن اور لڑکپن میں شیداں کی گہری سہیلی تھی۔ میں اسے بچپن اور لڑکپن میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ وہ گاؤں کی شادیوں میں عورتوں کے جھرمٹ میں ناچتے ہوئے اس قدر تیزی سے گھومتی تھی کہ دیہاتی عورتیں اپنے دوپٹے پکڑ کر ہاتھ ہونٹوں پر رکھ لیا کرتی تھیں۔ ڈکو کو سب

بچھری کہنے لگے اور وہ ذکو بچھری مشہور ہوئی۔ سانولی، تیکھے نقوش والی، پتلی لمبی، آنکھوں
اور لمبے لمبے بالوں والی ذکو بچھری جب چلتی تھی تو اس کے بدن کا حسن نکھر جاتا تھا۔ وہ گاؤں کی چند
خوبصورت ترین لڑکیوں میں شمار کی جاتی تھی۔ شیداں نے ذکو بچھری کے ساتھ بچپن گاؤں کی گلیوں میں
گیٹے[9] کھیلتے ہوئے گزارا تھا۔ ریتیلے میدان میں ساون کے بڑے بڑے قطرے اچھالتی تھیں۔ کنویں پہ پانی
بھرتے ہوئے لڑکیوں کے قہقہے لگاتے تھے۔ دونوں ایک ساتھ ہی جوانی کی امنگوں سے آشنا ہوئی
تھیں۔ ذکو بچھری کے عاشق بہت تھے۔ علاقوں کے منچلوں سے لے کر زمینداروں کے بیٹوں تک ہر نوجوان
ذکو بچھری کو چاہتا تھا۔ گاؤں میں رہنے والا احمد خان ڈھولی بال بچوں والا ہوتے ہوئے بھی ذکو بچھری پہ
مرتا تھا۔ ذکو کا باپ اس کے بچپن ہی میں مر گیا تھا۔ وہ برداشت کا رنگ ذرا تھا لیکن جلد ہی وہ سانس
کی بندش کا مریض بن گیا۔ پھر یہی بیماری عارضۂ قلب میں بدلی اور اس کی موت کا باعث بن گئی۔
مرنے سے چند برس پہلے ذکو کے باپ نے گاؤں کے باہر شمال میں گاؤں کے رستے پر کنویں کے ساتھ
پیسے پانچ مرلے زمین خرید کر مکان بنوا لیا تھا۔ ذکو کا بچپن اور لڑکپن اسی گھر کی چاردیواری میں گزرا
تھا، یہیں اس پر جوانی اتری تھی۔ پھر ذکو کی ماں بھی مر گئی اور ذکو اپنی دادی (حامد) کے گھر رہنے
لگی۔ مہینے میں ایک بار وہ اپنے آبائی گھر آ کر صفائی کر جاتی تھی۔ پھر ایک دن رشتہ طے پا گیا۔ اس کی
دادی نے رحمت ڈھولی کو زبان دے دی۔ ادھیڑ عمر کا رنڈوا رحمت ڈھولی اپنے فن کا ماہر تھا۔ خود
گاؤں، آس پاس کے دیہات، یہاں تک کہ پنڈی گھیب اور فتح جنگ میں بھی کوئی شادی، میلہ،
کھیل ورزش رحمت ڈھولی کے بغیر پھیکا سمجھا جاتا تھا۔ وہ احمد خان ڈھولی کا رشتہ دار بھی تھا اور حریف
بھی لیکن احمد خان ڈھولی اس کے فن کا معترف تھا۔ ایک بار احمد خان ڈھولی نے مجھے بتایا،

”صاحب، دھنی کے علاقے نے تین ڈھولی ہی پیدا کیے ہیں۔ ایک خدا بخش حصل گاؤں کا بابا
مستی خان تھا جس کا جوڑ تو کبھی پیدا نہیں ہوگا، ایک رحمت ہے اور میں۔ لیکن صاحب، رحمت کی بات ہی

---

9 یہ چھوٹے چھوٹے گول پتھروں کا ایک کھیل ہے جو دیہاتی بچیاں کھیلا کرتی ہیں۔ چھ پتھر زمین پر رکھے جاتے
ہیں۔ ایک قدرے بڑا پتھر ایک ہاتھ سے اچھالا جاتا ہے۔ یہ کھیل بچیاں ایک ہاتھ کا استعمال کرتی ہیں۔ بڑے پتھر کو
زمین پر گرنے سے پہلے دبوچنا ہوتا ہے، جس اس بہت کم وقت میں چھ پتھروں میں سے ایک پتھر اٹھانا ہوتا ہے۔ جو
بچی چھ پتھر گرائے بغیر اٹھا لے، وہ جیت جاتی ہے۔ یہ صرف کھیل ہی نہیں، ذہنی ہم آہنگی کی مشق بھی ہے۔

تال[10] تو مجھے بھی بے تالا کر دیتی ہے۔"

رحمت ڈھول لمبی کبڈی[11] میں بیچ بچ کرتے ہوئے دو کھلاڑیوں کو جُل دے کر پکڑ کرتے والے کھلاڑی کے گرد گھوم گھوم کر، ڈھول بجایا کرتا تھا۔ گر پکڑنے والے ہار گئے وہ کھلاڑی کو گھسیٹتے ہوئے لے آتے تھے تو بھی رحمت ڈھولی ادھر اُدھر مٹک مٹک کر ڈھول بجاتا رہتا تھا۔ میلوں میں، بیلوں کی دوڑ کے بعد، وہ جیتنے والے دھنی کے خوبصورت کالے چٹے، چھوٹے چھوٹے سینگوں والے، نتھنے کھول کھول کر سانس لیتے بیل کے سامنے بے خوفی سے کھڑا ہو کر دیر تک ڈھول کی گنار[12] بجاتا رہتا تھا، جیسے اس دھیمی سکون بخش تال سے بیل کو خوش کر رہا ہو۔ عرسوں پر وہ ڈھول بجاتے ہوئے خود بھی ناچتے ہوئے ملنگوں کے ساتھ دھمال ڈالا کرتا تھا۔

رحمت ڈھولی کی بیوی جوانی ہی میں اسے چھوڑ گئی تھی۔ جب اس کی بیوی گاراں (گوہر بی بی) ملیریا میں مبتلا ہوئی اور دو تین دن بخار رہا تو رحمت ڈھولی کالونی کے بازار سے دو روپے کی کونین کی گولیاں لانے کے بجائے پیر مراد شاہ کو پچیس روپے ہدیہ دے کر کالا دھاگہ دم کرا کے لے آیا۔ اس نے دھاگہ گاراں کی کلائی پر باندھ دیا۔ گاراں کا بخار علاج نہ ہونے پر بڑھتا گیا اور پھر ایک سو چھ ڈگری سے تجاوز کر گیا۔ گاراں بیہوشی کی حالت میں مر گئی۔ جب اسے دفن کیا گیا کالا دھاگہ اس کی کلائی پر بندھا ہوا تھا۔ پیر مراد شاہ کے ملنگوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ گاراں کی موت کی وجہ اس کا کوئی گناہ ہے۔

رحمت گاراں کے غم میں نڈھال تھا۔ اس نے چرس پی کر ساری برادری کے سامنے اعلان کیا کہ وہ زندگی بھر نہ شادی کرے گا نہ کسی عورت کے پاس جائے گا۔ آہستہ آہستہ وہ چرس کا عادی بن گیا لیکن اپنے اعلان پر سختی سے قائم رہا۔ چرس کی بری عادت کے باوجود وہ با کردار تھا۔ سانولا، لمبے قد اور دبلے پتلے بدن والا، چوڑی پیشانی، مناسب آنکھوں اور سیدھی ناک والا رحمت ڈھولی جوانی میں

---

10 جس تال، ڈھول کی دھمک و تھمک سے تیز اور آہستہ ہونے والی خوبصورت تال کا دیہاتی نام ہے۔

11 لمبی کبڈی میں کوئی قانون یا اصول نہیں ہوتا۔ دو کھلاڑی ایک کو دور دور تک دوڑا کر پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں، چانٹوں، گھونسوں اور لاتوں کی آزادی حاصل ہوتی ہے۔

12 ڈھول کے گول حصے کی انتہائی گمک۔

Scanned with CamScanner

بہت خوبصورت سمجھا جاتا تھا لیکن چرس کی عادت نے اب اسے بہت کمزور کر دیا تھا۔ اس کے جسم کی کوئی ہڈی ایسی نہ تھی جو نمایاں نہ ہو۔ پچکے ہوئے چہرے پر جبڑے کی ہڈیاں دور سے دکھائی دیتی تھیں۔ جب ذکو مری تھی، وہ تیس برس کا تھا۔ پندرہ برس اپنے عہد پر قائم رہنے والا رحمت ڈھولن پچیس برس کی عمر میں ذکو چھری کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے عہد پر قائم رہ سکا ورنہ کوئی ماں سے رشتہ مانگ لیا۔ رحمت کی ماں مر چکی تھی، باپ نہیں تھا۔ ایک چھوٹا بھائی تھا جو مسقط میں بیوی بچوں کے ساتھ مدتوں پہلے گھر خرید کر وہاں ایک جینڈ میں شامل ہو گیا تھا۔ ماں نے یہ سوچ کر کہ ذکو اکیلی بہت خوش رہے گی اور رحمت کے پاس کافی روپے بھی ہوں گے، رشتہ منظور کر دیا۔ رحمت مدتوں سے ماچھن[13] بھاگاں (بھٹ بھری) کے تندور پر کھانا کھایا کرتا تھا۔ بھاگاں ایک بڑے سے دیگچے میں ہر روز دال سبزی اور کبھی کبھی گوشت بھی پکاتی تھی۔ کنوارے لڑکے اکثر اوقات ہر روز دوپہر اور رات کے وقت بھاگاں کے ہوٹل نما تندور پر کھانا کھاتے تھے۔ وہ ماش کی دال بہت ہی مزیدار بنایا کرتی تھی۔ میں نے شکورے کے ساتھ کئی بار بھاگاں کے تندور پر ماش کی دال کھائی تھی۔ مجھے اس کا ذائقہ کبھی نہیں بھولا تھا — آج بھی یاد ہے۔

گاؤں کے نوجوانوں نے حیرت اور غم میں بہت آنسو بہائے ہوں گے کیونکہ ذکو چھری نے شادی کے لیے ہاں کر دی تھی۔ ذکو اور رحمت ڈھولی کی شادی ہو گئی۔ احمد خان ڈھولی فرقہ واریت سے واقف تھا۔ احمد خان کی ماں شیعہ تھی لیکن باپ سنی تھا۔ انھوں نے بھاگ کر شادی کی تھی۔ ذکو چھری کا تعلق اہل تشیع سے تھا۔ برادری والے احمد خان کو سنی ہی سمجھتے تھے۔ ذکو سے اس کی دوسری شادی ممکن نہ تھی، پھر بھی عشق کی آگ میں جلتے ہوئے اس نے ذکو چھری کی شادی پر جس والہانہ انداز میں ڈھول بجایا، گاؤں والوں کو ہمیشہ یاد رہے گا۔ ذکو چھری اور رحمت ڈھولی چھ ماہ ہی ساتھ رہ سکے۔ رحمت کافی سنبھل گیا تھا۔ وہ چرس بھی بہت کم پینے لگا تھا لیکن ایک دن چرسیوں کی محفل میں ضد میں آکر اپنی برداشت اور دلیری دکھانے کے لیے اس نے سگریٹ کے بجائے چار پانچ سگریٹوں کی چرس چلم[14] میں ڈال کر اس قدر دھواں اپنے پھیپھڑوں میں اتارا کہ اسے گھر کی طرف جاتے ہوئے

---

13 تندور پر روٹیاں لگانے والی۔

14 سیدھا حقہ جو [illegible]۔

ہارٹ فیل ہو گیا" اور وہ گھر کے قریب گلی میں گر کر مر گیا۔ ذکو رنڈی ہو گئی۔

تین مہینے گزر گئے۔ کسی نے ذکو کی خبر نہ لی۔ وہ رحمت ڈھولی کے گھر پر تالا لگا کر اپنے آبائی گھر میں آ گئی۔ ایک صبح اس کے کسی رشتے دار نے گاؤں کے ایک اوباش نوجوان کو ذکو پھرکی کے گھر سے نکلتے دیکھا۔ برادری میں شور مچ گیا۔ بوڑھے جوان ادھیڑ عمر کے میراثی اور ان کی عورتیں، استاد خادم حسین سرنائی والے کے گھر جمع ہوئے۔ کالونی سے احمد خان ڈھولی بھی گیا۔ ذکو پھرکی کو بھی بلا لیا گیا۔ اس اکٹھ کی روداد مجھے احمد خان ڈھولی نے سنائی تھی۔ استاد خادم حسین سرنائی والے نے اٹھ کر کہا:

"ہم دھاڑی[15] ہیں، کنجر نہیں۔ ذکو کی حرکت سے ہم بہت بے عزت ہوئے ہیں۔ ذکو کا باپ دھاڑی تھا، کنجر نہیں تھا۔ ذکو کی ماں شریف تھی، ہماری بہن تھی۔ ذکو کا باپ ہمارا بھائی تھا۔ ہمارے دادے پردادے تو ربابیے[16] بھی تھے۔ وہ راجہ رنجیت سنگھ جی کے وقت حسن ابدال حاضر گوردوارہ پنجہ صاحب پر شبد کیرتن کیا کرتے تھے۔ اور یہ ذکو، اس نے تو ہمارے سر ہی ننگا کر دیا ہے۔ ہمارے چہروں پر کالک مل دی ہے۔ کسی کو شکل دکھانے کے لائق نہیں چھوڑا۔ ہم تو اپنی عورتوں کو اس گھر میں نہیں جانے دیتے جہاں کسی مرد کے متعلق شک ہو کہ اچھا آدمی نہیں ہے۔ اور اس کلموہی نے نہ صرف اپنے منہ پر کالک ملی ہے بلکہ ہمارے دادے پردادے، سب کے منہ پر کالک تھوپ دی ہے۔ مولا علی مشکل کشا ہماری مشکل دور کرے.. ہماری مدد کرے۔ ہم تو برباد ہو گئے۔ ہماری لڑکی اور کنجری... ہماری لڑکی اور پیشہ..."

اس سے پہلے کہ کوئی اور بولتا، ذکو پھرکی نے اپنا دوپٹہ اتار کر استاد سرنائی والے کے قدموں میں پھینکا۔

"ہاں کیا" ذکو پھرکی نے بلند آواز میں کہا۔ "کیا پیشہ اور کرتی رہوں گی۔ تین مہینے ہو گئے ہیں، پوچھا کسی نے کہ ذکو کس حال میں ہے؟ گھر میں آٹا نہیں، دال نہیں، چاول نہیں، گڑ نہیں، گھی کا

---

[15] میراثی ٹولے گانے بجانے والے خاندانی فنکاروں کو دھاڑی کہتے ہیں اور دیگر لوگ ان کو ڈھاڑی کہا کرتے ہیں

[16] ربابیے وہ میراثی ہوتے ہیں جو گوردواروں میں شبد کیرتن کے ماہر ہوتے ہیں۔ مسلمان ہونے کے باوجود وہ سکھوں کی نگاہوں میں بہت باعزت ہوتے ہیں۔

Scanned with CamScanner

خالی ہے، چوہدری جانتے ہیں کہ بے قصور ہیں نہیں۔ پوچھا کسی نے۔ "ڈکو کی تنخواہ بڑھ گئی نہیں؟" ڈکو کی آواز روہانسی ہوگئی۔ "چوہدری کی بیوی مائی سے مانگنے گئی تو اس نے بھی نہ دی۔" ڈکو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"گاؤں میں تین مہینوں سے نہ کوئی بچہ پیدا ہوا ہے نہ جھنڈ اتری (عقیقہ ہو) ہے نہ ہی شادی ہوئی ہے، نہ ہی کوئی اور کوئی خوشی۔ ورنہ میں کما لیتی (بدنصیب) خالی پیٹ ہی مر رہی ہوں۔" ڈکو رونے لگی۔ "چھ روپے جو رحمت چھوڑ گیا تھا وہ بھی نہ ہوتے تو میں تین مہینے بھی نہ گزار سکتی۔ بھوکی مر گئی ہوتی۔ کیا کروں میں؟" ڈکو نے چیخ کر کہا۔ "بولو کیا کروں؟ پھاہ (پھانسی) لے لوں یا مہورا پھک لوں (زہر کھا لوں)؟ کیا کروں؟ مجھے بتاؤ میں کیا کروں؟" پھر ڈکو نے ہتھیلی سے آنسو پونچھے اور ڈٹ کر کھڑی ہوگئی۔

"چار گہنے ہیں میرے پاس پر کیوں بیچوں؟... ہو میں اپنے گہنے کیوں بیچوں؟ جوان ہوں، خوبصورت ہوں۔ مائی نے اور تم لوگوں نے مجھے رنڈے (رنڈوے) چری سے بیاہ دیا۔ میں چپ رہی۔ چری تھا لیکن اچھا آدمی تھا۔ چار پیسے کما تو رہا تھا۔ چولہا جل رہا تھا میرا صبر تھا مجھ میں۔ خوش تھی میں رحمت کے ساتھ۔ اب وہ بھی نہیں ہے۔ میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ کیا کروں میں؟" وہ پھر چیخی۔ "میری طرف دیکھو، سر کیوں جھکا رکھے ہیں؟ جوان ہوں، خوبصورت ہوں۔ بولو، ہے کوئی تم میں، ہے کوئی جو میرا ہاتھ پکڑے؟ جوان، بڑی عمر کا، بڈھا، کوئی بھی، بولو، ہے کوئی؟ کروں گی" ڈکو نے چھاتی پر ہاتھ مار کے "کروں گی شادی۔ بولو، ہے کوئی؟"

سب خاموش ہوئے۔ جوانوں کو ڈکو پر غصہ تھا کہ اس نے رحمت ڈھوں کے لیے ہاں کیوں کی تھی، ادھیڑ عمر کے شادی شدہ اپنے بال بچوں کے ساتھ سکھی تھے۔ بوڑھوں کو شاید اپنی عمر کا خوف تھا۔ سب خاموشی سے ایک دوسرے کا منہ دیکھتے رہے اور یہ اکٹھ اس فیصلے پر ختم ہوا کہ گاؤں کا کوئی ڈکو سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ ڈکو برادری سے خارج ہوگئی۔ اسے کسی کی پرواہ نہ تھی۔ امام ڈھوں نے بتایا کہ کچھ کے بعد ایک لوہار نے اپنے دوستوں سے کہا

"چھوٹی ہوئی ٹنڈیری تاں پھوٹ کوں چھوڑسی۔ سادہ دل تاں رحمت تیڈی پی گیا ہوسی۔ اس حرامی کے چھوڑیا ہوئی ہن کی تاں بتو کون سنبھے" (جس بھونی ٹنڈیری کے پھوک کون چوسے گا۔

سارا رس تو رحمت چوہدری پی گیا ہوگا۔ اس حرامی نے باقی کیا چھوڑا ہوگا۔ اب کتیا کا ہاتھ کون پکڑے۔)

ہر عمر کے لوگ ذکو پھرکی کے پاس جانے لگے۔ ارد گرد کے دیہات سے بھی دیہاتی ذکو جی کی نے گاہکوں میں شامل ہو گئے۔ اس کے پرانے تمام عاشق جو اس سے شادی کرنا چاہتے تھے، اب اس کے گاہک بن گئے، پیسے دے کر آسودگی حاصل کرنے لگے۔ کیمپنی کالونی کے کچھ چھڑے بھی چھپ چھپ کر ذکو پھرکی کے در آسودگی پر دستک دیتے تھے۔ شکورے کو تو کسی کا خوف نہیں تھا۔

ذکو پھرکی کو برادری سے خارج کرنے کے بعد بھی بوڑھے میراثیوں کا غصہ نہ اترا۔ کھوڑ کے تھانے میں پنڈی گھیب سے ٹرانسفر ہو کر ایک چوڑے منہ، چھوٹے قد اور موٹی توند والا تھانیدار آیا۔ استاد سرنائی والے کے ساتھ چند ادھیڑ عمر کے میراثی کالونی میں آئے، احمد خان ڈھولی کو ساتھ لیا اور تھانیدار کے پاس جا کر ذکو پھرکی کے خلاف شکایت کی۔ تھانیدار خود ذکو پھرکی کے گھر گیا اور اگلے روز اس نے میراثیوں کے وفد کو بلا کر ان کی بہت بے عزتی کی۔

'ایک بیوہ کو ستاتے ہوئے تمھیں شرم نہیں آتی؟'' تھانیدار نے غصے سے کہا۔ ''اس کی شادی کیوں نہیں کرا دیتے؟ اگر کچھ لوگ خیرات دینے یا صدقے لے کر اس بیچاری کے دروازے پر چلے جاتے ہیں تو تمھیں کیوں تکلیف ہوتی ہے؟ خود تو اس کی مدد کر نہیں سکتے، اگر کوئی کرتا ہے تو تم سے برداشت نہیں ہوتا۔ تم لوگ تو یہی چاہتے ہو کہ ساری خیرات، زکوٰۃ اور صدقے کی رقم صرف تمھیں ملے... چلے جاؤ... دوبارہ میرے پاس نہ آنا۔''

احمد خان ڈھولی نے بعد میں بتایا کہ جب سب میراثی منہ لٹکائے تھانے سے واپس آ رہے تھے، استاد سرنائی والے نے دوسروں کی طرف دیکھ کر کہا:

'لو بھائی ذکو نے تاں تھانیدار بھی ڈھا گدا اے۔'' (لو بھائی، ذکو نے تو تھانیدار بھی گرا لیا ہے۔)

'کیوں نہ ڈھاندا، کتی سوہنی جے بہوں اے'' (کیسے نہ گرتا، کتیا خوبصورت جو بہت ہے') ایک اور بولا۔ اور اس کے بعد ذکو باقاعدہ پیشہ ور طوائف بن گئی۔

شکورے نے مجھے بتایا کہ ذکو اس کا بہت خیال رکھتی ہے۔ اس نے ہفتے کی ایک رات شکورے کے لیے وقف کر دی ہے۔ اس رات وہ کسی کو گھر میں نہیں گھسنے دیتی، بیماری کا یا سر درد کا بہا

Scanned with CamScanner

بنا لیتی ہے۔ شیدں کو یاد کرتے ہوئے بہت روتی ہے۔ شکورا بھی ذکو چھرکی کے پاس باقاعدگی سے جانے لگا۔ وہ جس باقاعدگی سے ذکو چھرکی کے پاس جاتا تھا، اسی باقاعدگی سے اس پر پاگل پن کے دورے بھی پڑنے لگے تھے۔ اسے زندگی میں جس جس نے بھی دکھ دیے تھے، وہ ان سب کو مغلظ گالیاں دیتا تھا۔

ایک آنکھ والا اسحاق چیال گاؤں سے سائیکل پر بندھے ایک ٹوکرے میں سبزی، کرکا دنی کے گوردروں میں بیچا کرتا تھا۔ ایک دن شکورے نے بازار کے حاطے میں اس سے اٹھارہ روپے کی سبزی خریدی۔ شکورے کے پاس سو روپے کا نوٹ تھا۔ اسحاق نے کہا کہ "میرے پاس بقایا کے لیے کھلے پیسے نہیں۔ تو دکان پہ جا، میں نوٹ تڑوا کر تیرے بقایا بیاسی روپے دے جاؤں گا۔" شکورا دکان پر آ گیا۔ شام ہو گئی، اسحاق نہ آیا۔ ساری رات شکورا پریشان رہا اور صبح پیدل ہی چیال جا پہنچا۔ اسحاق کے گھر گیا تو پتا چلا کہ وہ تو کل شام ہی راولپنڈی چلا گیا ہے، اسے کوئی نوکری مل گئی ہے۔ شکورے نے پیسے مانگے تو اسحاق کے بھائی نے آنکھیں دکھائیں۔

"کیسے پیسے؟ تو نے مجھے نوٹ نہیں دیا۔ جتنی بات ہے، جس کو دیا، اس سے لے۔ ساکا (اسحاق) آئے گا تو کہہ دوں گا۔"

شکورا حسبِ معمول غصے سے بڑبڑاتا واپس آیا۔ اسی سہ پہر اس پر دورہ پڑ گیا۔

"ہاں اوسا ئیا کانیا، جھنڈی میں .." (ہائے او ساکے کانے، تیری میں)

اس کا ہتھوڑا تنہائی پر پوری قوت سے گر رہا تھا۔ شکورا اکثر تصوراتی جانوروں، پرندوں اور حشرات الارض کو بھی گالیاں دیتا تھا۔

"ہاں وچٹیا باندرا، جھنڈی میں ..." (ہائے وے سفید بندر، تیری میں ..) تب یہ گالی پڑوسی نثار خان کے لیے تھی۔

"ہاں او کن کپیا بو بیا، جھنڈی میں۔" (ہائے او کان کٹے بوبلے، تیری میں۔)

"ہاں او ذھوذر کا نواں، جھنڈی میں۔" (ہائے او بے ذی کوے، تیری میں۔)

"ہاں او نا نگیا ککڑا[17] جھنڈی میں۔" (ہائے وے ننگے مرغے، تیری میں)

---

[17] اصیل مرغوں کی ایک قسم جس کی گردن پر صرف کھال سرخ رنگ نظر آتا ہے، پر نہیں ہوتے۔

Scanned with CamScanner

''ہانی پچھ پکی کرے، سینڈی میں '' (ہائے ری دم کٹی چھپکلی، تیری میں)

یوں لگتا تھا کہ اس کے تصور میں تصویروں کے ذریعے چل رہے ہوتے تھے، وہ جسے اپنے تصور میں دیکھتا تھا اسی کو گالی دیتا تھا۔ اس کی انھی گالیوں کو سننے اور اس کا تماشہ دیکھنے کے لیے دکان کے سامنے ہجوم سا ہو جایا کرتا تھا۔ دیہاتی زور زور سے ہنستے، قہقہے لگاتے، اسے بتاشے بھی دیا کرتے تھے۔

7

سکائی لیب میں شکورے کی دلچسپی سے میرے ذہن میں ایک ہی اندیشہ تھا: "کیا وہ عمومی حالت میں ذہنی طور پر تندرست ہے؟ سکائی لیب گرنے کی باتیں ہر جگہ ہو رہی تھیں۔

''زمین پر خشکی کے مقابلے میں پانی کہیں زیادہ ہے،'' میں نے سوچا۔ ''امکان تو یہی ہے کہ سکائی لیب کسی سمندر میں گرے گی بحر الکاہل یا بحر اوقیانوس میں۔ ممکن ہے کہ قطبین کی برف پر گرے۔ لیکن اگر وہ کسی ملک کی آبادیوں پر گری تو خاصا جانی اور مالی نقصان ہوگا۔''

شکورے کے دیوانے پن کا باعث تو میں جان ہی چکا تھا، تصدیق ہونا باقی تھی۔ میرے سامنے دو ہی راستے تھے: یا تو اسے اس پاگل پن سے نکالنے کی کوشش کروں یا اس کے دیوانے پن کا سکھ دوں۔ مجھے اب صرف تصدیق کی ضرورت تھی۔ 11 جولائی کو صبح خبروں میں بتایا گیا کہ سکائی لیب گیارہ اور بارہ جولائی کی درمیانی رات میں زمین پر گرے گی۔ سہ پہر کو میں شکورے کے پاس گیا۔ جولائی کی سہ پہر حبس، گھٹن کو پھیلاتی ہے، وہ شام تک بدن کو پسینے سے بھگوئے رکھتی ہے۔ مجھے دیکھ کر شکورے کی نیم وا آنکھیں چمکیں۔ پسینے سے اس کا کرتا اس کے سینے اور پیٹ سے چپکا ہوا تھا۔ وہ دکان سے باہر آیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا۔

''جو بات میں تجھ سے کرنے لگا ہوں،'' اس نے ایک موڑھا کھینچ کر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا، ''اسے مذاق نہ سمجھنا۔''

وہ چوکی پر بیٹھ گیا اور دکان سے باہر دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر تجسس نمایاں تھا۔ وہ کچھ دیر دکان سے باہر دیکھتا رہا، پھر اس نے میری طرف کھلی آنکھوں سے دیکھا۔

''سکائی لیب کس چیز کی بنی ہوتی ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

Scanned with CamScanner

"کیا سکائی لیب؟" میں نے بھی پوچھا۔

"ہاں — سکلیب — کس چیز کی بنی ہوتی ہے؟" شکورے کے چہرے پر سوالیہ تاثر تھا۔

"مجھے نہیں معلوم،" میں نے کہا۔ "شاید المونیم کی ہو یا شاید ایسبسٹاس (Asbestos) کی، کرائسوٹائلز (Chrysotiles) سے ڈھکے اسٹین لیس اسٹیل کی۔ اندر سے تو فولاد کی بنی ہوئی۔"

شکورے کے چہرے پر غصہ سا ابھرا۔

"مجھ پر پڑھے لکھے ہونے کا رعب مت ڈال کر،" اس نے غصے سے کہا اور مجھے اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ میں کس کے سامنے قیاس آرائی کر رہا ہوں۔

"سیدھی طرح بتا سکلیب کس چیز کی بنی ہو گی؟" شکورے کا لہجہ جیسے ہو گیا۔ "لوہے کی ہو گی یا نہیں؟"

"ہاں، لوہے ہی کی ہو گی،" میں نے کہا اور شکورے کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مجھے بغور دیکھا، کچھ دیر خاموش رہا، پھر آگے کی سمت جھک کر اس نے چہرہ میری طرف اٹھایا۔

"کشف ہوا ہے مجھے۔" اس نے رازدارانہ انداز میں کہا۔ "جانتے ہو، کشف کیا ہوتا ہے؟ نیند جاگنے سے پہلے جو جواب آئے وہ کشف ہوتا ہے — بالکل سچا جواب۔ آج صبح خواب میں مراد شاہ آئے تھے۔ پیر جی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ تیرے سب دکھ دور ہونے والے ہیں۔ سکلیب کوڑے کی منڈی میں گرے گی اُدھر" شکورے نے جنوب مغرب کی سمت اشارہ کیا۔ شکورے کے دیوانے پن کے باعث سے متعلق میرا اندازہ درست تھا۔ تصدیق ہو گئی۔ اب میری آنکھیں بھیگ سی گئیں۔

"شکورے،" میں نے آہستہ سے کہا، "اُدھر تو بنگلوں میں سرونٹ کوارٹرز ہیں، پولیس اسٹیشن اور کمپنی کے دفاتر ہیں۔ کئی لوگ ہوں گے بنگلوں اور سرونٹ کوارٹرز میں۔ کئی لوگ بال بچوں کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ پولیس اسٹیشن میں رات کی ڈیوٹی دینے والے سپاہی بھی ہوں گے، دفاتر میں شفٹ کے چوکیدار بھی ہوں گے۔"

"انھیں کچھ نہیں ہو گا،" شکورے نے کہا۔ "سکلیب منڈی میں گرے گی، پیر جی نے کہا ہے۔"

”وہ میری طبیعت ہوں“ منشورے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی، آنکھوں میں خوشی کی چمک۔

جنوب مغرب کی جانب، بنگلوں کی قطار میں دوسرے بنگلے سے میری بچپن کی یادیں جڑی ہوئی ہیں۔ مدتوں پہلے میں وہاں اپنے والد صاحب، والدہ اور بھائی بہنوں کے ساتھ رہتا تھا۔ بنگلوں کے پیچھے سرونٹ کوارٹرز ہیں اور سرونٹ کوارٹرز سے بیس قدم آگے پہاڑی کی ڈھلوان نظر آتی ہے۔ پہاڑی کے پیچھے جوہڑ ہے جسے مقامی زبان میں ڈنّی کہا جاتا ہے۔ جوہڑ تین طرف سے تین پہاڑیوں سے گھری ہوئی ہے اور مشرق کی جانب ڈنّی کا کنارہ کھلا ہے۔ اس کھلے کنارے کے آگے اجاڑ میدان ہے جو جھاڑیوں سے اٹا ہوا ہے۔ برساتی جوہڑ کی مغربی سمت میں درمیانی پہاڑی میں ایک دراڑ ہے۔ یہ دراڑ دراصل پہاڑی کے پیچھے ایک برساتی نالے کا دہانہ ہے۔ برسات کے دنوں میں اس دراڑ سے گدلا پانی جوہڑ میں جھرنے کی طرح گرتا ہے اور جوہڑ کو بھرتا رہتا ہے۔ جوہڑ دس بارہ فٹ گہرا ہے۔ زیادہ بارش کے دنوں میں جوہڑ کا پانی مشرقی کنارے سے بہہ نکلتا ہے، لیکن وہ کالونی کے کوارٹروں تک کبھی بھی نہیں پہنچتا؛ کوارٹر قدرے بلندی پر ہیں۔ پانی جوہڑ سے کوارٹروں تک اجاڑ میں پھیل جاتا ہے۔ مون سون کی بارشوں سے بھی جیٹھ ساڑھ کی جھلسی ہوئی مٹی کی پیاس نہیں بجھتی اور وہ جوہڑ کے کنارے سے بہہ کر آنے والے پانی کے گھونٹ بھرنا شروع کر دیتی ہے۔ جھاڑیوں بھرا اجاڑ میدان بڑ اور کے احاطے سے پہلے پرائمری سکول کے سامنے کھوڑ گاؤں کی طرف جانے والی سڑک تک پھیلا ہوا ہے اور جنوب کی سمت اس ریتیلے میدان تک چلا جاتا ہے جہاں سکول کے لڑکے سانڈے پھانسا کرتے تھے۔

ساون بھادوں میں اجاڑ میدان کی جھاڑیاں سرسبز ہو جاتی ہیں اور ان کے نیچے لمبی لمبی ہرے سبز رنگ کی گھاس اُگ آتی ہے۔ یہی وہ موسم ہے جب اس اجاڑ میدان کی جھاڑیوں اور لمبی گھاس میں وحشی سنہری رنگے کوبرے اپنی سلطنت قائم کر لیتے ہیں۔ برساتی جوہڑ سے تارکول کی پکی سڑک تک بیل اور گدھا گاڑیوں کے لیے دس بارہ فٹ چوڑا کچا راستہ ہے جو ترچھا ہو کر جوہڑ سے سڑک تک چلا جاتا ہے۔ برسات کے دنوں میں سورج ڈوبنے کے بعد کوئی شخص بھی اس کچے راستے پر آنے کی جرأت نہیں کرتا۔ رات کے وقت کوبرے رینگتے ہوئے تارکول کی سڑک پر بھی پہنچ جاتے ہیں وہاں بھی مار گزیدگی کے واقعات رونما ہو چکے ہیں۔ کمپنی کا ایک چوکیدار اور پولیس کا ایک سپاہی تارکول

کی سڑک پر کوبرے کا شکار ہو چکے ہیں۔ گرمیوں میں جوہڑ کا پانی سوکھ کر تین چار فٹ ہی رہ جاتا ہے۔ جوہڑ ایک پیالے کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور کناروں پر کیچڑ کی تہیں سوکھ کر، پھٹ کر آڑی ترچھی لکیریں سی بنا دیتی ہیں۔

"تو چپ ہو گیا ہے شکورے؟" میں نے پوچھا۔

"سکائی لیب کیا آج رات ہی گرے گی؟" شکورے نے بھی سوال کیا۔

"خبر تو یہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"دیکھ، میں ایک بندہ ہوں" شکورے نے لجاجت سے کہا۔ "مدد کی ضرورت ہے مجھے، اور یہ مدد تو ہی مجھے دے سکتا ہے۔"

شکورے کی اس بات پر میں گھبرا گیا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا جہاں وحشت زدہ چمک تھی۔

"کیا تو رات ٹبی پر رہنا چاہتا ہے؟" میں نے اس کے ارادے کا اندازہ لگاتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، پر صرف تیرے ساتھ۔" شکورے نے کہا۔ "مجھے کسی اور پر بھروسہ نہیں۔ راتی بہت بری شے ہوتی ہے۔ کسی اور کو لے گیا وہ اس کی نیت خراب ہوگئی تو مجھے قتل کر کے سکائی لیب پر قبضہ کر لے گا اور کہہ دے گا کہ میں سکائی لیب گرنے سے مر گیا ہوں۔ تو میرا اچھا یار ہے، حضری یار۔"

میں اس نئی مصیبت سے گھبرایا ہوا تھا۔ مون سون کی بارشیں ابھی شروع نہیں ہوئی تھیں۔ موسم گرم تھا۔ اس موسم میں کوبرے زمین کے اندر ٹھنڈی مٹی میں اپنی بانبیوں کے اندر پڑے رہتے ہیں، لیکن رات کے وقت ہوا ٹھنڈی ہو جانے پر خوراک کی تلاش میں وہ یقیناً باہر نکلتے ہوں گے۔ اس علاقے میں چوہے کم اور چھچھوندریں زیادہ ہیں۔ سست رفتار چھچھوندریں کوبروں کے لیے آسان شکار ہوتی ہیں۔ جوہڑ پر رات گزارنا مجھے خطرناک محسوس ہوا۔

"شکورے،" میں نے کہا، "سکائی لیب تو رات ہی کو گرے گی۔ صبح جا کر دیکھ لیں گے۔"

"تاکہ رات کو کوئی اور لے جائے!" شکورے نے خفگی سے کہا۔ "ہاں، ایک بات تو بتا تو رات کو ٹبی پر جانے سے ڈرتا تو نہیں ہے؟" اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

Scanned with CamScanner

"شکورے،" میں نے سمجھاتے ہوئے کہا، "رات کو وہاں جانا خطرناک ہے۔ کبھی کسی کو دیکھا ہے رات کے وقت بتی پر جاتے ہوئے؟"

شکورا کچھ دیر خاموش رہا پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

"شکیب کا بوہا بھی تو لانا ہے،" اس نے کہا۔ "میں نہیں ڈرتا — میں جاؤں گا۔" اس نے سامنے پڑی بالی کو دیکھا پھر میری سمت منہ گھمایا۔ "پر تو بھائی ہے تو چل میرے ساتھ، میں تو جاؤں گا۔"

مجھے اندازہ نہیں تھا کہ شکورے کا پاگل پن کتنی خطرناک صورت اختیار کرے گا۔ میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ انکار پر شکورے کا بھڑک اٹھنا یقینی تھا۔ وہ پہلے ہی پاگل پن کے دوروں کا شکار تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ خود کو یا مجھے ضرر پہنچائے۔ اس بات کا بھی امکان تھا کہ وہ اکیلا ہی بتی پر چلا جائے اور اسے کوئی حادثہ پیش آ جائے۔ اثبات سے بھی کوئی خطرناک صورت حال پیدا ہونے کا امکان تھا۔ اگر وہ عمومی حالت میں بھی جنون ہی کا شکار ہے تو وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ساری رات کھوڑ میں شمال خنک ہوا چلتی رہتی ہے اور بتی کے آس پاس کا علاقہ کوبرا سانپوں کا گھر ہے۔ میں پریشان سا تھا۔ شکورا میرا جواب سننے کے لیے بے چین تھا۔ مجھے کسی ایک راستے ہی کا انتخاب کرنا تھا، اور بالآخر میں نے دوسرے راستے کا ہی انتخاب کیا حالانکہ اس میں خود میری زندگی بھی خطرے میں پڑ سکتی تھی — کوبرے کے زہر سے یا جنونی شکورے کے ہاتھوں۔

"اچھا شکورے،" میں نے کہا، "میں جاؤں گا۔"

شکورے کی آنکھیں چمکیں، اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر اس قدر تھا کہ چہرہ تمتمانے لگا۔ اس نے میرے دونوں ہاتھ پکڑے۔

"ہاں او جیویں شاہ،[18] تو میرا سچا یار ہے،" شکورے نے خوشی سے کہا، "میرا جگری یار!"

میں یہ بات تو اچھی طرح جانتا تھا کہ کھوڑ کے ارد گرد برساتی پانی کے جوہڑوں پر درندے بھی آتے تھے۔ بچپن میں ہم سنا کرتے تھے، بچے سوچا کرتے تھے، پھر بھی کبھی کبھی بتی کی طرف سے گیدڑوں کی آوازیں آیا کرتی تھیں اور فوراً ہی کالونی کی طرف سے کتے بھی بھونکنا شروع کر دیتے تھے جو رات

---

18 تو جیتا رہ۔ یہ جملہ عموماً عورتیں خوشی میں کہا کرتی ہیں۔

نے وقت کاٹا۔ وہ سب مل کر کچھ روٹی حاصل کیا کرتے تھے۔ بنجر پر یا تو گیدڑ آتے تھے یا لومڑیاں یا سیہ۔ سیہ پالتو مرغیوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ لومڑیاں اس قدر چالاک اور تیز ہوتی ہیں کہ شکاری کتوں کے علاوہ کسی کے قابو میں نہیں آتیں۔ سیہ سے لوگ ڈرتے ہیں۔ سیہ کا کانٹا جسے وہ اپنے دفاع میں مارتی ہے، کسی بھی کتے کو زخمی بنا سکتا ہے۔ اس علاقے میں پہاڑیوں میں گھرے ہوئے نشیبی برساتی پانی کے جوہڑ ہیں اور وہ اجاڑ جنگلوں سی پر جاتے ہیں۔ ایک ایسا ہی چھوٹا سا برساتی پانی کا جوہڑ پہاڑی کے ٹکڑے کے پیچھے سرونٹ کوارٹروں سے دو تین سو گز دور بڑے پیالے کی شکل گرمیوں میں مکمل طور پر خشک ہو جایا کرتا ہے۔ جوہڑ پر خاص طور پر کوبرا سانپوں کا قبضہ تھا۔ وہ اس قدر تیزی سے ڈستے ہیں کہ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ دیہاتی عینک والے کوبرے کے سامنے جا کر بیٹھتے ہیں۔ قریب جا کر ہاتھ میں چادر لے کر اسے چادر پر ڈسوانے کی غلطی جان لیوا ثابت ہوتی ہے۔ وہ ہاتھ یا گھٹنے پر ڈس لیتا ہے۔ کوبرا اتنا نہیں ہوتا کہ اس کا مقابلہ بلی یا نیولے کی طرح کیا جائے۔

"ایک مسئلہ ہے،" شکورے نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "سکلیب کرنے کی تو ضرورت جائے گی۔ میں اس کے ٹکڑے دکان پر کیسے دوں گا؟"

"ہاں شکورے، یہ مسئلہ تو ہے،" میں نے کہا۔

"ٹھہر،" شکورا اپنے کسی خیال پر چونکا۔ "نارے کی گھوڑا گاڑی ہے۔" (گدھا گاڑی۔)

نارخان کی ذریعہ معاش برساتی پانی کے جوہڑ سے جنوب کی سمت دو چار کھیتوں سے آتی تھی۔ ان کے کھیتوں میں بھی بارانی علاقے کے تمام کسانوں کی طرح فصل کا انحصار بارش پر تھا۔ بارانی علاقوں میں نہ ٹیوب ویل ہیں نہ رہٹ، کنوؤں میں پانی بہت گہرائی پر ملتا ہے۔ فصلوں میں بھی صرف چنا اور مونگ پھلی ہی اپنی بقا کی ناتوانی جنگ جیتا کرتی ہیں۔ صرف سیہول نامی ایک ایسا گاؤں ہے جو نشیب میں ہے اور نیم ورود کی بڑی جھیل کے قریب ہے۔ جھیل سے پانی رس رس کر وہاں جمع ہوتا رہتا ہے۔ وہاں رہٹ موجود ہیں اور وہاں کسان زیادہ تر سبزیاں ہی اگاتے ہیں۔ نارخان نے گزر اوقات کے لیے گدھا گاڑی بنا رکھی تھی۔ وہ ہر روز سیہول جا کر وہاں سے سبزیاں گدھا گاڑی پر لاد کے کالونی کے بازار میں لایا کرتا تھا اور وہاں سبزی فروشوں کو بیچ دیا کرتا تھا۔ سبزی فروش وہاں کے ہی تھے جو کیمپ کے کھودے احاطے کو گالیاں دیا کرتے تھے۔ وہ سائیکل پر ٹوکروں میں سبزی لاتے

ہے۔ اسحاق کے جانے پر جہاں شکورے نے اسے گالیاں دی تھیں وہاں سبزی فروشوں نے بھی سکون کا سانس لیا تھا۔ نادر خان معمولی منافعے پر سبزیاں بازار میں تھوک کے حساب سے بیچ دیتا تھا۔ مہینے میں اسے معقول منافع ہو جایا کرتا تھا۔ اچھی بارشوں کے بعد اگر اس کی فصل بھی اچھی ہو جاتی تھی تو بھی وہ گدھا گاڑی والا کام جاری رکھتا تھا۔ نادر خان سویرے سویرے گدھا گاڑی پر بیٹھ کر خطرناک رستے سے گزرتا تھا۔ خود تو محفوظ رہتا تھا لیکن برسات کے موسم میں اس کا ایک گدھا کوبرے کے ڈسنے سے مر بھی گیا تھا۔ وہ دو تین دن بعد ہی نیا گدھا لے آیا، لیکن اس نے سورج نکلنے سے پہلے ہسپتال جانا بند کر دیا تھا۔

"نادر اتنی رات گئے کھوتا ریڑھی کیسے دے گا شکورے؟" میں نے کہا۔

"اس کی ماں ..." شکورے نے اسے گالی دی۔ "میں کچھ نہیں جانتا — کھوتا ریڑھی دینا تیرا کام ہے۔"

"شکورے،" میں نے کہا۔ "یوں کریں گے کہ جب سکائی لیب گرے گی تو میں کوئی بہانہ بنا کر کھوتا ریڑھی لے آؤں گا۔ نادر کو کرایہ دے دیں گے۔"

خلاف توقع شکورا مان گیا۔ نادرے نے دھوک میں گدی کتوں[19] کا جوڑا پال رکھا تھا۔ اگر شکورے کا دھیان ان کی سمت چلا جاتا تو وہ میرے لیے کوئی اور مشکل کھڑی کر دیتا۔

"ٹھیک ہے،" شکورے نے کہا۔ "میں رات ساڑھے نو بجے آؤں گا۔"

"ساڑھے نو بجے؟" میں نے چونک کر کہا "اتنی دیر سے؟"

"او بیوقوف!" شکورے نے کہا۔ "اندھیرے ہی میں آسکوں گا، ورنہ کوئی دیکھ لے گا۔ دھماں جانے والے چوکیدار رات نو بجے چلے جاتے ہیں۔"

شکورے نے اٹھ کر چوکی کو پاؤں سے پیچھے ہٹایا۔ میں بھی اٹھا۔

"پتر ریڈوا (ریڈیو) لانا نہ بھولنا۔" اس نے میرے ٹرانزسٹر ریڈیو کی سمت اشارہ کیا جو اکثر ایک چمڑے کی پٹی کے ساتھ میرے گلے میں لٹکا رہتا تھا اور جس پر میں چلتے چلتے گانے سنا کرتا تھا۔

"خبریں تو سنی پڑیں گی۔"

---

19 بل ٹیریر کی ایک مقامی قسم جو بہت خطرناک ہوتی ہے

Scanned with CamScanner

"اچھا سے آؤں گا،" میں نے کہا۔ "تو آجانا، میں تیار رہوں گا۔"

8

بھائی کے بنگلے کی سمت جاتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ جوہڑ کی جو پہاڑی مروٹ کوارٹرز کی سمت ہے، اس کے نیچے ایک اور چٹان بھی ہے جس کا جوہڑ کی سمت والا حصہ عمودی ہے اور جو عقب سے ٹوٹی پھوٹی ہے۔ اس چٹان کا مغربی حصہ قدرے ڈھلوان ہے لیکن نیچے دو بڑے بڑے پتھر ہیں اور مشرقی ڈھلوان اس کچے راستے پر ختم ہوتی ہے جو تارکول کی پکی سڑک پر جا کر جھاڑیوں کے درمیان ختم ہوتا ہے۔ موسم سرما میں، جب میں چھٹی کے دن سکول کا کام ختم کر بیٹھتا تھا تو کتابیں ایک سمت رکھ کر مروٹ کوارٹرز کا چکر کاٹ کر اسی عمودی چٹان پر بیٹھ کر دیر تک درمیانی پہاڑی کی اس دراڑ کو دیکھتا رہتا تھا جہاں سے برسات کے دنوں میں پانی جھرنا بن کر گرا کرتا تھا۔ اس چٹان پر اتنی جگہ ہے کہ دو شخص آرام سے بیٹھ جائیں۔

"وہی موزوں رہے گی،" میں نے سوچا۔ "کچھ بھی ہو، مجھے اب شکورے کے پاگل پن کا ساتھ تو دینا ہوگا۔"

میں ہاکی گراؤنڈ کے پاس پہنچ چکا تھا۔ ایک خیال مجھ پر بوجھ بن کر اترا۔

"کہیں میں بھی تو بازار کے لوگوں کی طرح شکورے کے پاگل پن سے تفریح حاصل کرنے کے لیے یہ خطرہ نہیں اٹھانے والا ہوں؟"

اس سوال کا جواب میرے شعور میں نہیں تھا۔ لاشعوری عوامل سے میں بے خبر تھا، پھر بھی میں نے خود کو یقین دلایا کہ میرا ایسا کوئی مذموم ارادہ نہیں ہے۔

"میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ شکورے کو تلخ حقائق سے آگاہی مل جائے۔ اگر یہ ہو گیا تو وہ اپنی آئندہ زندگی میں کسی کشف کے فریب میں نہیں آئے گا۔ یہ بات تو طے ہے کہ سکائی لیب کسی سمندر ہی میں گرے گی۔"

رات کو کھانے پر میں نے بھائی کو بتایا کہ میں آج رات شکورے کے ساتھ رہوں گا۔ میں کہاں رہوں گا، اس بارے میں میں نے کچھ نہیں بتایا۔

Scanned with CamScanner

"اس پاگل کے ساتھ؟" بھائی نے چونک کر کہا۔ "وہ تو سنکی ہے، تمھیں بہت پریشان کرے گا۔"

"نہیں بھائی،" میں نے کہا۔ "وہ مکمل طور پر پاگل نہیں ہے۔ حالات اور لوگوں نے اسے پاگل بنا رکھا ہے۔"

"دورے پڑتے ہیں اسے،" بھائی نے کہا۔ "اور تم کہتے ہو وہ پاگل نہیں ہے؟"

"لوگوں کا سنگدلانہ رویہ اسے پاگل پن کی سمت کھینچ رہا ہے،" میں نے کہا۔ "ہر کوئی اسے چھیڑتا ہے۔ جہاں کہیں جاتا ہے لوگ آوازے کستے ہیں۔ بازار کے سارے لوگ ہر روز اسے کوئی نہ کوئی ایسی بات کہہ دیتے ہیں کہ وہ بھڑک اٹھتا ہے۔ اپنی مفت کی تفریح کی خاطر وہ اسے چین نہیں لینے دیتے۔ اس کے باوجود وہ دکان پر بیٹھ کر اپنا کام کرتا رہتا ہے۔ ویلڈنگ پلانٹ کے بغیر بھی کوئی خاص رکھے بغیر وہ لوہے کے حلقے اور زنجیریں بناتا رہتا ہے۔ اگر لوگ اس پر رحم کریں، اسے چھیڑنا اور ستانا چھوڑ دیں تو وہ دنوں ہی میں ٹھیک ہو جائے گا۔ اکیلا ہے اور بہت دکھ دیکھے ہوئے ہیں اس نے۔"

بھائی نے غور سے میری طرف دیکھا۔ "ایسا ہونا ممکن نہیں،" انھوں نے کہا۔ "میں یہاں کے لوگوں کی خصلت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ بوڑھے ہو جاتے ہیں لیکن دماغ پرائمری سکول کے لڑکوں جیسا ہی رہتا ہے۔ وہ چھیڑنا اور ستانا نہیں چھوڑیں گے۔"

"ویسے —" بھائی کے چہرے پر مسکراہٹ سی آئی، "تمھیں بہت خیال ہے شکورے کا!"

"میرا بچپن کا دوست ہے،" میں نے کہا۔ "پرائمری سکول میں ہم اکٹھے پڑھا کرتے تھے۔ وہ تیسری جماعت میں تھا جب ماسٹر محمد جان نے اسے سکول چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا،" میں نے آہستہ سے کہا۔ مجھے شکورے کی زندگی کا وہ بدترین دن پھر یاد آ گیا۔ "وہ میرے ساتھ بہت خوش رہتا ہے بالکل نارمل۔ آپ فکر نہ کریں، میں صبح آ جاؤں گا۔"

"منزل کا گیٹ تو کھلا ہی رہتا ہے،" بھائی نے کہا۔ "برآمدے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ یہاں چوریاں نہیں ہوتی ہیں۔ اگر ہوتی بھی ہیں تو بازار اور کوارٹروں کی طرف ہوتی ہے۔"

9

رات ساڑھے نو بج گئے، شکور نہ آیا۔ میں نے بھائی کے فل بوٹ پہنے جو وہ اکثر فیلڈ میں

جاتے ہوئے چبھتے تھے۔ ہونٹ جو کٹا محسوس ہو رہے تھے۔ گرمی کی وجہ سے جسم میں چبھن محسوس نہ تھی ورنہ ان کے کٹے ہونے کا احساس نہ ہوتا۔ بہرحال، تکلیف دہ ضرور تھے۔ میں نے کپڑے بدل ڈالے۔ میں پوسٹ مارٹم گلے میں لٹکایا اور ٹارچ ہاتھ میں پکڑی۔ بیرونی لان میں آ کر گھڑی دیکھی۔ ریڈیم سے چمکنے والی گھڑی میں دس بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔

"شکورے نے اس پاگل پن کا مظاہرہ تو اب ڈھکا چھپا نہیں ہے۔" میں نے سوچا۔ "دنیا بھر میں کروڑوں غریب لوگوں نے ایک بار یہ تو سوچا ہی ہوگا کہ اگر سنکالی لیپ کا علم انہیں مل جائے تو وہ بھی بن سکتے ہیں۔ لیکن کسی میں یہ یقین نہیں ہوگا جس نے شکورے کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ ان لوگوں کو یہ تشویش ہوگی کہ اگر سنکالی لیپ ان کے گھروں پر گرنے لگی تو ان کے اہل و عیال کا کیا ہوگا۔ شکورے کی یہ خود پسندی جس سے شاید وہ آگاہ بھی نہیں ہے، بہت خطرناک بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے من میں دبی ہوئی خواہشات اور آرزوئیں آسودگی کے صدمے سے اسے مکمل طور پر پاگل بھی بنا سکتی ہیں۔ لیکن شعور کی ایک کرن بھی اگر اس کے ذہن پر اپنے پیالے کی طرح بھرے تمناؤں نے سید کو اسرار کی تاریکی کو چیر گئی تو اس کی دیوانگی ہمیشہ کے لیے ختم بھی ہو سکتی ہے۔"

میں نے پھر گھڑی دیکھی۔ دس بجنے میں پندرہ منٹ باقی تھے۔ میں لان کے کونے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں بیرونی گیٹ کی سمت تھیں۔ لان کی باڑھ میں رات کو بولنے والے حشرات الارض کی دھیمی دھیمی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوا کے جھونکے دھیمے تھے لیکن ان میں خنکی تھی۔ آسمان پر ستارے گھنے تھے۔ شہروں میں اتنے زیادہ ستارے نظر نہیں آیا کرتے۔ وقت گزر رہا تھا۔ دس بج گئے، سوا دس ہوئے۔ ساڑھے دس بجے تک شکورا نہ آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ شاید شکورے کا ارادہ بدل گیا ہے۔

"اب کیا کروں؟" میں نے سوچا۔ "اگر اندر جا کر اپنے کمرے میں سونے کے لیے لیٹتا ہوں، اور پھر شکورا آ جاتا ہے تو وہ یقیناً شور مچائے گا۔ اگر اس کی دکان کی سمت جاتا ہوں تو یہ میرا پاگل پن ہوگا۔ کیا کروں؟ کیا لان ہی میں بیٹھا رہوں؟"

گیارہ بجنے میں شاید سات آٹھ منٹ تھے جب لان کے گیٹ پر کھٹکا ہوا۔ مدھم سی روشنی میں مجھے ہالی گراؤنڈ کے بنگلے کے پاس شکورا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ہری تختی سی تھی، پر چادر تھی۔

مسلح ہو کر ہی آیا تھا۔ میں اٹھا، بیرونی گیٹ بند کرتے ہوئے شکورے کے پاس گیا۔

"اتنی دیر شکورے؟" میں نے کہا۔ "تیرے ساڑھے نو بجے ہیں؟"

"او یار" شکورے نے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا، "شیر علی کے ہوٹل کے باہر منجیوں (چارپائیوں) پر مسافر جاگ رہے تھے۔ حرامی چلم پر چلم پی رہے تھے، باتیں کر رہے تھے۔ میں کیا کرتا؟"

آس پاس کے دیہات سے آنے والے مسافر اکثر رات ہی کو کھوڑ کے بس اڈے پر آجایا کرتے تھے۔ ان میں زیادہ تر فوجی ہوتے تھے جو صبح کی بس پکڑنا چاہتے تھے۔ چھٹیاں گزار کر واپس ڈیوٹی پر جانے والے ان فوجیوں کو منجی بستر شیر علی فراہم کر دیا کرتا تھا۔ انھیں صبح پہلی بس کے لیے جگانا اور چائے پراٹھے کا ناشتہ کرانا بھی شیر علی کے ذمے ہوتا تھا۔

"تمھاخور کیسے جاتے ہیں،" شکورے نے بیزاری سے کہا۔ "سوتے نہیں ہیں۔"

"انھوں نے تجھے کیا کہا تھا؟" میں نے کہا۔ "آجاتا۔"

"میں نہیں چاہتا کہ کسی کو پتا چلے کہ سکیب کھوڑ میں گرے گی،" شکورے نے کہا۔ "ریڈوا لایا ہے؟"

"ہاں،" میں نے جواب دیا۔

"چل چلیں،" شکورے نے چلتے ہوئے کہا۔ ہم باؤنڈری وال کے ساتھ ساتھ تارکول کی پکی سڑک پر چلنے لگے۔ آگے بنگلوں کی قطاریں تھیں اور سڑک پر اسٹریٹ لائٹس لگی ہوئی تھیں۔ بنگلوں کے درمیان سے گزرتے ہوئے شکورا گھبرایا ہوا تھا۔ پھر ہم پنڈی گھیب اور راولپنڈی جانے والی سڑک پر پہنچ گئے۔ یہ سڑک شمال کی جانب جا کر انگریزی کا حرف ٹی (T) بناتی ہے۔ پنڈی گھیب جانے والی بسیں مشرق کی سمت اور راولپنڈی جانے والی سڑک مغرب کی سمت چلی جاتی ہے۔ ہم بائیں ہاتھ مڑے۔ کمپنی کے اسپتال کے پاس سے گزرے اور پھر دوبارہ بائیں ہاتھ مڑ کر ورکرز کلب کے پاس پہنچے۔ ورکرز کلب کے سامنے سے گزر کر ہم اس جگہ پر آگئے جہاں کچا راستہ ترچھا ہو کر برساتی پانی کے جوہڑ کی سمت جاتا ہے۔ اس راستے کے دونوں جانب گھنی جھاڑیاں تھیں اور جھاڑیوں کے نیچے خشک گھاس کی تہیں سی نظر آیا کرتی تھیں۔ بہت اندھیرا تھا۔ میں نے راستے پر قدم رکھتے ہی

Scanned with CamScanner

ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ میں پچیس فٹ تک راستے پر کوئی ساکن یا متحرک کیڑا نظر نہ آئی۔ مجھے روشنی میں شکورے کی کوہاٹی چپلیں نظر آئیں۔

"بند کر... بند کر!" شکورے نے دھیمی لیکن تیز آواز میں کہا۔ "کوئی دیکھ لے گا۔"

"اس وقت ساری کالونی سوئی ہوئی ہے شکورے،" میں نے کہا۔ "کون دیکھے گا؟ یہ راستہ خطرناک ہے۔ جھاڑیوں سے بچ کر درمیان میں چل۔"

مجھے شکورے کی کوہاٹی چپلوں کی فکر تھی۔ کوہاٹی چپلیں پہننے والے کی ایڑیاں اور پنجے بالکل ننگے رہتے ہیں۔ پاؤں کے اوپر چمڑے کی دو پٹیاں سی بنی ہوتی ہیں جن سے پاؤں چپل میں پھنس جاتا ہے۔ پٹیوں کے درمیان پاؤں ننگا رہتا ہے۔ اسی قسم کی ایک پٹی پیچھے ایڑی کے اوپر سے گزر کر ایک کلپ میں بند کر دی جاتی ہے۔

"تو نے کوہاٹی چپل پہنی ہے،" میں نے کہا۔

"کیا ننگے پاؤں آتا؟" شکورے نے خوشگوار لہجے میں کہا۔ "اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"تجھے ناگ نے ڈس لیا تو تو سکائی لیب کو بھی بھول جائے گا،" میں نے کہا۔ "اس وقت ہسپتال میں بھی کوئی نہ ہوگا۔"

"مجھے کچھ نہیں ہوگا،" شکورے نے کہا۔ "میں بہت زہریلا ہوں۔ ناگ خود ہی مر جائے گا۔"

شکورے نے ہنسنا شروع کر دیا۔

"وہ دکو پھوپھی" شکورے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "وہ کہتی ہے کہ میں ہوں تو تھوڑا ہی پر کالے وٹھووں (بچھو) کی طرح ڈنگ (ڈنک) مارتا ہوں!" شکورے نے قہقہہ لگایا۔

"کیا دکو پھوپھی کو کبھی کسی کالے بچھو نے ڈنک مارا ہے؟" میں نے پوچھا، اور شکورے نے قہقہہ لگایا۔

"بیوقوف!" اس نے ہنسی میں بمشکل کہا۔ "یہ بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی... رہنے دے!"

ستاروں کی دھیمی دھیمی روشنی میں برساتی جوہڑ کی تینوں پہاڑیوں کے نقوش سیاہ تھے۔ میں وقفے وقفے سے ٹارچ جلا کر راستے اور آس پاس کی جھاڑیوں کا جائزہ لے رہا تھا

"ایک بات تو بتا،" شکورے نے میری طرف گھوما۔ "جو لوگ مر پیٹے ہوتے ہیں، کیا ان کی بیویوں کے پیٹ میں بچے مر جاتے ہیں؟"

شکورا نجانے کیا کیا سوچتا رہتا تھا۔ اس کے سوال پر مجھے اچانک وہ رات یاد آ گئی جب شیداں درد کی شدت میں چیخ چیخ کر مری تھی۔

"ایسا کچھ نہیں ہوتا شکورے،" میں نے آہستہ سے کہا۔ "ایسا کچھ نہیں ہوتا۔"

شکورا خاموش ہو گیا۔ جوہڑ کے قریب پہنچ کر میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا۔ پہاڑی سے نیچے کی چٹانوں کی ڈھلوان روشن ہو گئی۔ ڈھلوان پر پھسل جانے والے چھوٹے چھوٹے پتھر بھی موجود تھے جن سے بچپن میں ایک بار پھسل کر میں قلابازی کھا گیا تھا۔

"شکورے،" میں نے چٹان پر ٹارچ کی روشنی پھینکتے ہوئے کہا۔ "یہ جگہ ٹھیک رہے گی۔"

شکورے نے چٹان کو دیکھا، پھر پہاڑی چوٹی کی سمت دیکھا، پھر چٹان کو دیکھتے ہوئے مان گیا۔ ہم چٹان کی ڈھلوان پر احتیاط سے توازن برقرار رکھتے ہوئے چڑھے۔ ٹارچ کی روشنی میں میں نے چٹان کی چاروں طرف کا اچھی طرح جائزہ لیا اور ہم جوہڑ کی سمت رخ کر کے بیٹھ گئے۔ شکورے نے چادر بچھا لی اور میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو اور ٹارچ چٹان پر رکھ دی۔ بہت اندھیرا تھا۔

"ریڈیو لگا،" شکورے نے کہا۔

"خبریں تو اب بارہ بجے ہی آئیں گی،" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ بارہ بجنے میں بیس منٹ باقی تھے۔ "یہی خبر ہو گی کہ سکائی لیب آج رات ہی گرے گی۔"

"وہ تو مجھے پتا ہے،" شکورے نے کہا۔ "یہیں گرے گی، اسی جگہ میں، اور وہ میری ہو گی۔"

"ہاں شکورے، وہ تیری ہی ہو گی،" میں نے کہا اور شکورے کے چہرے پر مسکراہٹ یقیناً پھیل گئی ہو گی۔ تاریکی میں مجھے اس کا چہرہ صاف نہیں دکھائی دے رہا تھا۔

"وقت تو بتائیں گے؟" شکورے نے پوچھا۔

"میرے خیال میں،" میں نے جواب دیا، "جب گرنے والی ہو گی تو وقت ضرور بتائیں گے۔"

رات تاریک تھی۔ اس قدر تاریک کہ شہروں کے مقابلے پر بہت زیادہ چمکنے والے تارے بھی پہاڑیوں سے گھرے اس جوہڑ کے آس پاس اندھیرے کو کم کرنے میں ناکام محسوس ہو رہے تھے۔

Scanned with CamScanner

چاند کا نصف دور پذیری کے بعد جو نجم کی چمکتی ہوئی راتوں کی سمت جا رہی تھی۔ ستارہ زہرہ کب سے طلوع ہوتا تھا جو ابھی افق پر دھند۔ بہت سی موجود تھی۔ مشرقی افق کی سمت دیکھنے پر مجھے شمالی ہوا کے جھونکوں کا احساس ہوا۔ یہ جھونکے شمال مشرق کی سمت سے آتے محسوس ہوئے۔ لکھنؤ میں جب بھی ہوا چلتی ہے، شمال کی سمت سے ہی چلتی ہے اور سردیوں میں تو اس قدر یخ بستہ ہوتی ہے کہ درخت کپکپا جاتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے باعث سکون تھے۔ ان کی وجہ سے ہم مچھروں سے محفوظ تھے۔ چناں چہ آس پاس خاموشی تھی۔ خلاف معمول شکورا بھی خاموش تھا۔ وہ کبھی کبھی آسمان کی سمت چہرہ اٹھاتا تھا۔

"صبح سے تو پہلے ہی گرے گی؟" شکورے نے پوچھا۔

"صبح میں تو ابھی بہت دیر ہے شکورے،" میں نے جواب دیا۔ "ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے۔"

جون کا آسمان صاف تھا۔ فضا میں دن بھر کی تپش کو خنک ہوا کے جھونکے ساتھ اڑائے لیے جا رہے تھے۔ تپش کا احساس آہستہ آہستہ کم ہو رہا تھا۔ مجھے فل بوٹوں میں نمی کا احساس ہوا۔ پسینے کی نمی ناگوار تھی لیکن میں نے بوٹ نہ اتارے۔ دور کالونی کی طرف سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کسی تیز ہوا کے جھونکے سے اجاڑ میدان کی خشک جھاڑیاں سرسرانے لگتی تھیں۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبا کر ارد گرد کا پھر جائزہ لیا۔

"شکیب،" شکورے نے کہا۔ "کس طرف سے آئے گی؟"

"یہ بتانا تو مشکل ہے شکورے،" میں نے کہا۔ "کسی طرف سے بھی آ سکتی ہے۔"

شکورا پھر خاموش ہو گیا۔ نہ جانے کیا کیا سوچ رہا تھا۔ وہ کبھی جوہڑ کے بیرونی کناروں میں پانی کی طرف دیکھتا تھا جہاں کبھی کبھی کسی تیز ہوا کے جھونکے سے اٹھنے والی لہر پر ستاروں کا عکس مدھم سی چمک پیدا کر رہا تھا، کبھی آسمان کی سمت دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شکورا مجھ سے اپنے خیالات چھپانا چاہتا ہے۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ وقت جوہڑ کے کناروں پر کیچڑ میں رینگنے والے کیچوے کی طرح گزر رہا تھا۔ اگلا لمحہ پچھلے کو کھینچتا محسوس ہو رہا تھا لیکن مرتے ہوئے لمحے صرف اپنی یادوں کو آگے کی سمت دھکیلا کرتے ہیں۔ بارہ بجے میں نے ٹرانسسٹر ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی کی نیوز لگایا۔ وہاں اقتصادیات پر بات چیت ہو رہی تھی۔

"کیا خبر ہے؟" شکورے نے بےچینی سے پوچھا۔ "کیا کہہ رہے ہیں؟"

"شکورے، وہ..." میں نے کہا، "امریکہ کے کسی معاملے پر بات چیت کر رہے ہیں۔"

"کہیں وہ سکلیب کو..." شکورے نے چونک کر کہا۔ "کہیں وہ سکلیب کو امریکہ میں گرانے کی تدبیریں تو نہیں کر رہے ہیں؟"

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، شکورے نے غصے سے بازو ہوا میں زور سے گھمایا۔

"کرلیں جتنی تدبیریں کرلی ہیں،" وہ چیخا۔ "لگالیں زور، سکلیب یہیں گرے گی۔ دیکھ لینا... یہیں گرے گی، اس ندی میں۔"

"شکورے،" میں نے کہا، "وہ تو آسمان سے بہت تیز آئے گی، زور سے گرے گی۔ اس کے ٹکڑے ہوا میں اڑیں گے۔ ہم تو مارے جائیں گے۔"

"کیوں مارے جائیں گے؟" شکورے نے کہا۔ "کیا ہم اندھے ہیں؟ ہماری آنکھیں نہیں ہیں؟ کیا سکلیب کو آتا ہوا دیکھ نہیں سکیں گے؟ بیوقوف! جیسے ہی سکلیب نظر آئے گی ہم ادھر —" اس نے سر گھما کر چٹان کے عقبی حصے کی طرف دیکھا۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ چٹان کی ٹوٹی پھوٹی کنکریاں روشن ہو گئیں۔ "ہم ادھر کود جائیں گے پیچھے۔ کون سی اونچی ہے!"

میں نے عقبی حصے کا پھر جائزہ لیا۔ چٹان کے عقب میں نوکیلی کنکریاں تھیں۔ وہاں سے کسی کوبرے کے آنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ پھر میں نے پہاڑی کی جانب چٹان کے حصے کو روشن کیا، پھر ڈھلوان کو روشن کیا۔

"ٹکڑے اڑیں گے تو پہاڑیوں سے ٹکرا کر پھر ندی میں گریں گے۔ ندی میں پانی کم ہے۔" شکورے نے ندی کی طرف چہرہ گھمایا۔ "ہم نکال لیں گے۔"

"لیکن ندی میں تو جونکیں ہوں گی،" میں نے کہا۔ "وہ تو ہمیں چمٹ جائیں گی۔"

"ہا گدڑ!" (گیدڑ!) شکورے نے طنز بھرے لہجے میں کہا۔ "جلکوں (جونکوں) سے ڈرتا ہے!" دھیمی دھیمی روشنی میں اس نے میری طرف دیکھا۔ "اچھا تو باہر رہنا... شہر میں رہ رہ کر ڈرپوک ہو گیا ہے۔ میں نکال لاؤں گا۔"

"ڈرپوک نہیں ہوں،" میں نے کہا۔ "جونکیں گندی ہوتی ہیں۔" اندھیرے میں شکورے کے چہرے کا تاثر میں دیکھ نہ سکا۔ "خون چوستی ہیں شکورے۔"

Scanned with CamScanner

''میں نکالوں گا سکلیپ کے ٹکڑے،'' شکورے نے کہا۔ ''میں نہیں ڈرتا۔ اور پھر مجھے جونکیں نہیں چمٹیں گی۔ میرا خون زہریلا ہے۔''

''شکورے!'' میں نے خفگی سے کہا۔ ''ایسی باتیں نہ سوچا کر۔ کسی کا خون زہریلا نہیں ہوتا۔''

مشرقی افق پر پہاڑوں کے پیچھے سے چاند نمودار ہوا۔ آدھا چاند۔ اس کا نیم دائرہ زردی مائل سرخ تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں تیزی آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کسی تیز جھونکے سے ہمارے کپڑے پھڑپھڑاتے تھے۔ شکورے نے ہاکی اٹھا کر چادر کے اوپر رکھ دی۔ میں بار بار ٹارچ کا بٹن دبا کر ارد گرد کا جائزہ لے رہا تھا۔ ہوا میں تیزی آنے سے اجاڑ میدان کی جھاڑیاں سرسرا رہی تھیں۔ جوہڑ کے پانی میں بھی ارتعاش سا نمودار ہو چکا تھا لیکن پانی مردہ محسوس ہو رہا تھا۔ نہ کسی مینڈک کی آواز آتی تھی نہ ہی کسی جل مرغے کے پھڑپھڑانے کی۔ اچانک جوہڑ کے سامنے والے کنارے سے چپڑ چپڑ کی آواز آئی۔ شکورے کا سر جھٹکے سے اوپر اٹھا۔ میں نے آواز ختم ہونے کا انتظار کیا۔ کوئی جانور پانی پی رہا تھا۔ آواز میں وقفہ آنے پر میں نے ٹارچ کا بٹن دبا دیا۔ روشنی سیدھی پانی پینے والے جانور پر پڑی۔ وہ بدک کر اچھلا، گھوما، اس کی گچھے دار دُم بھی گھومی۔ وہ تیزی سے دوڑا اور پہاڑی کے پیچھے نادر خان کے کھیتوں کی سمت نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''ہا... حرامی لومبو'' (لومڑ) شکورے نے کہا۔ وہ لومڑی تھی یا لومڑ، یہ تو معلوم نہیں، کچھ دیر بعد نادر خان کی ڈھوک کی طرف سے گدی کتوں کی بھاری بھرکم آواز آئی۔ وہ بھونک رہے تھے۔

''خبریں تو لگا،'' شکورے نے کہا۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ ایک بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔

''سات منٹ رہتے ہیں،'' میں نے کہا۔

''وقت کا پتا چلنا بہت ضروری ہے،'' شکورے نے کہا۔ ''ہم خبردار ہو جائیں گے۔''

میں نے ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی سے اب بھی اکنامکس سے متعلق ہی کوئی پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ میں نے ریڈیو کی سوئی گھمائی۔ مختلف اسٹیشنوں کے گزرنے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر زیڈ بی سی ٹیون ہو گیا۔ وہاں سے انگریزی میں کھیلوں پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ فٹ بال سے متعلق کوئی کھیلوں کا ماہر اپنی آرا سنا رہا تھا۔ پھر خبروں کا اعلان ہوا۔ شکورا بے چین تھا۔ خبروں میں سکائی لیب کی

Scanned with CamScanner

خبر بھی تھی۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ سکائی لیب کو اب زمین پر گرنے سے روکنا ناممکن ہے اور آج رات وہ زمین کے مدار میں داخل ہو جائے گی۔ سکائی لیب کے الفاظ سن کر شکورا چیخا۔

"سی۔ آئی خبر... کیا کہہ رہا ہے؟... کیا خبر ہے؟" شکورے نے شور مچا دیا۔ اس شور میں نیوز کاسٹر کی بتائی ہوئی اہم معلومات میں نہ سن سکا۔ شاید وہ سکائی لیب کے رخ سے متعلق کچھ بتا رہا تھا۔ شکورے کو غصہ آ چکا تھا، وہ چیخ رہا تھا۔

"کچھ بتا بھی... کیا کہہ رہا ہے وہ؟... کچھ تب بھی" اس نے میرا کندھا پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"بتاتا کیوں نہیں؟ کیا خبر ہے؟"

"شکورے، مجھے سننے تو دے!" میں نے بلند آواز میں کہا۔ "تیرے شور میں کچھ سنائی نہیں دیتا۔"

شکورے کا اضطراب اس کے بس میں نہیں تھا۔ "او کچھ مجھے بھی بتا" وہ چیخا۔ "کیا کہا ہے اس نے؟"

"کوئی خاص خبر نہیں" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "یہی بتایا ہے کہ اب سکائی لیب کو گرنے سے کوئی نہیں روک سکتا اور وہ آج رات گر جائے گی۔"

"ٹیم (ٹائم) نہیں بتایا؟" شکورے نے پوچھا۔

"نہیں۔" میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو بند کر دیا۔ شکورے نے میری جانب سے سر موڑ کر نہر کے پانی کو دیکھا پھر آسمان کی طرف منہ اٹھایا، پھر مجھے دیکھا۔

"چھپانا چاہتے ہیں،" اس نے کہا۔ "ٹیم نہیں بتانا چاہتے"

"وہ کیوں چھپائیں گے؟" میں نے کہا۔ "سکائی لیب ان کی تو نہیں ہے۔"

شکورا میری بات نہ سمجھ سکا۔ "کیا مطلب ہے تیرا؟" اس نے کہا۔

"جرمن کیوں چھپائیں گے؟" میں نے کہا۔ "یہ ریڈیو جرمنی کی خبریں تھیں۔"

"کیا؟" شکورا چونک کر بولا۔ "سکائی لیب امریکہ کی اور خبریں جرمنی کی!... او... تو مجھ سے جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے؟"

"میں جھوٹ نہیں بول رہا،" میں نے کہا۔ "ساری دنیا کے ریڈیو اسٹیشنوں سے خبریں نشر ہو

رہی تھیں۔ کیا تم نے مسٹر شیر علی کے ہوٹل میں اردو میں خبریں نہیں سنی تھیں؟"

"ہاں، آتو رہی تھیں،" شکورے نے کہا۔ "کیا وہ امریکی خبریں نہیں سنا رہے تھے؟"

"امریکی انگریزی زبان میں خبریں سناتے ہیں،" میں نے کہا۔ "ان کی اپنی کوئی زبان نہیں ہے۔"

شکورا پھر خاموش ہو گیا۔ مشرقی افق پر چاند بلند ہو رہا تھا۔ نیم دائرے میں پیلا پن اب بھی نمایاں تھا لیکن ماند پڑ چکی تھی۔ اب وہ زردی مائل سفید ہو چکا تھا۔ فضا کی روشنی میں مکمل اندھیرے کا احساس جوہڑ کے پانی میں ڈوب چکا تھا۔ میرا جی چاہا کہ موسیقی سنوں۔ میں نے ریڈیو آن کیا۔ شکورے نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا۔ برصغیر کے سارے ریڈیو اسٹیشن رات دو بجے بند ہو جاتے تھے۔ صرف چینی، روسی، افغان، ایرانی اور ترک ریڈیو اسٹیشنوں ہی سے موسیقی سنی جا سکتی تھی۔ مجھے افغانی، ایرانی اور ترکی موسیقی پسند تھی۔ ترکی کی لوک موسیقی مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ افغانستان اور ایران کے ریڈیو اسٹیشن ٹیون ہونے سے پہلے ترکی کا ریڈیو اسٹیشن ٹیون ہو گیا لیکن مداخلت کی وجہ سے کوئی عربی اسٹیشن بھی سنائی دے رہا تھا۔ دونوں کی آواز صاف نہیں تھی لیکن ذرا سی کوشش سے ترکی ریڈیو کی آواز صاف ہو گئی۔ وہاں سے موسیقی نشر ہو رہی تھی۔ لوک موسیقی تو نہ تھی لیکن دلکش تھی۔

"بند کرو... بند کرو،" شکورا چیخا۔ "بند کرو اسے! چیزیں ٹھیک جگہ نہیں ہوتیں ہانڈی[20] ہوتی ہیں۔ جن آ جائیں گے۔" شکورے نے جھرجھری لی۔

میں نے بیزاری سے ریڈیو بند کر دیا۔ مجھے خود شکورا کی تصوراتی جنات سے کوئی ... نہ رہا تھا۔ پھر ایک یاد نے میری بیزاری کو شرمندگی میں بدل دیا۔ جب میں مڈل میں تھا، بھائی جان کراچی انگریز سے چھوٹا سا ٹرانزسٹر ریڈیو خرید لائے تھے۔ ٹرانزسٹر ریڈیو میں سیلوں (cells) کی جگہ چھوٹی سی بیٹری لگی ہوئی تھی۔ ٹرانزسٹر ریڈیو ابھی عام نہیں ہوئے تھے۔ جن گھروں میں ریڈیو تھے، وہ بڑے والے تھے۔ بجلی سے چلنے والے یہ ریڈیو آن ہونے کے پانچ سات سیکنڈ بعد شوں شوں کرتے

---

[20] ہانڈی جگہ: پہاڑی اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں ان کے تصور میں جن بھوت، چڑیلیں رہتی ہوں۔ اس کا مطلب آسیب زدہ جگہ ہے۔

ہوئے جھنجھنانے لگتے تھے۔ اس جھنجھناہٹ (humming) میں موسیقی اور بھی اچھی لگا کرتی تھی۔ شمالی پنجاب کے لوگوں کے لیے تو یہ بڑے والے ریڈیو بھی عجوبہ تھے۔ شیر علی جب اپنے ہوٹل سے بے ٹرنک کا ریڈیو لایا تھا تو اس کے ہوٹل کے اندر اور باہر ہجوم سا ہو جایا کرتا تھا۔ بھائی کے لائے ہوئے ٹرانزسٹر ریڈیو پر میں رات کے وقت بستر پر لیٹ کر موسیقی سنا کرتا تھا۔

سردیوں کے دن تھے۔ دسمبر کی چھٹیاں تھیں۔ ایک صبح آل انڈیا ریڈیو سے اعلان ہوا کہ رات کو اکھل بھارتیہ سنگیت سبھا (نیشنل پروگرام آف میوزک) میں استاد بسم اللہ خان کا شہنائی وادن (شہنائی بجانے کا پروگرام) ہوگا۔

مجھے شرارت سوجھی۔ بھائی کے بنگلے کے پیچھے سرونٹ کوارٹروں سے آگے بڑے پہاڑ کے نیچے پتھریلی چٹانیں بکھری ہوئی تھیں شاید اب بھی ہوں گی۔ پہاڑ کی ڈھلوان پر پھلاہیوں اور کریر کے درخت اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ ان جھاڑیوں کے درمیان موسم برسات میں لمبی خوشبودار گھاس اگتی ہے جو خزاں کے موسم میں سوکھ کر زیادہ خوشبو دینے لگتی ہے۔ سنا ہے ہرن یہی گھاس کھاتے ہیں اور ان کی ناف میں کستوری بنتی ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوان کے نیچے ایک بہت چھوٹا سا برساتی جوہڑ ہے۔ جوہڑ کے آس پاس زمین اس قدر پتھریلی ہے کہ اس کی درازوں میں صرف ساون بھادوں ہی میں گھاس نظر آتی ہے اور وہ بھی کہیں کہیں۔ ان چٹانوں کے درمیان ایک پتھریلا راستہ، پگڈنڈی نما راستہ، جوہڑ کے شمالی کنارے کے پاس دو پہاڑیوں کے درمیان تنگ جھاڑیوں اور پھلاہی کے درختوں سے ہو کر نشیب میں اتر جاتا ہے۔ دو چار کھیتوں میں آڑا ترچھا ہو کر یہ پگڈنڈی نما راستہ راولپنڈی جانے والی پکی سڑک سے جا ملتا ہے جہاں سے تقریباً آدھے کلومیٹر کی دوری پر احمدال گاؤں واقع ہے۔ اس راستے کو محفوظ سمجھا جاتا تھا، پھر بھی ساون بھادوں میں رات کے وقت دیہاتی یہ راستہ بھی اختیار نہیں کرتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ کمپنی کی آٹو ورکشاپ اور دفاتر کے دو چوکیدار صادقا (صادق حسین) اور فیکا (محمد رفیق) ہر رات شفٹ تبدیل ہونے پر اپنے گاؤں احمدال جانے کے لیے یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ وہ احمدال گاؤں سے کبھی صبح کی شفٹ پر آتے تھے، کبھی دوپہر اور کبھی رات کی شفٹ پر آیا جایا کرتے تھے۔ ان دنوں وہ دوپہر کی شفٹ پر تھے جو ایک بجے شروع ہو کر رات نو بجے ختم ہوتی تھی لیکن وہ ساڑھے آٹھ بجے ہی گھروں کی طرف چل پڑتے تھے۔ دونوں

Scanned with CamScanner

اُن کے گاؤں کے تھے۔ وہ رات نو بجے کے قریب بھائی کے بنگلے کے پاس سے گزرا کرتے تھے۔ پھر پتھریلی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے جوہڑ کے پاس پہاڑیوں کے درمیان سے نشیبی کھیتوں میں اتر کر، گندم کے تر چھے چلتے ہوئے پکی سڑک پر پہنچ جاتے تھے جو راولپنڈی کی سمت جاتی تھی۔ وہ اسی سڑک پر نصف کلومیٹر کے فاصلے پر اُن کا گاؤں تھا۔ یہ قریب ترین راستہ تھا ورنہ اگر وہ پکی سڑکوں پر چلتے ہوئے اپنے گھروں کو جاتے تو انھیں ایک کلومیٹر کا فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔

گھوڑا گلی میں کیپٹن کا اپنا پاور ہاؤس ہے، بجلی کبھی بھی نہیں جایا کرتی تھی، پھر بھی مجھے معلوم تھا کہ بھائی نے بنگلے کے سٹور میں دو تین بڑی موم بتیاں پڑی ہوئی ہیں۔ میں نے شام گہری ہونے پر سٹور سے ایک موم بتی نکالی، ماچس کی ڈبیا جیب میں ڈالی اور رات آٹھ بجے فل بوٹ پہن کر سویٹر پر موٹا کوٹ پہن کر، مفلر باندھ کر اونی ٹوپی اور دستانے پہن کر، ٹرانزسٹر ریڈیو اٹھایا اور بڑے پہاڑ کی طرف چل دیا۔ میرے ہاتھ میں ہاکی بھی تھی۔ چادر کا کام مفلر سے لیا جا سکتا تھا۔ جوہڑ کے قریب پتھریلے راستے پر اوپر کی سمت دو بہت بھاری پتھر ہیں، کم از کم چار فٹ اونچے، ان کے نیچے ست نما پتھریلی رمپ ہے۔ جگہ بہت محفوظ محسوس ہوئی۔ میں نے ایک پتھر کے پیچھے موم بتی کھڑی کر دی۔ ہوا کے جھونکے نہ ہونے کے برابر تھے۔ مسئلہ صرف وقت کا تھا۔ آل انڈیا ریڈیو کا وقت مقامی وقت سے تیس منٹ آگے تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ شہنائی کے پروگرام کے دوران میں ہی دونوں چوکیدار وہاں سے گزریں گے۔ رات نو بجے آل انڈیا ریڈیو کے کئی سٹیشنوں سے بیک وقت استاد بسم اللہ خان کی شہنائی شروع ہوئی۔ پہلے سمت سارنگ کا اعلان ہوا۔ پندرہ منٹ تک یہ خوبصورت ساونی راگ سپنے بھیگے ہوئے سروں کی پھوار کی برساتا رہا، پھر راگ درگا کا اعلان میرے لیے انبساط دینے والا تھا۔ راگ درگا میرے پسندیدہ ترین راگوں میں سے ایک ہے۔ پندرہ منٹ تک راگ درگا کے میٹھے سر پتھریلی سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑیوں سے ٹکرا ٹکرا کر بازگشت کا فسوں پھیلاتے رہے۔ پھر اناؤنسر نے ہندی اور انگریزی میں بتایا کہ آخر میں شہنائی پر راگ ماکونس شروع ہوگا۔ میں مسلسل بھائی کے گھر کی طرف دیکھ رہا تھا۔ رات کے نو بج کر پینتیس منٹ پر مجھے بھائی کے بنگلے کے پاس چاندنی میں دو سائے نظر آئے۔ وہ صدقا اور فیکا ہی تھے۔

وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتے تیز چلتے ہوئے باتیں کرتے آ رہے تھے۔ دونوں نے کمبل

Scanned with CamScanner

دوڑتے ہوئے تھے۔ میں نے فوراً موم بتی جلائی اور ٹرانزسٹر ریڈیو موم بتی کے پاس رکھ دیا۔ والیوم اتنا اونچا کر دیا کہ بینتیس چالیس قدموں تک سنائی دے۔ میں دوسرے پتھر کے پیچھے چھپ گیا۔ ہوا بند تھی، پھر بھی موم بتی کا شعلہ لہرا رہا تھا۔ فیکا اور صادقا اونچی آواز میں باتیں کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ تقریباً چالیس قدم پر فیکا رک گیا۔ دو قدم آگے صادقا بھی رک گیا۔ پھر فیکا تیز قدموں سے صادقے کے پہلو میں آ گیا۔ وہ ایک دوسرے کی سمت دیکھ رہے تھے۔ ہیجانی کیفیت میں وہ دو چار قدم اور آگے بڑھے۔ ان کے چہروں پر خوف کا تاثر چاندنی میں صاف نظر آ رہا تھا۔ پھر صادقے کا ہاتھ موم بتی والے پتھر کی طرف تھا جس کی اوٹ میں موم بتی کی روشنی بکھر رہی تھی اور شہنائی کے سُر پھیل رہے تھے۔

''دھاڑاوے[21] ہی کے؟'' (یہ کیا؟) فیکا خوفزدہ آواز میں چیخا۔ وہ بدکے ہوئے گھوڑوں کی طرح اچھل کر مڑے۔

''نہیں او بھائی!'' (بچنا او بھائی!) صادقا چیخا اور وہ دونوں کندھوں پر کمبل سنبھالتے، بانہیں لہراتے، بھائی کے بنگلے تک سیدھے دوڑتے گئے اور پھر ہاکی گراؤنڈ کی سمت روپوش ہو گئے۔

اگلے روز میں بازار گیا تو رات والے واقعے پر بیپاری زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔

'ماں پہلاں ای پتا ہا، پہاڑ تھلے جا بہوں ڈاہڈی اے۔'' (مجھے پہلے ہی پتا تھا کہ پہاڑ کے نیچے جگہ سخت ہے) ایک نے کہا۔ ایک دکاندار نے دوسرے کی سمت دیکھا۔

'بہوں جبر اے بھائی فیکے تے صادقے ناں، ہور کوئی ہووے تاں اوتھائیں ای مر ویندا۔'' (بہت ظلم ہے بھائی فیکے اور صادقے کا کوئی اور ہوتا تو وہیں مر جاتا۔)

کمپنی کے ورکشاپ میں کام کرنے والے ایک کاریگر نے خوفزدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا۔

'فیکے تے صادقے نے قرآن دی قسم چاتی اے، او جہاں جن، بھوت تکیا اے۔ رات ایں ادھائیں جناں دی جنج ڈھکی ہوئی سی۔'' (فیکے اور صادقے نے قرآن کی قسم کھائی ہے۔ انھوں نے اپنی آنکھوں

---

21 ''دھاڑ'' سرائیکی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی حملہ ہیں۔ لیکن دھنی اور کیمبل پور میں یہ ایک مہمل لفظ ہے جسے مقامی لوگ انتہائی خوف میں بے اختیار بولتے ہیں۔

ستے دیکھا ہے۔ رات وہاں پر جنوں کی بارات آئی ہوئی تھی۔)

اس واقعے کے بعد لوگوں نے پتھر والے راستے پر جانا چھوڑ دیا۔ دن بھر کے تھکے شکستے ہوئے دیہاتی ہر طرف سے راستے ایک کلومیٹر بھی زیادہ دو حصہ طے کرتے ہوئے اپنے گھروں کو جانے لگے۔ مجھ پر دو تین دن ندامت چھائی رہی۔ کسی کو کچھ بتا بھی نہیں سکتا تھا، گھر سے سخت ڈانٹ پڑتی۔ اس شرارت میں کسی کی جان بھی جا سکتی تھی۔ بیکا اور صادق بہت کڑیل جوان تھے ورنہ اور کوئی ہوتا تو بے ہوش ہو کر گر بھی سکتا تھا، ہارٹ فیل ہو جانے سے مر بھی سکتا تھا۔ بازار میں بتاتا تو کوئی میری بات پر یقین نہ کرتا۔ غیر مرئی اشیا پر یقین اور ان کا خوف دیہاتیوں کی فطرت ثانیہ ہے۔ اگر زور زبردستی ثابت کر دیتا یا میں انھیں یہ بتا بھی دیتا کہ میری شرارت کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوا تو بھی نہ جانے ان کا کس قدر شدید ردعمل ہوتا۔ میں خاموش رہا۔ بے حد شرمندہ تھا اور یہ شرمندگی آج تک میرے ساتھ ہے کیونکہ اس واقعے کے بعد پیر مراد شاہ کے سو دو سو تعویذ اور چار سو کالے دھاگے بک گئے تھے۔ بیکے اور صادق نے بھی ایک ایک سو روپے دے کر پیر سے نقش[22] لکھوا کر بازوؤں پر باندھے تھے۔

شکور اس قدر خاموش تھا جیسے اونگھ رہا ہو۔

"ان دیکھے کا خوف شاید ہمیشہ سے انسان کے ساتھ ہے۔" میں نے سوچا۔ "شاید اسی لیے لوگ اندھیری راتوں سے ڈرتے ہیں۔ ایسی راتوں میں کچھ نظر نہیں آتا اور یہی کچھ دکھائی نہ دینا خوف کا محرک بن جاتا ہے۔ کسی نابینا شخص کو اندھیرے کا کوئی خوف نہیں ہوتا، وہ آوازوں سے یا اجنبی آوازوں سے ڈرتا ہے۔ جن علاقوں میں درندے اور حشرات الارض پائے جاتے ہیں، وہاں رات کے وقت لوگوں کا گھروں سے نہ نکلنا جہاں فطری ہے وہاں اس کا باعث یہی ان دیکھے کا خوف بھی ہے۔ دن بھر قبرستانوں میں گھومنے پھرنے والے لوگ رات کو قبرستانوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔ ان دیکھے کا خوف ان کے قدم روک دیتا ہے۔

"دنیا میں مذہب نے انسانوں کو جس خوف کا اسیر بنا رکھا ہے، یہی ان دیکھے کا خوف ہے۔"

شکور کا سر گھٹنوں پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اگر بیدار تھا تو بھی غنودگی کے عالم میں تھا۔ چاند بلند ہو چکا تھا۔ چودھویں رات کے مقابلے میں اگرچہ روشنی کم تھی لیکن ہر چیز نمایاں تھی۔ اچانک شکور سے

---

22 پیر لوگوں کو دم درود کرنے کے بعد انھیں نقش یعنی بازو پر باندھنے کا مشورہ دیتے ہیں جس کا ہدیہ کم و بیش سو روپے ہوتا ہے۔

مرانجھیا

"بہت دیر ہو گئی ہے۔" اس نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔ "سکلیب نہیں گری۔"

"اپنے وقت پر ہی گرے گی۔" میں نے کہا اور شکورا خاموش ہو گیا۔

وقت آہستہ آہستہ گزر رہا تھا۔ شکورا بار بار آسمان پر چاروں سمت دیکھتا تھا۔ اچانک وہ ایک چیخ کے ساتھ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"وہ آئی!... آ گئی!... آ گئی سکلیب!" اس کا بازو آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ میں نے اس کی انگلی کی سیدھ میں دیکھا۔ دور آسمان پر ایک روشنی جلتی بجھتی جا رہی تھی۔ شکورا چٹان کے پیچھے کودنے ہی والا تھا کہ میں نے اس کا بازو پکڑ لیا۔

"شکورے، وہ ہوائی جہاز ہے۔" میں نے کہا۔

"نہیں... کیا... ہوائی جہاز؟" اس کی آواز میں تذبذب تھا۔

"ہاں شکورے۔" میں نے کہا۔ "میرا یقین کر وہ ہوائی جہاز ہی ہے۔"

کوئی انٹرنیشنل فلائٹ تھی جو شمال مشرق سے جنوب مغرب کی سمت جا رہی تھی۔ شکورا کچھ دیر اسے دیکھتا رہا، پھر بیٹھ گیا۔

"ہوائی جہاز ہی ہوگا۔" اس نے مایوسی سے کہا۔ "سکلیب ہوتی تو سیدھی بنی کی طرف آتی۔"

کچھ دیر بعد ہوائی جہاز کی دھیمی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ مدت کافی لمبی تھی۔

"کیا سکلیب بھی شور کرتی آئے گی؟" شکورے نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے۔" میں نے کہا۔ "ہوا کی رگڑ سے اس میں آواز پیدا ہوگی۔ رگڑ سے وہ آگ کا گولہ بن جائے گی۔"

"کوئی فکر نہیں۔" شکورے نے کہا۔ "بنی میں پانی ہے۔ شوں شوں کر کے ٹھنڈی ہو جائے گی۔"

شکورا بنی کی طرف دیکھنے لگا جہاں اب پانی کی لہروں پر چاندنی کا عکس جھلملا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔

"شکورے۔" میں نے کہا۔ "تیرے خیال میں سکلیب کتنی بڑی ہو گی؟"

Scanned with CamScanner

میرے اس سوال پر شکورا ایک دم میری طرف گھوما۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اس نے اپنے ذہن میں سکائی لیب کی کوئی تصویر بنا رکھی ہے۔

"اس کا انجن آگے ہوگا،" شکورے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "پیچھے سے بہت لمبی ہوگی۔ اس کے کم سے کم بارہ ٹائر ہوں گے۔" پھر وہ کچھ سوچنے لگا۔ "یار ۔ ٹائر کم بھی ہو جائیں تو کوئی بات نہیں!"

"تمھارا مطلب ہے کہ وہ لمبے ٹرک یا ٹریلر کی طرح ہوگی؟" میں نے کہا۔ شکورا پھر سوچنے لگا۔

"شاید ٹرک کی طرح نہ ہو۔" اس نے اپنے قیاس کی خود ہی نفی کر دی۔ "نہیں۔ وہ پیچھے سے بہت لمبی نہیں ہوگی۔ اس کے اگلے ٹائر چھوٹے ہوں گے اور پچھلے بڑے۔ ٹائر چوڑے ہوں گے۔ انجن لمبا ہوگا اور ڈرائیور کی سیٹ انجن کے پیچھے ہوگی۔" پھر وہ چونکا۔ "یار، ڈرائیور تو ضرور ہوگا؟"

"شکورے،" میں نے کہا۔ "سکائی لیب ٹریکٹر کی طرح تو نہیں ہوتی۔"

شکورا پھر سوچنے لگا۔ وہ دو تین منٹ خاموش رہا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

"اس کا اگلا پہیہ بہت بڑا ہوگا۔ لوہے کا لمبا اور بڑا سا پہیہ۔ پچھلے پہیے بھی لوہے کے ہی لیکن چوڑے نہیں ہوں، اونچے ہوں گے۔ اس کے انجن سے دھواں نکل رہا ہوگا۔"

"ایسا تو سڑک کوٹنے والا انجن ہوتا ہے شکورے،" میں نے کہا اور شکورے کے ماتھے پر شکنیں سی نمایاں ہوئیں۔

"بڑا سیانا بنتا ہے تو،" اس نے غصے سے کہا۔ "تو بتا کیسی ہوگی؟"

"مجھے کیا معلوم شکورے،" میں نے آہستہ سے کہا۔ "اسی لیے تو تجھ سے پوچھ رہا ہوں۔"

شکورے کے ماتھے کی شکنیں مٹ گئیں لیکن چہرے پر کھنچاؤ تھا جیسے ذہن پر بہت زور دے رہا ہو۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

"اس کا انجن بہت بڑا اور کالا ہوگا،" شکورے نے کہا۔ "انجن میں بہت بڑی انگیٹھی ہوگی۔ آگے انجن کے اوپر گول بمبو (چمنی) ہوگا۔ بمبو سے دھواں نکل رہا ہوگا۔ انجن کے نیچے لوہے کے بڑے بڑے پہیے ہوں گے اور پہیوں کے اوپر سے بھاپ نکل رہی ہوگی۔ مطلب بہت تیز دوڑتی ہوگی اور سیٹی بجاتی ہوگی۔"

Scanned with CamScanner

"شکورے،" میں نے کہا "تم تو ریل کے انجن کی بات کر رہے ہو جو صبح سے چند سال سے راستے ماڑی انڈس تک ریل گاڑی لے کر جاتا ہے۔"

شکورے کی آنکھیں پوری کھل گئیں۔ پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں۔

"دیکھا ہوا ہے؟" اس نے غصے سے چیخ کر کہا۔ "تو کیا سمجھتا ہے، سکلیب سائیکل ہوگی؟ بے وقوف!... اس کے تو کئی ڈبے ہوں گے۔"

"لیکن شکورے، ریل کی تو لوہے کی پٹریاں ہوتی ہیں جن پر چلتی ہے۔" میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "آسمان پر پٹریاں تو نہیں ہوں گی۔"

"میرے چاچے نے بتائی ہے سکلیب؟" وہ پھر چیخا۔ "گرے گی تو دیکھیں گے۔"

"شکورے، دیکھ، ناراض نہ ہو۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "میں تو یہ سوچ رہا تھا کہ اتنی بہت کچھ ہوگا، گرے گی تو اچھلے گا۔ ہم چٹان کے پیچھے ہی تتر بتر ہو جائیں گے۔"

شکورے نے قہقہہ لگایا۔ اس کا غصہ فوراً ہی اتر گیا۔

"بید (تتر) جائیں گے تو کیا ہو؟" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "میں تو ٹی میں بھاگوں گا۔ تو جلوس (جنگوں) سے ڈرتا ہے تو گھر جا کر بیٹھ لینا۔"

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں نے چاندنی کے باوجود ٹارچ جلا کر ادھر اُدھر کا پھر جائزہ لیا۔

"تو کھوتا ریڑھی لے آنا۔" شکورے کے ذہن میں ابھی تک نادر خان کے گدی کتوں کا کوئی خیال نہیں آیا تھا۔ "پھر ہم چھوٹے ٹکڑے لے جائیں گے دو تین پھیروں میں۔ پھر میں رسہ لے آؤں گا جو ہے میرے پاس۔ چھوٹے ٹکڑے صحن میں رکھ کر رسہ لے آؤں گا اور بڑے ٹکڑے رسے سے باندھ کھینچیں گے کھوتے سے باندھ کر۔" شکورے نے میری طرف غور سے دیکھا۔ "تو کھاتا پیتا کیوں نہیں ہے؟ کمزور چوہے!" (چوہے!)

پھر خاموشی چھا گئی۔ چاندنی میں پہاڑیوں کی چوٹیاں بہت نمایاں تھیں۔

"غریبی اور محرومی" میں نے سوچا۔ "اس دنیا کے ان گنت لوگوں میں ان کی نا آسودہ خواہشات ہمیشہ زندہ رہتی ہیں۔ کوئی محروم انسان زندگی بھر محرومی کے تلخ احساس سے نجات حاصل نہیں کر سکتا۔ دنیا میں بہت سے نظریات آئے لیکن انسان کو مکمل طور پر محرومی کے احساس سے کوئی سی

Scanned with CamScanner

نجات نہیں دے سکا۔ اپنی خواہشات کو سچے دل سے تیاگ دینے والے بہت کم ہیں۔ مجھے تو اکثر یوں محسوس ہوتا ہے کہ رہبانیت کی راہ اختیار کرنے والے اپنی محرومی کو اپنے فرض کی دھند میں چھپاتے رہتے ہیں اور ان کی زندگی میں بار بار یہ دھند چھٹتی رہتی ہے اور وہ بھی زندگی بھر محرومی کے احساس سے چھٹکارا نہیں پا سکتے۔ وہ لڑکیاں جو حسیاتی زندگی کو تیاگ کر اس خود فریبی میں مبتلا رہتی ہیں کہ انھوں نے اپنا مذہبی فریضہ ادا کر دیا ہے، زندگی بھر اپنی جبلت کو کچلتی رہتی ہیں لیکن اس سے نجات حاصل نہیں کر پاتیں۔ وہ مرد جو تجرد کی زندگی کو اپنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں، وہ خود ساختہ جبر کے شکنجے میں جکڑے رہتے ہیں اور نجات نہیں پا سکتے۔"

مجھے اساطیری کہانیوں کا چرواہا اٹیس (Attis) یاد آیا۔ اٹیس بہت خوبصورت نوجوان تھا۔ اس پر فریجیا کی دیوی سبل (Sibyl) عاشق ہوئی تھی۔ سبل اسے بار بار گناہ کی دعوت دیتی تھی لیکن وہ انکار کر دیتا تھا۔ سبل کی ہوس شدید ہونے پر اٹیس نے ایک صنوبر کے درخت کے نیچے اپنا عضو کاٹ کر خود کو خصی بنا لیا۔ اٹیس کی اس خود اختگی کی یاد میں اس کے پجاری ہر سال موسم بہار میں ایک رسم ادا کیا کرتے تھے۔ یہ رسم روم کے شہنشاہ کلاڈیس کے عہد حکومت میں بھی جاری تھی۔ اس رسم کو مشرق وسطیٰ میں سامی دیوی عشترت کے شامی معبد میں بھی ادا کیا جاتا تھا۔ سر جارج فریزر نے اپنی علم الانسانیات سے متعلق اپنی تحقیقی سیریز کی کتاب شاخ زریں (*The Golden Bough*) میں اس رسم کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"یہ رسم موسم بہار میں بائیس مارچ کو شروع ہوتی تھی۔ جنگل سے صنوبر کا ایک درخت کاٹ کر سبل کی عبادت گاہ میں لاتا تھا۔ تیئیس مارچ کو شنکھ پھونکنے کی رسم ادا کی جاتی تھی اور چوبیس مارچ یوم خون ہوتا تھا۔ پجاریوں کے جذبات جھانجھوں، ڈھولوں، شنکھوں اور بانسریوں کی پرجوش موسیقی سے برانگیختہ ہو جاتے تھے اور وہ بال کھولے رقص کرتے، جنون کی حالت میں سبل دیوی کے بت کے آگے اپنی رجولیت بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔ آدمی پر آدمی گرتا تھا اور خنجر سے اپنا عضو کاٹ کر سبل کے بت پر دے مارتا تھا۔"

پہلی صدی عیسوی کے نامور رومی شاعر کتوس نے بھی سبل کے بت کے آگے خود اختگی کی تھی لیکن جوش جنوں اتر جانے کے بعد اس نے نہایت دردناک پیرائے میں اپنی پشیمانی کو نظم کیا ہے۔

میں بیان کیا ہے کہ یہ المیہ اس کے لیے موت سے کم نہیں۔ یہ رسم بعد میں ختنہ میں بدل گئی تھی اور اسے یہودیوں نے پھر مسلمانوں نے اپنا لیا تھا۔

"مذہب نے انسانوں کو اپنی ناآسودہ خواہشات سے پیدا ہونے والے المیے کے تلخ احساس سے نجات دلانے کے لیے دو الفاظ دے رکھے ہیں۔ بے شعوری کو پختہ کرنے والے دو الفاظ: تقدیر اور صبر۔ پھر ان دونوں کو مزید پختگی دینے کے لیے دو الفاظ مستعار لیے ہیں: امید اور انتظار۔ اپنے ہر دکھ کو تقدیر سمجھ کر بے بسی کے احساس سے چھٹکارا پانے کے لیے محروم طبقوں کی ساری زندگی گزر جاتی ہے اور وہ امید کے سائے میں اپنی زندگی کا سفر جاری رکھتے ہیں۔ اپنے ہر دکھ پر صبر کے ساتھ وہ عمر بھر اپنی آرزوؤں کو خود ہی کچلتے رہتے ہیں اور انتظار کے نہ ختم فریب میں مبتلا رہتے ہیں، لیکن نہ دکھ ختم ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کے احساسات سے نجات ملتی ہے۔ شاید کچھ لوگ یہ کہیں کہ تقدیر پر اعتقاد اور صبر کی تلقین سے عارضی سکون تو مل ہی جاتا ہے، لیکن جو ذہنی عوامل دبائے جاتے ہیں وہ انسان کے لیے زندگی بھر عقوبت کی راہیں کھولتے رہتے ہیں۔ ناآسودگی اور محرومی کی چنگاریاں راکھ میں دب کر بھی سلگتی رہتی ہیں۔ حالات و واقعات کے تیز جھونکوں سے جب یہ راکھ اڑتی ہے اور خواہشات سوکھے پتوں کی طرح اس پر گرتی ہیں تو الاؤ بھڑک اٹھتا ہے۔ یہ آگ زندگی بھر سرد نہیں ہوتی۔ کوئی نظریہ، کوئی مذہب انسانی معاشروں میں محروم لوگوں کی دائمی مدد نہیں کرتا۔ مذہبی رہنما بھی اس تلخ حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے۔ بظاہر ایک بہت راسخ العقیدہ اور صابر شخص بھی داخلی طور پر محرومی کے الاؤ میں جلتا رہتا ہے لیکن اپنے عقیدے کی خاطر اور مذہبی معاشرت کے دباؤ میں اپنی ناآسودگی کو چھپائے رکھتا ہے۔ اپنے زرد دل کو لب و چشم کے زاویوں تک نہیں آنے دیتا۔ اگر کسی مذہبی رہنما کو زندگی کے کسی بھی حصے میں اس شکست خوردگی کا احساس ہو بھی جاتا ہے، اگر وہ اپنے ضمیر کی کسی کرن سے تاریکی میں چھپی اس تلخ حقیقت سے آشنا ہو بھی جاتا ہے تو فوراً اسے نظام کا نام دے کر پھر تاریکی کے دبیز پردوں میں چھپا دیتا ہے۔ اپنے ہی روشن شعور سے خوفزدہ ہو کر اسے جارحیت قرار دیتا ہے اور دروغ میں لگ جاتا ہے۔ نظام کی تمام تر ذمے داری غیر مرئی ماورائی قوت پر ڈال دی جاتی ہے۔ انتظام کی چھاؤں میں وہ پرسکون ہو جاتا ہے۔ دوسری جانب دنیا بھر میں محروم انسان اپنی ناآسودگی، نارسائی اور بے بسی کے ساتھ جبر کے الاؤ میں جلتے رہتے ہیں۔ اگر اپنا ذہنی

تو ان پر قرض رکھ سکیں تو شکورا بن جاتے ہیں۔"

چاند بلند ہو کر چمک رہا تھا۔ دھیمے چمکتے چاند کی روشنی میں اب جھاڑیوں کے میدان میں ہوا کے جھونکوں سے سرسراتی جھاڑیاں اور پہاڑیوں کی ڈھلوانیں روشن ہو چکی تھیں۔ جوہڑ کے تین کناروں پر پہاڑیوں کے پیچھے روشنی مدھم تھی۔ جوہڑ کے پانی میں اب ارتعاش نمایاں تھا اور اس تموج سے لہروں پر چاندنی چمک چمک جاتی تھی۔ شکورا پھر دکھی رہا تھا۔

"یہ المیہ صرف شکورے کا نہیں" میری سوچ کا رخ بدلا۔ "یہ دنیا کے ان تمام ملکوں کا المیہ ہے جسے بڑی طاقتیں تیسری دنیا کہتی ہیں۔ انھوں نے گزشتہ صدی ہی میں یہ اصطلاحات بنائی تھیں پہلی دنیا۔ دوسری دنیا... تیسری دنیا.. ترقی یافتہ۔ ترقی پذیر... غیر ترقی یافتہ شاید ان اصطلاحات سے ان کی انا کو تسکین ملتی ہوگی۔ یہ اصطلاحات صدیوں پرانی ہیں، ورنہ روم کے سیزر کاسٹوں کے زار، برٹش ایمپائر اور دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے دانشور یہ بات اپنی تحریروں میں بھی نہ لکھتے کہ وہ مفتوح ممالک کو ترقی پذیری کے عمل سے گزار کر ترقی یافتہ بنانا چاہتے ہیں۔ ان اصطلاحات کو بدلنے کی مثبت کوشش نہ کبھی ہوئی تھی نہ ہو رہی ہے۔ اگر کہیں کچھ ہوا بھی ہے تو وہ فاتح اقوام کے ہی مفادات کی خاطر ہوا ہے۔ یہ اصطلاحات ہمیشہ سے قائم ہیں کیونکہ ان کو بدلنے کی ہر کوشش اس کرۂ ارض پر قوتِ شر کے خلاف بغاوت ہوگی پہلا قدم — شاید طاقت [illegible] روکنے کے لیے وہ ازل سے راہ میں حائل ہے۔ لیکن میں اپنے تخیل پر ہمیشہ سے قائم [illegible] ارض پر عالمِ ممات میں لمحہ بہ لمحہ مرتے ہوئے لمحات میں کوئی نہ کوئی محرمِ حیات میں زندگی کا بوجھ اٹھانے میں کامیاب ہو جائے گا۔"

میری نگاہیں جھاڑیوں والے اجاڑ میدان کی سمت گئیں۔ شکورا [illegible] محسوس ہو رہا تھا وہ کسی مویشی کی طرح بیٹھے بیٹھے سو گیا ہو۔

"ہم دنیا میں ایسے خطۂ زمین پر رہ رہے ہیں..." میں نے شکورے کی طرف [illegible] اکثریت کی زندگی مویشیوں سے بھی بدتر ہے۔ یہاں کے اہلِ اقتدار و تخت [illegible] ترقی یافتہ نہیں ترقی پذیر ہے۔ کیا بڑے بڑے شہروں میں اونچی اونچی عمارات بنا کر [illegible] سڑکیں بچھا کر شہروں کے مضافات میں انڈسٹریل اسٹیٹس قائم کر کے شہروں میں [illegible] اور [illegible]

نئے اسپتال بنا کر، سڑکوں پر بے شمار کاریں لا کر، یہ ملک ترقی پذیر ہو گیا ہے؟ ملک کی اسی فیصد آبادی دیہات میں رہتی ہے۔ ایسے دیہات کثرت سے ہیں جہاں زندگی کی کوئی سہولت میسر نہیں، جہاں بجلی نہیں، پینے کا صاف پانی نہیں، تعلیم کی سہولتیں نہیں، طبی سہولتوں کا تصور تک موجود نہیں، جہاں حاملہ عورتیں دوسروں کی طرح مرتے ہوئے ہر سمت نظر آتے ہیں۔ کیا یہی ترقی پذیری ہے؟ ملک میں اگر ترقی پذیری ہے تو وہ صرف شہروں میں نظر آتی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ آزادی کے بعد حکومت کا ہر صوبہ ضلعی سطح پر ایک برس میں کم از کم بیس گاؤں ایسے تیار کرتا جہاں ہر مکان پختہ ہوتا، ہر گلی پختہ ہوتی، جہاں تعلیم کی مکمل سہولتیں میسر ہوتیں، بچے اور بچیوں کے لیے ہر گاؤں میں ہائی سکول ہوتا جہاں پڑھے لکھے اساتذہ ہوتے۔ ہر پانچ گاؤں کے لیے ایک کالج ہوتا۔ جہاں صحت کی تمام سہولتیں میسر ہوتیں۔ ہر گاؤں کا اپنا اسپتال ہوتا اور ہر پانچ گاؤں کے لیے ایک بڑا اسپتال ہوتا جو جدید طبی سہولتوں سے آراستہ ہوتا۔ ہر گاؤں کی کمیٹی گاؤں کی صفائی کی ذمہ داری ہوتی، پینے کا صاف پانی فراہم کرتی، سیوریج کا انتظام قائم کرتی۔ ہر گاؤں میں ایک مارکیٹ ہوتی اور مارکیٹ کی دیکھ بھال کے لیے مارکیٹ کمیٹی۔ ہر پانچ گاؤں ایک بڑی منڈی سے جڑے ہوئے جہاں جانے کے لیے پختہ سڑکیں ہوتیں۔ ہر گاؤں میں گھریلو دستکاری کے مرکز ہوتے۔ خواتین کو روزگار ملتا۔ جہاں دیہات کے لوگ فرسودہ عقائد سے آزاد ہوتے، ان کی غلامانہ زندگیوں کی تاریکی ختم ہو جاتی۔ جہاں کوئی شکورا تعلیم سے محروم نہ رہ جاتا، کوئی شیداں تڑپ تڑپ کر نہ مرتی، جہاں کوئی رحمت ڈھولی بیماری کی کلائی پر کالا دھاگہ نہ باندھتا، جہاں کسی نادر خان کا گدھا کوبرے کے کاٹنے سے نہ مرتا، جہاں کسی دلکو کو اپنا جسم نہ بیچنا پڑتا۔ لیکن ہو کیا؟ برس گزر چکے ہیں اور اہل اختیار و اقتدار نے دیہات کو تقدیر کے حوالے کر رکھا ہے جہاں بڑے بڑے جاگیردار اور مذہبی اجارہ دار سیدھے سادے دیہاتیوں کے زخموں پر صبر کا مرہم لگاتے رہتے ہیں۔

شکورا واقعی سوچ رہا تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ توازن کھو کر گر نہ جائے۔

"ہمارے دیہاتیوں کے لیے تفریح کے ذرائع محدود ہیں۔ بیساکھی کے کھیل، میلے، صدیوں سے یہی تفریح ہمارے دیہاتیوں کو میسر ہیں یا شادیوں پر عورتوں کے جھرمٹ میں لڑکیاں ناچتی ہیں اور مردوں میں بچوں اور بچیوں کی موجودگی کے باوجود بھانڈ عامیانہ جگتیں کر کے باراتیوں کو

ہنساتے ہیں۔"

مجھے شہید کی وہ جگت یاد آئی جو اس نے ریشمیٹ میدان میں سکول کے لڑکے سے کی تھی۔ یقیناً اس سے ملتی جلتی کوئی جگت اس نے کسی بھانڈ سے سنی ہوگی۔

"کاش ہمارے دیہات میں دیہی کلب ہوتے جہاں وہ ان ڈور کھیلیں بھی کھیلتے اور اپنے مسائل پہ بات چیت بھی کرتے۔ لیکن جو نظام صدیوں سے قائم ہے، حکمران اسے خود ہی ختم نہیں کرنا چاہتے۔ کریں بھی تو کیسے؟ وہ خود بھی اسی استحصالی گروہ کے اراکین ہیں جو دیہات کو پسماندہ رکھنا چاہتا ہے۔ کبھی کبھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس حصہ زمین کے وہ افراد جو ترقی پذیری سے وابستہ ہیں، یہ سوچ رہے ہیں کہ جس انداز میں بھک مری اور قدرتی آفات سے گھبرا کر دیہاتی شہروں کی طرف بھاگ رہے ہیں، بیس اور پچیس برس تک شہر کی حدود اتنی وسیع ہو چکی ہوں گی کہ سارا ملک ہی ایک بڑا شہر بن جائے گا اور موجودہ شہر اس شہر کے مختلف علاقے ہوں گے، محلے ہوں گے۔ ترقی پذیری مکمل ہو جائے گی اور ترقی یافتگی کے راستے استوار ہو جائیں گے۔ لیکن ہوگا کیا؟ موجودہ ترقی سے وحشت افزائی۔ آئندہ نسلیں ایک دوسرے کا منہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھیں گی کہ اناج کہاں سے لائیں، پھل اور سبزیاں کہاں سے فراہم کریں۔ بھیانک سیاست کا جو انداز دنیا میں نظر آ رہا ہے، بیس پچیس سال تو بہت ہیں، جلد ہی بڑی بڑی جنگوں کے بعد موجودہ بڑے بڑے شہر کھنڈرات میں بدل جائیں گے۔ اگر موجودہ سیاست کا انداز جاری رہا تو اس زمین پر خاکستر کی تہہ جم جائے گی۔ جلی ہوئی خاکستر زدہ زمین پر کوہساروں، میدانوں اور ساحلی علاقوں پر کہیں بھی ہریالی نظر نہیں آئے گی۔ سبز رنگی میں اجاڑ ہو جائے گی سب کچھ مٹ جائے گا۔"

مجھے ساہیوال میں قائم ٹمن کمپنی کا جاپانی منیجر سابورو اکوئی (Saburo Akui) یاد آیا۔ وہ میرا دوست بن گیا تھا۔ ایک دن اس نے مجھے کہا کہ یہ ملک جس میں تم رہ رہے ہو کبھی ترقی نہیں کرے گا۔ میں نے پوچھا کہ کیوں؟ تو اس نے کہا کہ مجھے چار مہینے ہوئے ہیں یہاں آئے ہوئے اور میں نے اندازہ لگایا ہے کہ یہاں ہر کوئی صرف اپنی ترقی چاہتا ہے۔ جن معاشروں میں یہ رجحان جڑ پکڑ لیتا ہے وہ معاشرے ترقی نہیں کیا کرتے۔ وہاں صرف خاندان ترقی کیا کرتے ہیں اور وہ دوسروں کے لیے ترقی کی راہیں مسدود کر دیتے ہیں۔ کیونکہ عدلیہ انتظامیہ کی محکوم ہو جاتی ہے، انتظامیہ

ترقی یافتہ خاندانوں کے افراد پر مشتمل ہوتی ہے اور انصاف مٹتے مٹتے مٹ جاتا ہے۔

"کتنی درست بات کی تھی ساجو رو کوئی نے کہ یہاں خاندانوں ہی نے ترقی کی ہے اور کر رہے ہیں۔ میونسپل کمیٹیوں میں، قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں، سینیٹ میں انھی خاندانوں کے لوگ رعونت سے بیٹھے نظر آتے ہیں۔ انتظامیہ ان کی محتاج ہے۔ اگر مسلح افواج ان کی سیاست سے تنگ آ کر ملک پر قبضہ کر لیتی ہیں تو پھر جرنیلوں کے خاندان ترقی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ سلسلہ ختم ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ شہری علاقوں کے اہل ثروت کی طرح دیہاتی علاقوں میں جاگیردار اپنے ملازموں اور مزارعین کو زرخرید غلام سمجھتے ہیں۔ تمام تر مزدور کسان پارٹیوں کی موجودگی میں بھی جبر و تشدد جاری رہتا ہے۔ اہل ثروت اور جاگیردار اس ظلم و تعدی کے ماحول اور استحصال کے ماحول کو نظام، ناگزیر نظام کا نام دے کر، اپنی بقا کی خاطر جاری رکھنے کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں کیونکہ یہ جور و ستم کا نظام ہی ان کی بقا کا ضامن ہے۔ ایک اور طبقہ پیروں کا ہے، مذہبی رہنماؤں کا ہے، جو شہری اور دیہاتی علاقوں میں ان پڑھ سادہ لوح انسانوں کا زبردست استحصال کر رہا ہے۔ مذہبی قیود اور اعتقادات کی آڑ میں یہ طبقہ صدیوں سے انسانیت کا خون چوس رہا ہے۔ ان کے دربار اور ڈیرے دراصل وہ دکانیں ہیں جہاں خوف اور خود غرضی کے اسیر نوٹ ہدیے کی رقم دے کر نقش سلیمانی، تعویذ اور کالے دھاگے خریدتے ہیں۔ کوئی اس طبقے کے خلاف آواز نہیں اٹھاتا۔ اگر اس طبقے کا کوئی رکن بے نقاب ہو جاتا ہے تو باقی سب اسے علیحدہ کر کے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ خواتین ان کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتی ہیں، عوام پاؤں چومتے ہیں۔ یہ طبقہ اہل ثروت اور جاگیرداروں کا اپنا ہاتھ ہے اور یہی طبقہ ان کے لیے جبر و استحصال کی راہیں ہموار کرتا رہتا ہے بلکہ ان کے لیے ڈھال بھی بن جاتا ہے۔ اس طبقے کی رسائی سادہ لوح افراد کے شعور تک ہی نہیں، ان کے لاشعور تک ہے۔ یہ طبقہ معاشرے میں جاہلیت پھیلانے اور فرسودہ اندھی عقیدتوں کو پھیلانے میں اہم ترین کردار ادا کرتا ہے۔ اسی طبقے کی وجہ سے دیہاتی عمر بھر اجڈ اور گنوار رہتے ہیں۔ دیہاتی تو ان پڑھ ہوتے ہی ہیں، میں نے تو پنجاب یونیورسٹی میں ایم اے کرنے والوں کے گلوں میں تعویذ اور کلائیوں پر کالے دھاگے بندھے دیکھے ہیں۔ دیہاتی تو ویسے بھی اجڈ اور گنوار ہیں۔ یہی طبقہ دیہاتی معاشروں میں حشمت ڈھوں اور شکورے جیسے کردار پیدا کرتا ہے۔"

"تم کیا ہوا ہے؟" شکورے کی آواز پر میں اپنے خیالوں سے نکلا۔ گھڑی دیکھی تو رات کے تین بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔ میں دو بجے کی خبریں سننا بھول گیا تھا۔

"خبروں میں سات منٹ باقی ہیں شکورے،" میں نے کہا۔

شکورے نے تھوڑی سی نیند کے بعد جمائی لی اور خمار آلود آنکھوں سے مجھے دیکھا۔

"ریڈیو تو لگاؤ،" اس نے کہا۔

"سورج نکل رہا ہوگا اور تو پھر ڈر جائے گا کہ جگہ اجاڑ سی ہے،" میں نے کہا۔

"تجھے ڈر نہیں لگتا؟" شکورے نے کہا۔ "جنوں سے بھوتوں سے اور چڑیلوں سے؟"

شکورے نے پھر جھرجھری لی۔

"نہیں،" میں نے کہا۔ "مجھے تو کوئی ڈر نہیں محسوس ہوتا۔"

"جنکوں (جونکوں) سے ڈرتا ہے اور جنوں سے نہیں؟" شکورے کے چہرے پر کھنچاؤ نمودار ہوا۔

"جونکیں بھی تو چڑیلیں ہی ہوتی ہیں شکورے،" میں نے کہا، "چمٹ کر خون چوستی ہیں۔"

شکورے کے چہرے کا کھنچاؤ کم ہو گیا۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ سی آئی۔

"اب تو ٹائم بتائیں گے؟" شکورے نے ہتھیلی ہونٹوں پر رکھ کر جمائی لی۔ "بڑی دیر ہو گئی ہے۔"

کچھ دیر بعد میں نے ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی ٹیون کیا۔ وہاں سے ساز بج رہا تھا۔

پھر خبروں کا اعلان ہوا۔

"نیوز ان اسپیشل انگلش۔"

"شکورے،" میں نے کہا۔ "مجھے خبریں سن لینے دینا، شور نہ مچانا۔"

بھاری بھرکم آواز والے نیوز کاسٹر نے دھیمے لہجے اور زیادہ سمجھ میں آنے والے انداز میں خبریں شروع کیں۔ اس نے پہلے اقوام متحدہ کی خبر سنائی، پھر امریکی سینیٹ کی، پھر سکائی لیب کی خبر شروع کی۔ سکائی لیب کے الفاظ سن کر شکورا چونکا۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ شکورا جھٹکے سے اٹھ کر اکڑوں بیٹھ گیا۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ سکائی لیب زیادہ سے زیادہ

نوے منٹ کے اندر زمین پر آ گرے گی۔ ناسا (NASA) اس معاملے میں بہت ذمے داری سے کام لے رہا ہے۔ سکائی لیب ''

''کیا کہا اس نے؟'' شکورا اچھلا اور میرا دھیان خبروں سے ہٹ گیا۔ ''وہ کیا بتا رہا ہے؟ کتنی دیر ہے گرنے میں؟ گرنے والی تو نہیں؟'' اس نے آسمان کی طرف منہ اٹھایا۔ ''کچھ بول بھی کیا خبر ہے؟''

نیوز کاسٹر نے شاید طول بلد اور عرض بلد سے متعلق کوئی معلومات بتائی تھی جو میں شکورے کے شور میں سن نہ سکا۔ وہ مسلسل چیخ رہا تھا۔

''کیا خبر دی ہے؟'' کچھ بک بھی'' شکورے کی آواز میں غصہ ابھرا۔ وہ جب بھی چیختا تھا تو اس کی آواز آندھی کے تھپیڑوں کی طرح ہو جاتی تھی۔

''شکورے!'' میں نے بلند آواز میں کہا۔ ''کیا ہو جاتا ہے تجھے؟ سب سے اہم خبر تو تو نے سننے ہی نہیں دی۔''

''بتایا کیا ہے اس نے؟'' شکورے نے غصے میں شاید میری بات ہی نہیں سنی تھی۔ ''کچھ بتا بھی!'' وہ چیخ رہا تھا۔

''سکائی لیب اگلے نوے منٹ یعنی ڈیڑھ گھنٹے میں زمین پر گرے گی۔ اس سے پہلے بھی گر سکتی ہے'' میں نے کہا۔ شکورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور آسماں کی طرف دیکھتے ہوئے گھوم سا گیا۔

''کہاں گرے گی؟'' ''یہ تو تو نے سننے ہی نہیں دیا۔'' میں نے کہا۔ شکورے نے شاید پھر میری بات نہ سنی۔

''کس طرف سے آئے گی سکلیب؟'' اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کر پوچھا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا تو سیدھا جوہڑ کے کنارے کیچڑ میں جا گرے گا۔ وہ پھر آسماں کو دیکھتے ہوئے گھوما۔ اس کے چیتھڑے بھی کندھوں پر ہوا کے جھونکوں میں لہراتے ہوئے گھومے۔

''بیٹھ جا شکورے،'' میں نے کہا۔ ''سکائی لیب کس طرف جائے گی، یہ خبر تو نے مجھے سننے ہی نہیں دی۔''

''جائے گی کہاں، بیوقوف!'' شکورے نے نخی کی طرف دیکھا۔ ''یہیں گرے گی۔''

''نہیں وہ بھی کر سکتی ہے۔'' میں نے پہلی بار بیدردی سے کہا۔ شکورا تیزی سے میری طرف مڑا۔ اس نے مجھے پرتشویش نظروں سے دیکھا، آنکھیں کھول کر بڑی بڑی کر لیتیں۔

''بک بک مت کرو۔'' وہ غصے سے چیخا۔ ''کشف ہوا ہے مجھے پیر مراد شاہ نے...'' شکورے نے دائیں ہاتھ کی پہلی انگلی اور انگوٹھے کو ملا کر ہونٹوں سے لگایا، چوما، پھر انگلی اور انگوٹھے کو آنکھوں سے لگایا۔ ''پیر جی نے خود مجھ سے کہا ہے کہ سکلیب کھوڑی اس پتی میں رہے گی... کیا وہ جھوٹے ہیں؟ توبہ توبہ۔ پیر مراد شاہ جی... توبہ کر توبہ۔'' شکورے نے دونوں ہاتھوں کی پہلی انگلیوں اور انگوٹھوں سے اپنے کانوں کی لووں کو پکڑا۔ ''توبہ استغفار۔ توبہ... ایسا مت کہا کر مت۔''

میں خاموش رہا۔ شکورا ایک بار پھر جوہڑ کی طرف منہ کر کے بیٹھ گیا۔ پٹھان کا سخت ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس وقت مجھے پٹھان کچھ زیادہ ہی سخت محسوس ہو رہی تھی۔ ایک ہی جگہ بیٹھے سے مجھے کولہے کی ہڈی میں دھیما دھیما سا درد محسوس ہو رہا تھا۔ ہڈیوں سے جڑے عضلات میں اینٹھن سی تھی اور میرا نچلا جسم بے حس ہو چکا تھا۔ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے چار گھنٹے گزر چکے تھے۔ مجھے شدت سے احساس ہوا، اگر آتے ہوئے میں کرسیوں پر پڑی دو گدیاں لے آتا تو اس تکلیف سے شکورا بھی بچ جاتا۔ میں نے شکورے کی طرف دیکھا۔ وہ مزے سے بیٹھا تھا، میری طرح بار بار پہلو نہیں بدل رہا تھا۔ سارا دن دکان پر نیبالی کے سامنے لکڑی کی چوکی پہ بیٹھنے والے شکورے کو تو پٹھان کی سختی کا احساس بھی نہیں تھا۔ شکورے کے پاس چادر تو تھی لیکن مجھے چادر مانگنا عجیب لگا۔

''محرومی کی کوئی صورت نہیں ہوتی۔'' کچھ دیر پہلے والی سوچ پھر میرے ذہن میں ابھری۔ ''ہر انسان کو، چاہے وہ غریب کے گھر جنم لے یا امیر کے، کسی نہ کسی روپ میں محرومی اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ امیروں کی محرومی اگر مادی ہو تو بہت جلد دور ہو جاتی ہے، لیکن غریبوں میں محرومی ان کے ساتھ پیدا ہوتی ہے، لڑکپن میں داخل ہوتی ہے، جوان ہو جاتی ہے، پھر ادھیڑ پن سے گزرتی ہے اور بالآخر محرومی بوڑھی ہو جاتی ہے لیکن کسی تصوراتی ہمزاد کی طرح انسان سے خود کو ایک پل کے لیے بھی جدا نہیں ہونے دیتی، زندگی کے راستے پر اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہے کیونکہ اگر کوئی غریب محنت اور ذہانت سے یا کسی ہتھکنڈے سے اہل ثروت کے حلقے میں داخل ہو بھی جاتا ہے تو وہ غریب طبقے سے جدا ہو جاتا ہے۔ محنت اور ذہانت کے لیے بھی کسی وسیلہ کار، ضرورت ہے

نہیں دیکھے لیکن ایسے کئی لوگ اس دنیا میں موجود ہیں جو نہ صرف ہتھکنڈوں سے، میروں کے حلقے میں شامل ہو جاتے ہیں۔ لیکن غریبوں کے لیے محرومی کا دکھ زندگی بھر ان کے ساتھ رہتا ہے۔ یہ الاؤ جلتا رہتا ہے.. شکورا اس کی بہترین مثال ہے۔ وہ تو اپنے جبلی تقاضوں کا اس قدر اسیر ہے کہ شیدان کی موت کے بیس دن بعد ہی وہ ذکو پھر کی کے پاس چلا گیا تھا۔ اس کا شعور تاریکیوں میں روپوش ہے۔ وہ جاہلیت کی گہرائیوں سے کبھی نکل ہی نہیں پایا۔ اس دنیا میں، انسانوں کے روپوش معاشروں میں، نہ جانے کتنے شکورے ہوں گے۔“

میں نے شکورے کی سمت دیکھا۔ وہ بے چینی سے آسمان پر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔

”کتنے شکورے ہوں گے جو محرومی کے زخم کھا کر جی رہے ہوں گے یہ زخم جو کسی مرہم سے مندمل نہیں ہوا کرتے۔ حاصل کا سکھ ان دکھوں کے زخموں کو بھر تو دیتا ہے لیکن داغ اندمال زندگی بھر باقی رہتا ہوگا۔“

شکورے نے پہلو بدل کر میری طرف دیکھا۔

”کتنا لوہا ہوگا سکلیب میں؟“ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا۔

”بہت ہوگا۔“ میں نے جواب دیا۔

”ہزاروں من ہوگا؟“ اس نے کہا۔

”ہاں اتنا تو ہوگا۔“

میرے اس جواب پر شکورے کی آنکھیں چمکیں۔

”کروڑوں روپے کا ہوگا“ اس نے خوشی سے کہا۔ ”یار.... بہت پھیرے لگیں گے!“

مجھے شدت سے صورتحال کی سنگینی کا احساس ہو رہا تھا۔ جب شکورے کو سکائی لیب کہیں اور گر جانے کی خبر ملے گی تو اس کا ردعمل بہت خطرناک اور شدید ہوگا۔ اس کے دل میں دبی ہوئی خواہشات، اس کی بھائی کے پاس دھری انگیٹھی کی طرح اس کے دل میں محرومی کے دہکتے ہوئے کوئلے جلیں گے۔ اس صدمے کے بعد تو وہ شاید اپنے وجود ہی کو دہکتے کوئلوں پر اس لوہے کی طرح محسوس کرے گا جس سے وہ سنگل اور زنجیریں بناتا ہے۔

موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا

Scanned with CamScanner

غالب کے اس مصرعے کا مفہوم مجھے کھلی آنکھوں سے دکھائی دے رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ جنون کی ایسی ہی جب انسان کے ذہن میں کنڈلی مار کر بیٹھ جاتی ہے تو اس سے آزاد ہونا اس دنیا کے مشکل ترین کاموں میں سے ایک ہوگا۔ کیا ہوگا؟ میری گھبراہٹ بڑھ رہی تھی۔

"کب گرے گی سکلیب؟" شکورا بے چین تھا۔

"بتایا تو ہے۔ ایک گھنٹے تیس منٹ کے اندر گر جائے گی۔" میں نے کہا۔

"صبح ہو جائے گی؟" شکورے کے لہجے میں تشویش تھی۔

"ہاں، ہو تو جائے گی۔" میں نے کہا۔

شکورا بار بار آسمان کی سمت دیکھ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر سکون محسوس ہو رہا تھا کہ شکورے کے ذہن میں نادرے کی گفتار یز سے متعلق یہ بات موجود نہیں تھی کہ وہ صبح صبح سرخی لیے سپیدہ پھیلا دیا کرتا ہے ورنہ وہ میرے لیے ایک اور مصیبت کا رستہ کھول دیتا کہ ابھی سے گرا دو۔

"لوہے کی کیا قیمت ہے بازار میں؟" شکورے نے پوچھا

"مجھے اندازہ نہیں ہے شکورے۔" میں نے جواب دیا۔ "کبھی کسی سے پوچھا ہی نہیں میں نے۔"

"کروڑوں روپے کا ہوگا لوہا سکلیب میں۔" شکورے کے ہر لفظ میں بے چینی تھی۔

"کیا کرے گا تو اتنی دولت کا؟"

میرے اس سوال پر شکورے کے پورے بدن نے جھٹکا کھایا۔

"سکلیب میری ہوگی۔" وہ تشویشناک لہجے میں بولا۔

"میں نے کب کہا ہے کہ تیری نہیں ہوگی۔" میں نے کہا اور شکورے کے ذہن میں ابھرنے والا شک مٹ سا گیا۔ اس کے چہرے پر سکون سا نمودار ہوا۔

"کروڑ پتی بن جاؤں گا۔" اس نے پورا بدن گھمایا اور میری سمت دیکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر خوشی کا تاثر بہت صاف تھا۔ "زندگی بن جائے گی میری۔" وہ مسکرایا۔

"کچھ تو سوچ رکھا ہوگا تو نے؟" میں نے کہا۔

"سب سے پہلے تو،" شکورے کی آواز میں خوشی کا تاثر بھرپور تھا۔ "میں رہ پنڈی جا کر کسی

Scanned with CamScanner

وہ سب میں رکھوں گا۔ اسے اپنے ساتھ رکھوں گا اور کروڑوں روپے کا لوہا بیچوں گا۔ پر یار، میں اتنے روپے رکھوں گا کہاں؟"

"بینک میں،" میں نے جواب دیا۔

"بینک کیا ہوتا ہے؟" شکورے نے پوچھا اور اسے جواب دینے کے لیے مجھے یہ سوال مشکل ترین محسوس ہوا۔

"بینک ایک کمپنی ہوتی ہے،" میں نے شکورے کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ کمپنی کے لفظ سے وہ واقف تھا۔ "لوگ اپنا روپیہ بینک میں رکھتے ہیں اور جب ضرورت محسوس ہوتی ہے، نکلوا لیتے ہیں۔ تمام امیر زادے بینک ہی میں روپے رکھتے ہیں۔"

"پر یار،" شکورے نے پوچھا، "وہ میرا روپیہ کھا تو نہیں جائیں گے؟"

"نہیں شکورے،" میں نے کہا، "جو بڑے بینک ہوتے ہیں وہ حساب صاف رکھتے ہیں۔"

"چھوٹوں کے پاس تو میں نے جانا ہی نہیں،" شکورے نے کہا۔ "جب میرے پاس کروڑوں روپے ہوں گے تو میں پہلے راولپنڈی میں زمین خرید کر سنگلوں اور زنجیروں کا کارخانہ لگاؤں گا۔ بہت سے ورکر رکھوں گا۔ میرے کارخانے میں ہر روز سو سنگل اور دو سو زنجیریں بنیں گی۔ اور کارخانے کے ساتھ ایک بنگلہ بناؤں گا۔"

"وہ کس لیے شکورے؟" میں نے پوچھا، اور شکورے کی آنکھیں چمکیں۔

"تیرے لیے،" شکورے نے فوراً کہا۔ "تو میرا اچھا یار ہے۔ تو ہی میرے کارخانے کا ایجنٹ ہوگا۔"

"منیجر تو کمپنی کے ہوتے ہیں شکورے،" میں نے کہا۔ "جیسے یہاں ہیں، مارکیٹنگ فیلڈ منیجر، سروس فیلڈ منیجر۔ کارخانوں کے تو جنرل منیجر ہوتے ہیں۔"

"ہاں ہاں وہی جرنیل،" شکورے نے کہا۔

"جرنیل تو فوج میں ہوتے ہیں شکورے،" میں نے کہا۔ "جنرل منیجر۔"

شکورے کو غصہ آ گیا۔

"پڑھ لکھ کر کیا سمجھنے لگا ہے تو اپنے آپ کو؟" وہ غصے سے بولا۔ "میں تجھے خوشخبری سنا رہا ہوں

اور تو..."

"دیکھ شکورے،" میں نے کہا، "تو کارخانے کا ... ہوگا۔ تجھے سب سے بڑا [illegible] ..."

پوچھا۔ "شکورے کا غصہ فوراً اتر گیا۔ "تو میرے کارخانے کا [illegible] [illegible] سکتا۔ میں تجھے ساڑھے تین سو روپے تنخواہ دوں گا۔

"صرف ساڑھے تین سو روپے شکورے؟" میں نے کہا۔ "اتنی تنخواہ تو تجھے کارخانے کا چپڑاسی بھی نہ لے گا۔"

"[illegible]" شکورے نے تصور ہی تصور میں ... پھر میری طرف دیکھ کر "تو بہت لالچی ہے! اچھا چل پچیس روپے اور ... ایک پیسہ اور نہیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے،" میں نے کہا۔ "تو جو بھی دے گا میں لے لوں گا۔"

شکورے کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے بڑے فخر سے [illegible] پھر میری طرف دیکھا۔

"چار حویلیاں بنواؤں گا کھوڑ گاؤں میں زمین خرید کر،" شکورے نے خوش ہو کر ... ملک [illegible] کی حویلی سے میری ہر حویلی بڑی ہوگی اور ہر حویلی میں دو جیپیں ہوں گی۔"

"چار حویلیاں کیوں شکورے؟" میں نے پوچھا۔

"ہر حویلی میں میری ایک بیوی ہوگی۔" شکورے کی وحشت زدہ آنکھوں میں خوشی کی چمک تھی۔

"چار شادیاں کرے گا تو؟" میں نے کہا۔

"ہاں" شکورے نے کہا۔ "مرد ہوں ... مسلمان ہوں ... شرع میں جائز ہیں چار شادیاں ... میری ایک بیوی..." شکورے نے قہقہہ لگایا، "گوری چٹی میم ہوگی۔"

مجھے شکورے کی اس دبی ہوئی خواہش پر واقعی حیرت ہوئی۔ شاید اس نے [illegible] افسروں کی بیوی کو کوئی بار دیکھا ہوگا۔ شاید اس نے جویا لینارڈ کو دیکھا ہوگا کیونکہ وہی ایک جوان اور خوبصورت عورت تھی۔ باقی تین انگریز عورتوں میں سے دو ادھیڑ عمر کی [illegible] حدود [illegible] تھیں۔ ایک اس قدر بوڑھی تھی کہ آئینے میں اپنے چہرے کی جھریاں بھی [illegible] پاتی ہوگی۔

"شکورے،" میں نے کہا۔ "تو ان پڑھ ہے۔ میم تجھ سے کیوں شادی کرے گی؟"

"پیسہ!۔ دولت!۔۔" شکورے نے دائیں ہاتھ کی پچھلی انگلی سے انگوٹھا ملا کر اسے او پر کی سمت جھٹکا دیا جیسے سکہ اچھال رہا ہو۔ "بیوقوف! میرے پاس دولت ہوگی۔ ایک نہیں ہزار میمیں مجھ سے شادی کے لیے تیار ہو جائیں گی۔ پر میں۔" شکورے نے آسمان کی طرف دیکھ کر سینے پر ہاتھ رکھا۔ "میں مسلمان ہوں۔ پہلے اسے کلمہ پڑھواؤں گا، پھر نکاح کروں گا۔"

"اور دوسری؟" میں نے پوچھا۔

"دوسری بھی گوری چٹی ہوگی۔" شکورے نے کہا۔ "اس کے گال انار کے دانوں جیسے سرخ ہوں گے۔۔۔ پٹھانی ہوگی وہ۔"

میں نے بمشکل ہنسی روکی۔ شکورا خوشی سے چہرے کو اوپر نیچے ہلا رہا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر غصے کا تموج دار ہوا۔

"پٹھانی سے شادی کا سدا (دعوت) میں خود دینے جاؤں گا نثار جانے (نثار خان) کو۔" شکورے نے پڑوسی کا ذکر کر نفرت آمیز لہجے میں کہا۔ "خود جاؤں گا سدا دینے۔ آپ جا کر باجا وہی بجائے پٹھانی سے شادی میں۔ پرسوں میں نے ڈتے (عبداللہ) کی گانے کے بے سنگی بجائی شروع ہی کی تھی، حرامی مجھے پشتو میں گالی دے کر بھاگ گیا تھا۔"

"پر شکورے،" میں نے کہا۔ "میم انگریزی بولے گی، پٹھانی پشتو۔ تو باتیں کیسے کرے گا؟"

"بیوقوف!" شکورے نے بلند آواز میں کہا۔ "ہا۔۔۔ بیوقوف ہے تو! او۔۔۔ شادی میں باتوں کا کیا کام؟"

مجھے ایک بار پھر احساس ہوا کہ شیدا اس کی موت کے بعد شکورا اپنے جبلی تقاضے کا بری طرح اسیر ہو چکا ہے۔ اس کے تصور ذہن میں اب شادی کا مطلب صرف جنسی تسکین ہے۔ وہ عورت اور مرد کے معاشرتی رشتے کو بھول چکا ہے اور دونوں کے درمیان کسی ارفع تعلق سے قطعی طور پر نا آشنا ہے۔

"اور تیسری بیوی؟" میں نے پوچھا۔

"مانوئی ہوگی۔" شکورا مسکرایا۔

"ڈلو چھری جیسی؟" میں نے کہا اور شکورے کی آنکھوں میں وحشت زدہ آنکھوں میں غصہ

Scanned with CamScanner

نمودار ہوا۔

"بکواس نہ کر" اس نے غصے سے کہا۔ "گولی مارو کوٹھی کو۔ میری بیویاں پاک دامن ہوں گی۔ خبردار جو میری بیویوں کا مقابلہ ڈھوروں سے کیا۔ وہ کتی تو چاؤں چاؤں کرتے ہوئے میرا مغز خراب کر دیتی ہے۔ میں تو اپنی بیویوں پر کسی کی نظر بھی نہ پڑنے دوں گا۔" اس نے سینے پر ہاتھ رکھا۔ "مسلمان ہوں میں، پردہ کراؤں گا۔"

"لیکن شکورے،" میں نے کہا۔ "گاؤں کی سب عورتیں مسلمان ہیں۔ ان میں سے تو کوئی پردہ نہیں کرتی۔"

"کبھی دیکھا ہے کسی ملکانی کو؟" شکورے نے ملکانی کے لفظ پر زور دے کر کہا۔ "جیپ میں بھی برقع پہن کر بیٹھتی ہیں۔"

"پر شکورے،" میں نے کہا، "میم تو برقعے کی عادی نہیں ہوتی۔ وہ تو برقع میں گھٹ جائے گی۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں گھومتی پھرے گی۔"

"ٹانگیں نہ توڑ دوں گا اس کی،" شکورے نے غصے سے کہا۔ "نکلے تو حویلی سے باہر۔"

"اور چوتھی؟" میں نے کہا۔ شکورا کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا، پھر بتی کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"کالی ہو گی۔" اس نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے دائیں بائیں دیکھا۔

"کالی؟" میں نے تیزی سے کہا۔

"ہاں کالی؟" شکورے نے بھی تیزی سے کہا۔ "وہ جو استاد خادم توتڑی (مرتالی) والا"

"کون، استاد خادم حسین؟" میں نے کہا۔

"ہاں۔۔ وہی،" شکورے نے سر پھر اوپر نیچے ہلایا۔ "استاد توتڑی والے نے لیلیٰ مجنوں کا قصہ سنایا تھا۔"

"شکورے،" میں نے ٹوکا۔ "لیلا نہیں لیلیٰ۔ لیل تو رات کو کہتے ہیں۔"

"ہاں۔۔۔ اور۔۔۔ معشوق بھی رات ہی ہوتی ہے۔"

شکورے کی اس بات پر میں ہنسی روک نہ پایا۔ خلاف توقع شکورا بھی ہنسنے لگا۔

Scanned with CamScanner

"ماسٹر جی نے بتایا تھا،" شورے نے ہنستے ہوئے کہا۔ "لیلیٰ کالی تھی اور مجنوں مرتا تھا۔ یہ وہ حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا تھا۔ استاد نے کہا تھا کہ مجنوں سارے غم میں ہوتے ہوئے بھی [illegible] کالی کا اپنا روپ ہوتا ہے جی تو۔"

"شورے میں نے یہ تو نہیں کہا کہ کالی لڑکیاں خوبصورت نہیں ہوتی ہیں۔ ابھی سے دو دن پہلے میں نے ایک دبلی پتلی کالی لڑکی کو دیکھا تھا۔ وہ اتنی خوبصورت تھی کہ اس کے چہرے پر نظریں ٹھہر نہیں تھیں۔"

"تب میں اسی سے شادی کروں گا۔" شورے نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ "میں تجھے مراد دوں گا، تو ڈھونڈ کر اس کے باپ سے میرے لیے رشتہ مانگنا۔"

"لیکن شورے مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ وہ کہاں رہتی ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے تو اسے نئے بازار میں دیکھا تھا جہاں بڑی بڑی کاروں پر لڑکیاں آ کر خریداری کرتی ہیں۔"

"دفع کر،" شورے نے فوراً کہا۔ "بازار میں پھرنے والی سے میں شادی نہیں کروں گا۔ ہوں گی نہیں، بس جنگ سے پنڈی گھیب تک کسی نہ کسی گاؤں میں مجھے کالی لڑکی مل ہی جائے گی۔ کالی سے شادی تو میں ضرور کروں گا [illegible] گوریوں سے جب تنگ آ جاؤں گا، سانولی سے بھی [illegible] اور [illegible] ہو جاؤں گا تو بیاہ کروں گا۔ ایک بیوی تو کالی ہونی چاہیے، کالی کا اپنا روپ ہوتا ہے۔"

شورا تھوڑی دیر کے لیے رکا، لیکن اس کے دل میں جو طوفان اٹھ چکا تھا اس کو روکنا اب اس کے بس میں بھی نہ تھا۔

"میں ہر بیوی کے پاس ایک ایک ہفتے رہا کروں گا۔" شورے کے چہرے پر جوش سا تھا۔ "جب ایک کا بچن ([illegible]) ہو جائے گی تو تین بیویوں کے پاس دس دس دن رہوں گا، جب دو کا بچن ہو جائیں گی تو دو کے پاس پندرہ پندرہ دن رہوں گا، اور جب تین کا بچن ہو جائیں گی تو چوتھی کے پاس پورا مہینہ رہوں گا۔ مولوی جی نے ایک بار جمعے کا خطبہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ اسی لیے اسلام نے چار شادیوں کی اجازت دی ہے۔"

"اگر چاروں ایک ساتھ ہو گئیں تو؟" میں نے پوچھا۔ شورے نے سوچتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا۔

Scanned with CamScanner

"راولپنڈی میں رہ رہا ہوں اور پڑھ بھی رہا ہوں" شکورے نے مجھے بتایا۔

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے شکورے" میں نے کہا۔ "یعنی تو بہت دانش مند ہو گیا ہے۔"

شکورے نے جوتے کے پائیدان کی طرف دیکھا آسمان کی طرف دیکھا اور پھر دوسری طرف منہ کر کے تھوڑا سا آگے جھکا۔

"او بیوقوف مرد وہ سب منافق ہوتی ہے" شکورے نے مجھے گھور کر میری طرف دیکھا۔ "مولوی جی نے ایک جمعے کے خطبے میں بتایا تھا کہ منافقوں سے بچو۔ یہ دنیا مردوں کے لیے بنائی ہے۔ مرد قوی اور مضبوط رہیں گے تو دین کی حفاظت کریں گے۔ عورتوں کا کیا ہے وہ تو مردوں کی کھیتیاں ہیں۔ جتنی زیادہ کھیتیاں ہوں گی اتنا ہی اناج ملے گا۔ ان کی بات تیری سمجھ میں نہیں آئے گی بیوقوف۔ میں مرد ہوں۔ تیری طرح کھسرا (ہیجڑا) نہیں ہوں کہ ساری جوانی گزار کے اب تک بیوی کے بغیر بیٹھا رہوں۔"

شکورا مجھے بے عزت کرنا شاید اپنا حق سمجھتا تھا اور میں بھی اس کے اس حق کو لاشعوری طور پر تسلیم کرتا تھا۔ مجھے کوئی توہین محسوس نہ ہوئی۔ مجھے اس کی کسی بات پر غصہ آتا ہی نہیں تھا شاید اس لیے کہ مجھے اس کی ذہنی حالت کا اندازہ تھا۔

"وہ جو ہیں اپنے پیر مرشد" شکورے نے کہا۔ "سات بیویاں تھیں ان کی۔ پھر بھی دربار میں آنے والی جوان لڑکیوں کے چہرے غور سے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی پسند آ گئی تو فوراً نکاح کر لیں گے۔ وہ مرد ہیں۔ میں بھی مرد ہوں۔ تو بس ایک ہی عورت کے ساتھ ہی بیٹھ رہے!"

"تو نے بھی تو شیداں کے ساتھ دس برس گزارے تھے" میں نے کہا۔ "جیتی ہوتی تو اب بھی تو اسی کے ساتھ ہوتا۔"

شکورے کے پورے بدن نے جھٹکا کھایا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر ایک دم سے سنجیدگی سی ظاہر ہوئی۔

"شیداں کی بات اور تھی" اس نے آہستہ سے کہا۔ "پھر ایسی بات نہیں مردوں کا معاملہ ہے۔ رب مجھے جانے (بخش بھی) تو لمبی زندگی سے ناراض ہو گیا ہے؟"

Scanned with CamScanner

"نہیں شکورے،" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "تجھ سے کیسے ناراض ہوسکتا ہوں؟ اچھا چھوڑ اس بات کو۔ یہ بتا کہ کارخانہ بھی لگ گیا، بیویاں بھی آ گئیں، ان کے لیے حویلیاں بھی بن گئیں، جیپیں بھی آ گئیں۔ پھر کیا کرے گا تو؟"

شکورے کے چہرے پر پھر سے شگفتگی سی آئی، پھر کھچاؤ سا نمودار ہوا۔

"کیا تو سچ کہتا ہے کہ کسی کا خون زہریلا نہیں ہوتا؟" اس نے تذبذب میں کہا۔

"میرا یقین کر شکورے،" میں نے کہا۔ "کسی کا خون زہریلا نہیں ہوتا۔"

"میرے بچے ہوں گے؟" اس نے پوچھا۔

"ضرور ہوں گے،" میں نے جواب دیا۔

"بس، میں اپنے بچوں کو بڑے بڑے سکولوں میں پڑھاؤں گا، جہاں مسٹر محمد حال جیسے لکچر (لیکچرر) نہیں ہوں گے۔ میں اپنے بچوں کو امریکہ بھیج دوں گا۔ وہ وہاں پر سکلیبیں بنائیں گے... ابھی تک آئی کیوں نہیں؟"

"شکورے، اپنے وقت پر ہی گرے گی سکائی لیب،" میں نے کہا۔ "تو یہ بتا کہ تیری اور تمنا کیا ہے؟"

"میرے کھانے میں دال تو بالکل نہیں ہوگی" شکورے نے ناک سکوڑا۔

مجھے ہنسی آ گئی۔ شکورا ابھی ہمارے شیر علی کے ہوٹل پر دوپہر کے وقت سبزی اور رات کو ہمیشہ ماش کی دال پکتی تھی۔ گوشت وہ کبھی کبھی ہی پکاتا تھا۔ جس دن گوشت پکتا تھا، شکورا اس دن بھی دال ہی کھاتا تھا۔ وہ اپنی ساری بچت دکو پھر کی کو دے آتا تھا۔

"گوشت کھانے سے تو بیماریاں لگ جاتی ہیں،" میں نے کہا، "دل کی بیماریاں۔"

"تو بیوقوف ہے،" شکورے نے کہا۔ "گوشت کھایا کر۔ تبھی تیری شادی دیر سے ہوئی ہے۔ گوشت کھایا کر گوشت۔ میرے کھانے میں تو ہر روز آلو گوشت ہوا کرے گا جسے میں نمبو (لیموں) نچوڑ کر کھایا کروں گا گرم روٹیوں کے ساتھ۔"

میں نے ماچس جلا کر ادھر ادھر دیکھا۔ چاند ہمارے سروں سے گزر کر مغرب کی سمت جا چکا تھا۔

''شکورے، آلو گوشت تو ہر کوئی کھاتا ہے،'' میں نے کہا۔ ''کروڑ پتی لوگ تو ہوٹلوں میں جاتے ہیں۔ ان کی بڑی بڑی میزوں پر بھنے ہوئے مرغے، بریانیاں، چینی اور یورپی کھانے اور کئی قسم کے پکوان ہوتے ہیں۔ ان کی میزوں پر بھنے ہوئے پورے دنبے پڑے ہوتے ہیں۔''

''میں سب چیزیں کھاؤں گا،'' شکورے نے منہ میں آیا ہوا لعاب نگلا۔ ''ایک شے بھی نہ چھوڑوں گا۔ پورا دنبہ تو نہیں، ایک دو سیر تو کھا ہی جاؤں گا۔''

''تیرا پیٹ خراب ہو جائے گا،'' میں نے کہا اور شکورے کو غصہ آ گیا۔

''تو تو یہی چاہتا ہے کہ میں دال کے ساتھ سوکھی ٹھنڈی روٹیاں کھاتا رہوں،'' شکورے نے تنک کے کہا۔ ''کروڑ پتی بن کر میں کیوں نہ اچھے اچھے کھانے کھاؤں۔ بول، کیوں نہ کھاؤں؟''

''میں نے یہ نہیں کہا کہ تو نہ کھا،'' میں نے کہا۔ ''میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ کھانا ہمیشہ اتنا ہی کھانا چاہیے جس سے پیٹ خراب نہ ہو۔ تھوڑا کھانا صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوگا،'' شکورے نے کہا۔ ''میں تو تین سیر گوشت بھی کھا جاؤں گا۔ تیری طرح چڑا نہیں ہوں میں!''

''تیری اور خوراک کیا ہوگی؟'' میں نے پوچھا۔

''میری حویلی میں بھینس ہوگی،'' شکورے کے لہجے میں کچھ شگفتگی آ گئی۔ ''ہر صبح میں رات کی باسی روٹی کے ساتھ ونی (مکھن) کا پیڑا کھاؤں گا اور لسی کا پیالہ پیوں گا۔ کبھی کبھی انڈے پراٹھے کا ناشتہ چائے کے ساتھ بھی کیا کروں گا — نہیں، چائے کے ساتھ نہیں۔ دودھ پتی کے ساتھ۔''

''اور کچھ؟'' میں نے پوچھا۔

''دودھی کا حلوہ،[23] گاجر کا حلوہ، گڑ کے میٹھے چاول، کھیر، گری (ناریل) والا زردہ، برفی، جلیبیاں، ساری مٹھائیاں، ہر روز ایک تربوز، چار خربوزے، دو سیر آم، سیب، انگور، لوچے، آلو بخارے، خرمانیاں (خوبانیاں)، کھجوریں، انار، انجیریں، بادام، پستے — سارے پھل کھاؤں گا۔''

---

[23] شمالی پنجاب کا دودھ اور سوجی سے بنا ہوا حلوہ۔

Scanned with CamScanner

"شکورے تم بہت دکھی رہے ہو گے۔" میں نے کہا۔ "ٹھیک ہو گیا ہوں میں تیرے"

"میں حکیم صد بخش سے تے کا چورن[24] لوں گا۔" شکورے نے کہا۔ "جیسے ہی میرے پاس ... دہی پر سفید زیرہ ڈال کر کھاؤں گا[25]۔"

چاندنی اب جوہڑ کے مشرقی کنارے کی سمت پانی میں جھلملا رہی تھی۔ مغرب کی جانب پہاڑی کے نیچے جوہڑ کا کنارہ نیم تاریکی میں صرف اپنے دھبے دھبے نقوش کی طرح ابھر رہا تھا۔ ہوا کے جھونکوں سے سیدان کی جھاڑیوں میں سرسراہٹ کبھی کم اور کبھی زیادہ ہو جاتی تھی۔

"اور بھی تو کچھ تیری خواہشیں ہوں گی؟" میں نے پوچھا اور شکورے کے چہرے پر ایک شدید ... نمودار ہوا۔ چاندنی میں اس کے چہرے پر سب سے نمایاں اس کی مڑی ناک تھی جس کے اوپر اس کی پیشانی پر شکنیں سی ابھریں۔ اس کی دہشت زدہ آنکھوں میں غصہ نمودار ہوا۔

"ملک یار محمد کی تو میں شکل بھی نہیں دیکھوں گا۔" شکورے نے غصے سے کہا۔ "مثلاً وہ اپنی حویلی میں گھسنے نہ دوں گا، کسی بھی حویلی میں۔ اپنی بیویوں کو اس سے دور رکھوں گا۔ ملک یار محمد کو تو میں گرفتار کروا دوں گا۔ فتح جنگ سے پنڈی گھیب تک ہر گاؤں میں اس کے آدمی شراب پیتے اور جوا کھیلتے ہیں۔ جب وہ تھانے میں بند ہو گا اور حکانی اسے ملنے آئے گی تو میں تھانیدار سے کہوں گا کہ بیٹ کھولے۔" شکورے کا غصہ تیز ہو رہا تھا۔ آنکھیں پوری کھل رہی تھیں۔

"ماسٹر محمد جان کو اب کچھ تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ زندہ ہے کہ مر گیا ہے؟"

---

[24] حب مرداں (مرتل) کا جوہڑ اور جنگل سے ... کا اوپر سے ڈھیلا سا کاٹ لیتے ہیں۔ اور اس کے ... کو نمک اور اجوائن بھر دیتے ہیں اور دھوپ میں رکھ دیتے ہیں۔ چھ سات دن بعد ... اوپر اٹھ جاتا ہے ... پھول جاتی ہے۔ اجوائن اور نمک نکال کر اسے خشک کرنے کے بعد پیس لیتے ہیں۔ اسے مقامی لوگ تے کا چورن کہتے ہیں۔ یہ ... ہاضمے کے لیے اکسیر سمجھا جاتا ہے۔

[25] یہ بھی ایک ... نسخہ ہے۔ ... کے چھلکے ... پیاز میں ... ڈال کر ... میں ... ہیں۔ ایک چمچ نمک اور چٹکی بھر کالی مرچ اور ایک چمچ سفید زیرہ ملا کر کھانے کے بعد چمچ سے کھا لیتے ہیں۔ ... سفید ... والا ... چند گھنٹوں ہی میں معدے کی تیزابیت ختم کر دیتا ہے۔ جیسے کی ... مسلسل ... بے قاعدگی سے ... کی شکایت ہو جاتا ہے۔

یہ میں نہیں جانتا،" میں نے کہا، "زندہ بھی ہو تو بہت بوڑھا ہو گا۔"

"بوڑھا ہے تو کیا ہوا؟" شکورے کا غصہ اس کے جسم کی ہر حرکت سے نمایاں تھا۔ "اپنے دونوں ہاتھوں سے دبوچ کر اسے اٹھا کر لاؤں گا۔ بڑی حویلی کے صحن میں لے جا کر اس کے ٹکڑے ماروں گا۔" شکورے نے ڈرامائی انداز میں گھمایا جیسے تلوار سے وہ دونوں کے درمیان میں نہائی پر ضربیں مار رہا تھا۔ میں گھبرا گیا۔ وہ غصے میں اونچی آواز میں بول رہا تھا۔

"اور وہ سالا کانا اسے بھی حویلی میں کریہ تی ٹکڑے ماروں گا اور وہ دولی منظوراں، میں مری کی ہے تو میں حویلی صحن میں میں ہاتھ رسوا (ننگی) کھلا دوں گا۔ پھر اس کے سارے کپڑے اتار کر، جوتی پہنا کر چارپائی پر بٹھا کر اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں گا اور اس وقت تک دیکھتا رہوں گا جب تک اس کا پیٹ نہ ہو جائے۔" شکورے کی آنکھیں غصے سے ابل رہی تھیں۔

"تو بہت خطرناک ہے شکورے!" میں نے کہا، "بدلے میں اتنا ظلم؟"

"بدلہ نہیں تھے یہ؟" شکورا چیخا۔ "میں پیٹ پر ٹکریں مارتا رہا، مدد مدد چیختا رہا اس کی بخشش (سی ٹی) ملانی نے چوکیدار حویلی کا گیٹ ہی نہ کھولے دیا اور وہ سٹہ محمد جان کیا نہیں تھے؟ اس نے میری شیدو ساری جماعت کے سامنے اتاری تھی۔ مجھے مار مار کر میرے جسم پر سوٹیاں ماری تھیں۔ بھول گیا ہے تو؟ میری ماں مر گئی تھی، رات کو سو گیا تھا۔ بچہ تھا میں، ورنہ بتاتا دوں — تو، اور وہ سالا کانا، حرامی میری آنکھ ان کی کمائی کھا گیا۔ اور وہ ان کی منظوراں، زین (بیں) کھا گئی میری شیداں کو۔" شکورے کی آواز روتی ہوئی تھی۔ "چار دن پہلے بتا دیتی تو میں شیداں کو راولپنڈی لے جاتا۔ سترہ سو روپے تھے میرے پاس۔"

آخری جملے پر شکورے کی آواز رندھ گئی۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ چاندنی میں اس کے آنسو چمکتے نظر آئے۔ میری جانب دیکھے بغیر اس نے آستین کو پورے چہرے پر رگڑا۔ مجھے پہلی بار شدت سے احساس ہوا کہ شیداں کی شکورے کی زندگی میں کیا اہمیت تھی۔

"شیداں نہ مرتی،" شکورے نے حسرت بھری آواز میں کہا، "تو آج میرے مقدر پر کتنا خوش

ہوتی۔"

ماحول افسردہ ہو گیا۔ مجھے بڑی غلطی کا پھر احساس ہوا۔

"مجھے شکورے کے اس پاگل پن کا ساتھ نہیں دینا چاہیے تھا۔" میں نے سوچا۔ "غلطی ہو گئی مجھ سے۔ انکار کر دیتا تو کیا تھا؟ دس بارہ گندی گالیاں دیتا، ناراض ہو جاتا اور پھر مان بھی جاتا۔ یہ میں نے کیا کیا!... وہ کس مقدر کی بات کر رہا ہے؟ جو کچھ دیر کے بعد اس کے لیے شدید ذہنی صدمہ لے کر آئے گا؟ جب میں اسے بتاؤں گا کہ سکائی لیب نہیں اور گر گئی ہے تو اس پر کیا گزرے گی؟ شدتِ غم سے وہ کہیں اپنا بچا کھچا ذہنی توازن نہ کھو دے... یہ میں نے کیا کیا!"

مجھ پر مایوسی کی تاریکی چھا گئی۔ پھر اس تاریکی میں ایک کرن سی چمکی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ صدمہ ایسی تلخ حقیقت سے اس کے خوابیدہ ذہن کو بیدار کر دے۔ اس میں شعور پیدا ہو جائے۔ وہ سنبھل جائے۔ ممکن ہے کہ اس صدمے سے اس کا پاگل پن ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور وہ اپنی محرومیوں کے ساتھ جینا سیکھ لے!"

ہوا کے یک تیز جھونکے سے میرے کپڑے پھڑ پھڑائے۔ کولہے کی ہڈیوں سے جڑے عضلات اینٹھے ہوئے تھے، بیرونی جلد بے حس ہو کر اپنا احساس تک کھو چکی تھی۔ میں چٹان سے تھوڑا سا اٹھا، پھر بیٹھ گیا۔ شکورا خاموش تھا۔ چٹان سے تھوڑا سا اٹھنے پر خون کی گردش سے مجھے ناف کے نیچے زندہ جسم کا بھرپور احساس ہوا۔

"انسان کتنا کمزور ہے۔" میری سوچ کا رخ بدلا۔ "کس قدر ناتواں، خواہشوں کا اسیر، محرومی میں حاصل کے خواب دیکھنے والا۔ خواہشوں سے بلند ہونا اور انھیں تیاگ دینا آسان نہیں ہوتا۔ جہاں یہ خواہشیں حاصل کی ہیں وہاں ان کا ایک بھیانک پہلو انتقام بھی ہے۔ ہر منتقم شخص بدلہ لینے میں ظالم تو ہو ہی جاتا ہوگا، لیکن شکورے کے وجود میں وحشیانہ درندگی کا ایک پس منظر بھی ہے — ہولناک پس منظر۔ نہ جانے کتنی بار وہ نمبائی پر جھوٹ مار مار کر نڈھال ہوا ہوگا۔ انتقام کی آگ شاید کہیں بھی کسی انسان میں بھی سرد نہ ہوتی ہوگی۔ شعلوں کی طرح لپک لپک کر دل و دماغ کو جلاتی ہوگی۔ مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس دنیا میں منتقم شخص کے دل و دماغ میں انتقام کا زہر بدلہ لینے کے بعد بھی پھیلا رہتا ہے۔ انتقام لینے کے بعد بھی یہ آگ نہیں بجھتی؛ کبھی راکھ میں دبی چنگاری بن کر

سلگتی رہتی ہے، کبھی دھواں بن کر انتقام لینے والے کے وجود کو ڈھانپ لیتی ہے اور اسے زندگی بھر چین نہیں لینے دیتی۔ شاید یہی تپش، یہی جلن، انتقام لینے والے شخص کی سزا بھی ہے۔"

شکورے کا سر جھکا ہوا تھا۔ وہ بے بسی جس کے ساتھ وہ خیالی انتقام لیتا رہا ہے، اس کے چہرے پر عیاں تھی، لیکن اس کا غصہ کسی خوف میں نہیں بدلا تھا، اس نے غم کا ماتمی لبادہ اوڑھ لیا تھا۔

"ہزاروں خواہشیں ہیں جو محرومی سے جنم لیتی ہیں اور پھر لاحاصل کے جوہڑ میں ڈوب جاتی ہیں" میری سوچ میں جھنجھلاہٹ سی نمودار ہوئی۔ "ذہنی آسودگی، خود رو برساتی پانی کی طرح انتظار کا روپ دھار کر، امید کی دراڑوں میں سے جھرنا بنا کر بہتی رہتی ہے، خوابوں کو بھرتی رہتی ہے اور پھر نارسائی کی تپش سے سوکھ بھی جاتی ہے۔ انسان پیاسے مسافر کی طرح زندگی کے لاحاصل صحرا میں بھٹکتا رہتا ہے، دوڑتا رہتا ہے، اور پھر اس کا وجود ہی مٹ جاتا ہے۔ صحرا میں صرف بار بار معدوم ہونے والے سراب ہی رہ جاتے ہیں، لیکن اس دنیا میں انسانی زندگی تمناؤں سے فریب کھا کر بھی امید کے سہارے رواں رہتی ہے اور اس امید سے تشکیل پانے والے انتظار میں شکورے جیسے ان گنت لوگ خود کو فریب دیتے رہتے ہیں... انتظار خود ایک فریب بن جاتا ہے۔ لاحاصل کا عفریت، تصوراتی غول بیابانی کی طرح چیختا چلاتا، چکروں میں گھومتا، دھول اڑاتا، اپنی وحشت میں رقص کناں رہتا ہے اور اس ہولناک گردش میں پھنسے اجسام سے خراج میں خون نچوڑتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ اور وہ خون اگلنا شروع کر دیتا ہے۔ لہو کے چھینٹے اڑاتا ہے جن میں خود ان کا وجود بھی تحلیل ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں انسانوں کو لاحاصل کے اس عفریت سے کون بچائے گا؟ . کوئی نہیں۔ کوئی غیر مادی اور ماورائی قوت انسانوں کو نجات نہیں دلا سکتی۔ انسانوں کو خود ہی اس خود فریبی سے نجات حاصل کرنا ہوگی۔"

اچانک چٹان کے عقبی حصے کے نیچے چرچر... چک چک... کی آواز ابھری۔ ہوا کے جھونکوں کے باوجود سرسراہٹ سی سنائی دی۔ میری طرح شکورے نے بھی یہ آواز سن لی تھی۔ وہ بھی تیزی سے گھوما۔ میں نے ٹارچ کا بٹن دبایا اور عقبی ٹوٹی پھوٹی چٹانوں کے کنگروں سے نیچے جھانکا۔ بچی خاصی بڑی جسامت کی چھچھوندریں نظر آئیں۔ وہ تعداد میں چار تھیں اور اپنی لمبی تھوتھنیوں سے مٹی کو سونگھتی ہوئی، خشک گھاس کے تنکوں میں سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی آگے پیچھے قطار میں چلی جا رہی

Scanned with CamScanner

تھیں۔

''حرامی چپ چودریں!'' (چمچودریں) شکورے کی ہلکی ہنسی سنائی دی۔

چمچودریں چٹان کی ڈھلوان کا چکر کاٹ کر جوہڑ کی سمت چلی گئیں۔ میری طرح شکورے نے بھی مڑ کر چہرہ جوہڑ کی سمت کر لیا۔ مجھے ایک بار پھر کولہے کے نیچے جوڑ کے حصے کے سن ہونے کا احساس ہوا۔ پتھریلی سطح نے خون کی گردش روک رکھی تھی۔

''یہ رات کی طرف کیا کرنے گئی ہیں؟'' شکورے نے قدرے متعجب لہجے میں کہا۔

''غالباً پیٹ بھرنے گئی ہیں،'' میں نے فوراً جواب دیا۔

شکورے نے چٹان پر پڑی ہاکی اٹھائی۔ ''بک بک نہ کر!'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ایک گاؤں کا تیرے سے پہلے یاد آجائے گی۔'' اس کا لہجہ کچھ خوشگوار ہو گیا۔

''خبر نہیں کب آئیں گی؟'' شکورے نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اب تو سات ... والا ہو گا شکیب۔''

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں بارہ منٹ باقی تھے۔

''ابھی بارہ منٹ رہتے ہیں،'' میں نے کہا۔

مجھ پر غنودگی کی کوئی کیفیت نہ تھی لیکن تھکن کا احساس بوجھل تھا۔ آدھا چاند مغربی افق کی سمت جا چکا تھا اور اپنے رستے کا تعین کر رہا تھا۔ مغربی پہاڑی کی ڈھلوان اب نیم تاریک تھی۔ شکورا پھر خاموش ہو گیا۔

''کیا ستم ظریفی ہے،'' میں نے سوچا، ''دنیا میں ایک طرف تو لوگ محرومی کے الاؤ میں جھلس رہے ہیں اور دوسری جانب اربوں ڈالر خلائی تحقیق پر خرچ کیے جا رہے ہیں۔ ایک طرف اس دنیا میں لوگ بھوک سے بے حال ہیں اور دوسری جانب خلائی سائنسدان کسی ایسے سیارے کو تلاش کر رہے ہیں جہاں کا ماحول زمین جیسا ہو گا۔ آٹھ برس پہلے بنگلہ دیش میں چھوٹے چھوٹے بچے گندی نالیوں سے چاول کے دانے چن چن کر انھیں دھو کر اپنی بھوک مٹاتے۔ ٹی وی اسکرین پر اس اذیت کا مظاہرہ ہوتے رہتے تھے۔ افریقہ میں آج بھی ڈھانچہ نما بچے، کیڑوں سے بھرے جسموں کے ساتھ، زمین پر انسانیت کے چہرے کا کلنک بنے ہوئے ہیں۔ اور خلائی سائنسدان خلا میں کسی نئی زمین کو تلاش کر

رہے ہیں، جہاں خشکی کے ساتھ سمندر بھی ہوں گے، جہاں قطبین پر برف جمی ہوئی، جہاں کہسار ہوں گے جھرنے گرتے ہوں گے، ندیاں رواں ہوں گی، جھیلیں ہوں گی، میدان ہوں گے، سمندروں کے قریب ساحلی پٹیاں ہوں گی، جہاں جھیلوں سے نکلتے ہوئے دریا میدانوں کو سیراب کرتے ہوں گے۔ جزیروں میں، ساحلی علاقوں میں، میدانوں میں، کوہساروں پر، ہر سمت ہریالی ہوگی، جہاں جنگل بھی ہوں گے صحرا بھی، جہاں نباتات ہوگا، سبزیاں ہوں گی، پھل ہوں گے، زندگی کا بھرپور اظہار ہوگا ویسی زمین۔۔ جب اس زمین پر ہونے والی ایٹمی جنگوں کے بعد زندگی ناپید ہونا شروع ہو جائے گی تو وہ اپنی اپنی قوم کے سرکردہ افراد اور دنیا بھر کے اہل ثروت لوگوں کو ان کے مال و متاع کے ساتھ دریافت شدہ سیارے میں لے جائیں گے۔ دنیا بھر کے دولت مند اپنے بچے خاندانوں کے ساتھ نئی زمین پر نئی دنیا بسانے چلے جائیں گے۔ لیکن نقل سیارگی کرتے ہوئے وہ اس زمین پر، جلتی سلگتی خاکستر زدہ زمین پر اربوں انسانوں کو سسک سسک کر مرتا چھوڑ جائیں گے۔ کیا یہ خود غرضی کی بدترین مثال نہ ہوگی؟“

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں آٹھ منٹ باقی تھے۔ شکورے کا اضطراب بہت زیادہ ہو چکا تھا۔ اس کی ایک ایک حرکت اس کی اندرونی ہیجانی کیفیت کی غماز تھی۔ وہ بار بار آسمان کی سمت نظریں دوڑا رہا تھا۔

”دنیا بھر میں جتنی دولت خلائی تحقیق کے پروگراموں پر خرچ کی جا رہی ہے، اس سے کروڑوں انسانوں کو سال بھر کے لیے دو روٹیاں روزانہ فراہم کی جا سکتی ہیں، زراعت کو فروغ دیا جا سکتا ہے، اسی زمین پر انسانوں کو جینے کے لیے بہترین ماحول دیا جا سکتا ہے، صحت عامہ کی سہولتیں فراہم کی جا سکتی ہیں، فرسودہ عقائد کو ختم کرتے ہوئے علم کی روشنی پھیلائی جا سکتی ہے، اس علم کی روشنی جو اس دنیا میں موجود لوگوں کی نسل اور قومیت کے امتیاز کے بغیر تمام لوگوں کی فلاح کے لیے ہو، شعور کو فروغ دے کر، خوف اور خود غرضی کے ستون گرا کر، انسانوں میں عزت نفس کو فروغ دیتے ہوئے، اسی دنیا کو تصوراتی نئی زمین اور جنت بنایا جا سکتا ہے۔“

شکورا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بہت بے چین تھا۔ بار بار چٹان پر ایک ہی جگہ گھوم گھوم کر آسمان کو دیکھ رہا تھا۔ گھڑی پر چار بجنے میں سات منٹ باقی تھے۔

"کیا مستقبل میں بھی صرف امیروں ہی کو جینے کا حق ملے گا؟ شاید آج کی دنیا کے اہل اقتدار، روحانیت، اس ادراک سے قطعی طور پر محروم ہیں کہ اس دنیا سے نقل سیارگی کرنے کے بعد جس نئی زمین پر بھی جائیں گے، ہوس کا عفریت ان کے ساتھ جائے گا۔ وہ خاکستر میں تبدیل ہوتی ہوئی اس زمین سے چلے تو جائیں گے لیکن کروڑوں، اربوں انسانوں کو تڑپ تڑپ کر مرتا چھوڑ جائیں گے۔ وہ انسانی ہمدردی اور رحم کے تمام تر جذبات سے محروم ہو کر ہی جائیں گے۔ پھر وقت گزرے گا، ان کی تعداد میں اضافہ ہوگا، نئی زمین پر سال گزریں گے، صدیاں گزریں گی، قومیت کی بنیاد پر ان کے قبیلے بنیں گے۔ نئی زمین پر جغرافیائی حدود نمودار ہوں گی، ملک قائم ہوں گے، حکومتیں بنیں گی... پھر ان کے معاشروں میں ہوس کا عفریت طبقات قائم کرے گا، آقا اور غلام کی روایت دوبارہ اپنی جڑ کو مضبوطی سے پکڑے گی۔ پھر نئی زمین پر مذاہب، علاقائی تقسیم اور وسائل کے لیے جنگیں شروع ہو جائیں گی، دریافت شدہ سیارے پر خون بہے گا، بھیانک ہتھیار بنیں گے اور بہیمانہ سیاست کے چھلاوے، قوت شر کے اشاروں پر ناچتے ہوئے وہاں بھی انسانی زندگی کو عذاب بنا دیں گے۔ اور پھر وہاں کے سائنسدان ایک بار پھر کائنات میں کسی نئے سیارے کی تلاش شروع کر دیں گے جہاں امن و آشتی ہو تا کہ دریافت شدہ سیارے سے، نئی زمین سے سرکردہ افراد اور اہل ثروت کو کسی اور نئی زمین پر لے جا سکیں... یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا!"

میں نے گھڑی دیکھی۔ چار بجنے میں پانچ منٹ رہتے تھے۔

"اس دنیا کو اگر ہوس کی آلودگی سے نجات مل جائے، انسانوں کے لیے بہترین جینے کا ماحول فراہم ہو جائے تو میں ابھی سے ہر قسم کی خلائی تحقیق کی زبردست حمایت کروں گا۔ اس دنیا کو تصوراتی جنت بنا کر اگر کسی نئے سیارے کی تلاش کی جائے گی تو وہ بہت مثبت اور خوش آئند اقدام ہوگا تا کہ انسانی مساوات اور کسی قسم کے بھی قومی اور نسلی امتیاز کے بغیر اس دنیا کی بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر، یہاں کے انسانوں کو نقل سیارگی کرائی جا سکے۔ ایسی صورت میں کسی نئے سیارے میں جانے والے آبادکار ہوس سے آلودہ نہیں ہوں گے۔ وہ انسانی ہمدردی اور انسانی اقدار کو ساتھ لے کر جائیں گے۔"

شکور پر جنون سا طاری تھا۔ ہیجانی کیفیت اپنے عروج پر پہنچی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ

Scanned with CamScanner

مسلسل آسماں کی طرف سر اٹھائے سکائی لیب کو تلاش کر رہا تھا۔ اس کے پاؤں مسلسل گھوم رہے تھے۔ میری کلائی پر بندھی گھڑی نے مجھے بتایا کہ چار بجنے میں دو منٹ باقی ہیں۔ شکورا مجسم انتظار تھا، آسمان کی سمت منہ اٹھائے چکر کھاتا انتظار...

"دنیا میں قوت شر نے ضمیر اور شعور کا راستہ روک رکھا ہے۔ مفادات، تاریک مفادات، انسانی شعور کو تاریکی میں روپوش کر رہے ہیں۔ ہر آتا ہوا لمحہ جاتے ہوئے لمحے کے ساتھ انسانی ذہنوں پر ہوس کی تاریکی کو تہہ پہ تہہ جماتا چلا جا رہا ہے۔ دنیا میں انسانی زندگی تصوراتی جہنم رسیدگی سے بھی بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ ایسے میں کوئی تصوراتی جنت کیا محض ایک فریب نہیں ہے؟"

"اب تو آ گئی ہوں گی خبریں؟" شکورے کی آواز میں اس کی داخلی ہیجانی کیفیت تھرتھرا رہی تھی۔ گھڑی کے بغیر بھی اس کی وقت کا تعین کرنے کی صلاحیت پر مجھے حیرت ہوئی۔ میں نے ٹرانزسٹر ریڈیو آن کیا۔ واشنگٹن ڈی سی سے خبروں کی ہیڈ لائنز میں پہلی خبر سکائی لیب ہی کی تھی۔ ایک چھوٹی سی خبر، جو اپنے ساتھ طوفان لانے والی تھی۔ نیوز کاسٹر نے بتایا کہ سکائی لیب بحر ہند میں گر گئی ہے اور اس کا تیرتا ہوا ملبہ تلاش کرنے کے لیے امریکہ کا بحری جہاز قریبی بندرگاہ سے روانہ ہو گیا ہے۔ میں نے ریڈیو بند کر دیا۔

"کیا خبر ہے؟" شکورا چیخا۔ "ریڈیو کیوں بند کر دیا ہے؟"

میرے لیے وہ لمحات انتہائی کٹھن تھے، پھر بھی میں نے شکورے کو سب کچھ سچ سچ بتانے کا فیصلہ کیا۔

"شکورے، خبر اچھی نہیں ہے۔" میں نے آہستہ سے کہا۔

"کیا؟" اس کا منہ آنکھوں کی طرح کھل گیا۔ "نہیں!... نہیں!"

"سکائی لیب سمندر میں گر گئی ہے شکورے۔" میں نے بے دردی سے کہا۔

"تو جھوٹ بول رہا ہے!" شکورا پھر چیخا۔ "ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟... نہیں ہو سکتا! تو جھوٹ بول رہا ہے!"

"نہیں شکورے۔" میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ "میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں۔ امریکی ریڈیو اسٹیشن سے امریکی خبریں سنانے والے نے بتایا ہے کہ سکائی لیب سمندر میں گر گئی ہے اور

Scanned with CamScanner

امریکہ کا سمندری جہاز اسے لینے چل پڑا ہے۔"

شکورے پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس کے پورے وجود پر تاریک، بھیانک اور بوجھل غم کا احساس پوری شدت سے اتر چکا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا، دونوں بازو آسمان کی طرف اٹھ گئے۔

"ہائے نی کوڑیے تقدیرے، چنڈی میں ..." شکورے نے تقدیر کو اسی انداز میں گالی دی، جس کربناکی سے اس نے شیداں کی موت پر دی تھی۔ وہ گالیاں دیتے ہوئے گھوم گیا۔ اب اس کی پشت جنوب سمت تھی۔ وہ آگے کی سمت جھکا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ چٹان پر منہ کے بل گر جائے گا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ اسے پکڑ بھی نہ پایا تھا کہ وہ گھٹنوں کے بل چٹان پر گرا۔ میں نے اسے کندھے سے پکڑ لیا۔

"ہائے او ..." کہہ کر پیچھے کی سمت گرا۔ میں نے اس کا کندھا مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا ورنہ اس کا سر چٹان سے ٹکراتا اور وہ لڑھک کر جوہڑ کے کنارے کیچڑ میں جا گرتا۔

"شکورے!" میں نے اونچی آواز میں کہا۔ "ہوش کر شکورے!"

شکورے نے اپنا دایاں بازو زور سے گھمایا۔ اس کا ہاتھ تیزی سے میرے چہرے کے قریب سے گزرا۔

"ہائے او ـــ مر گئی تیں" (ہائے، مر گیا ہے!) اس نے سر کو دائیں بائیں جھٹکے دیے۔

"شکورے!" میں چیخا۔ "ہوش میں آ شکورے! حوصلہ کر، کوئی راہ نکالیں گے... گزری تھی گزر گئی، شکورے!"

شکورے کا سر دائیں بائیں جھٹکے کھا رہا تھا۔ پھر اس نے دایاں بازو بلند کیا۔

"ہائے وے مرادا، یا مر جا، چنڈی میں ..." اس نے پیر مراد شاہ کو گالی دی۔ پھر اس کی سماعت ہی ختم ہو گئی۔ وہ میری کوئی بات نہیں سن رہا تھا۔ میں بار بار اس کے کندھے کو جھنجوڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس کا دایاں کندھا چٹان پر تھا۔ اس کا سر بھی دائیں جانب ڈھلک گیا۔ میں نے اس کا بایاں کندھا چھوڑ کر اسے چٹان پر لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ میں نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ دل کی دھڑکن بہت تیز تھی۔

"شکورے!" میں پھر چیخا۔ "شکورے!"

مجھ پر سخت تاریکی اور شدید خوف کی حالت میں شکورے کو وہیں چھوڑ کر ڈھلوان سے پھسل جانے والے پتھروں کی آوازوں کے پیچھے دوڑ کر نیچے اترا۔ سیدھا ندی کی سمت گیا۔ میں نے اپنے کرتے کا دامن جوہڑ کے پانی میں بھگویا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے فل بوٹ کنارے کی کیچڑ میں دھنس گئے۔ دوبارہ چٹان پر چڑھتے ہوئے میں پھسلا، سنبھلا اور چٹان پر چڑھ کر میں نے کرتے کے دامن میں جذب پانی کو ہتھیلی پر نچوڑا، اور زور سے شکورے کے منہ پر چھینٹا دیا۔ شکورے نے جھرجھری سی لی۔ میں نے اپنے کرتے کے دامن سے اس کا چہرہ پونچھ دیا۔

''شکورے!'' میں نے زور سے آواز دی۔ شاید میری آواز پہاڑی کی دوسری جانب اسٹاف کوارٹروں تک گئی ہوگی۔

''ہاں... اوں...'' شکورے نے نحیف سی آواز میں کہا۔

''شکورے، اٹھ!'' میں نے کہا۔

''کیا ہے؟'' شکورے کی آواز بہت دھیمی تھی۔ میں نے سہارا دے کر اسے چٹان پر بٹھا دیا۔ ٹرانزسٹر ریڈیو گلے میں لٹکایا۔ باقی کو توڑن کے ساتھ چادر میں باندھا۔

''اٹھ شکورے!'' میں نے کہا، ''چل میرے ساتھ۔''

''کہاں؟'' اس نے کمزور سی آواز میں پوچھا۔

''گھر... گھر چل شکورے!''

میں نے باقی بندھی چادر کو بائیں ہاتھ میں گٹھڑی کی طرح اٹھایا، بائیں بازو سے اس کی کمر کے گرد حلقہ بنایا اور اسے چٹان پر کھڑا کر دیا۔

''شکورے... چل گھر چل،'' میں نے آہستہ سے کہا۔

پھٹی پھٹی سی بند آنکھیں تھوڑی سی کھولیں، دو لکیروں کی طرح۔ شکورے کا بدن بڑا بے جان سا تھا۔ کندھے آگے کی سمت جھکے ہوئے تھے۔ میں نے اس کے دائیں بازو کو اپنی گردن کے گرد حمائل کیا اور ٹارچ والے ہاتھ سے اس کا ادھ ہاتھ پکڑ لیا۔ صبح کی دھندلی سی روشنی پھیل رہی تھی۔ پھر بھی میں نے ٹارچ کو مستقل طور پر جلا دیا۔ ہوا کے جھونکے مدھم ہو رہے تھے۔

''چل شکورے... شاباش... ہمت کر!''

میرے اس جملے پر شکورے نے قدم اٹھایا۔ وہ نڈھال سا تھا۔ تقریباً لٹا کر میں نے اسے ڈھلوان سے نیچے اتارا، اور راستے پر آتے ہی شکورا کچھ سنبھل گیا۔ ہم آہستہ آہستہ پکی سڑک کی طرف چلنے لگے۔

تارکول کی پکی سڑک سے پہلے دائیں جانب جھاڑی میں سرسراہٹ ہوئی۔ میں نے فوراً انگلیاں گھما کر ٹارچ کی روشنی جھاڑی پر ڈالی۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ کوبرا تھا بھی تو روشنی اور ہمارے قدموں کی آہٹ سے ڈر کر جھاڑی میں چھپ گیا تھا۔ نہایت احتیاط سے میں شکورے کو تارکول کی سڑک پر لے آیا۔ سڑک پر آتے ہی شکورے نے اپنا بازو میری گردن سے ہٹا لیا۔ میں نے بھی اس کی کمر کو چھوڑ دیا۔ وہ آہستہ آہستہ میرے ساتھ چلنے لگا۔

"کتھایوں گدی ویناایں؟" (کہاں لیے جا رہے ہو؟) شکورے نے کہا۔

"گھر لے جا رہا ہوں،" میں نے کہا۔

"گھر..." اس نے آہستہ سے کہا، جیسے خود سے ہی کہہ رہا ہو۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے شکورے کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ اسے کچھ پتا نہ تھا کہ وہ کہاں ہے، کیوں ہے۔ ورکرز کلب کے پاس دائیں جانب لوہے کے جنگلے کے پاس دو کتے بیٹھے تھے۔ وہ بھونکتے ہوئے ہماری سمت دوڑے۔ میں تیزی سے نیچے جھکا جیسے پتھر اٹھا رہا ہوں۔ کتے تیزی سے واپس مڑے، بھاگے۔ پیدائش کے بعد ہی سے انھوں نے دیہاتیوں کے ہاتھوں اتنے پتھر کھائے ہوئے تھے کہ پتھر کا خوف ان کی ثانوی جبلت بن چکا تھا۔ کچھ دور جا کر وہ پھر مڑے اور کھڑے ہو کر بھونکنا شروع کر دیا۔ ایک کتا غصے میں پچھلے پیروں سے مٹی اڑانے لگا۔ شکورا تیزی سے مڑا۔ کتوں کی طرف منہ کر کے وہ تھوڑا سا جھکا، پھر اس نے دونوں بازو آگے بڑھائے۔

"بھؤ ۔ واؤ بھاؤں بھؤں خواو أو بھؤں" شکورے نے کتے کی طرح بھونکنا شروع کر دیا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ وہ سیدھا ہو کر پھر میرے ساتھ چلنے لگا۔

کتے ہمارے پیچھے سڑک پر آ گئے۔ وہ بھونک رہے تھے۔ شکورے نے سر گھما کر انھیں دیکھا۔ "خواؤ واں .. بھاؤں" شکورا پھر کتے کی طرح بھونکا۔ میں نے اسے پھر کھینچا، اور وہ سیدھا سڑک پر چلنے لگا۔

Scanned with CamScanner

آسمان مدھم سا روشن ہو چکا تھا۔ مشرقی افق پر بادلوں کے دو تین سفید ٹکڑے نظر آئے۔ ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکے مجھے چہرے پر خنکی کا تاثر دیتے بہت اچھے لگے۔ افق پر بکھرے بادلوں کے درمیان گہری دھندلی تھی اور اس کے نیچے آسمان پر نیلاہٹ نظر آ رہی تھی۔ ہم اسپتال کے آہنی جنگلے کے پاس پہنچ چکے تھے۔ شکورا رک گیا۔ اس کی نگاہیں افق کی سمت تھیں۔

"آسمان کے پیٹ میں بچہ پھر مر گیا ہے،" شکورے کی سرگوشی نما آواز میں خوف تھا۔

پرائمری سکول کی دیوار کے پاس ایک مریل سی کتیا سمٹی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھ کر بھی وہ دم ہلانے لگی۔ بازار کا احاطہ خاموش تھا۔ راولپنڈی جانے والی ایک بس کھڑی تھی۔ شیر علی کے ہوٹل کے سامنے چارپائیوں پر سوئے مسافروں کے قریب سے گزر کر ہم عقبی گلی میں پہنچے۔ شکورے کے گھر کی گارے بھوسا لپی دیواریں بنیادوں پر نیم روشن تھیں۔ گھر کے پیچھے کھیتوں میں اگے چھوٹے چھوٹے پیڑوں سے پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دور کسی کوٹھے سے مرغے کے بولنے کی آواز بھی آ رہی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے کی کنڈی میں تالا لٹکا ہوا تھا۔

"چابی دے شکورے،" میں نے کہا، اور شکورے نے بغلی جیب سے چابی نکال دی۔

تالا کھول کر میں نے دروازے کا پٹ کھولا۔ صحن میں چارپائی پر چادر اور تکیہ موجود تھا۔ میں نے گٹھڑی نما چادر ہانڈی سمیت گارے کی لپی دیوار کے پاس رکھ دی۔ مڑ کر دیکھا تو شکورا باہر ہی کھڑا تھا۔ باہر آ کر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

"تو بہت تھک گیا ہے شکورے،" میں نے کہا۔ "سو جا۔"

میرا جملہ سن کر شکورا بندر کی طرح اچھلا، دوڑ کر گھر میں گھسا اور اندر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔ اور چابی میرے ہاتھ میں تھی اور دروازے کی کنڈی ادھر ادھر جھول رہی تھی۔ میں نے احتیاط سے اندر بچھی چارپائی کا اندازہ لگا کر اس سے کچھ آگے دیوار پر سے چابی تالا اندر پھینک دیا۔

10

جب میں بھائی کے بنگلے پر پہنچا، صبح کے پانچ بج چکے تھے۔ میں نے بیرونی گیٹ کھول کر لان میں لگے نلکے پر اپنے بوٹ دھوئے۔ بوٹوں کے اوپر جو مٹی کی کیچڑ خشک ہو چکی تھی، وہ ہم بوٹوں سے

Scanned with CamScanner

اضطراب میں کمی تک نہ ہوئی تھی۔ بوٹ دھوپ میں سے برآمدے کا دروازہ کھول اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ کھڑکی کے پردوں پر بیرونی روشنی کی دھندلاہٹ تھی۔ کمرے میں روشنی نہ تھی۔ میں نے بلب کا سوئچ آن کیا۔ غسل خانے میں جا کر ہاتھ منہ دھو کر واپس کمرے میں آیا۔ مجھ پر نسیانی کیفیت طاری تھی۔ بستر پر بیٹھ گیا تو پاؤں بھاری تھے۔ میں بوٹ اتارنے بھول گیا تھا۔ کمرے میں گرمی تھی۔ میں نے پنکھا آن کر کے ایک پاؤں سے دوسرے پاؤں کا بوٹ اتارنے کی کوشش کی وہ تو میں تسمے کھولنا بھول گیا تھا۔ بوٹ اتار کر لیٹنے لگا تو رک گیا۔ میں کپڑے بدلنا بھول گیا تھا۔ پھر غسل خانے میں گیا، کپڑے بدلے، واپس آ کر بستر پر بیٹھا پھر اٹھا۔ میں کمرے کا بلب آف کرنا بھول گیا تھا۔ کمرے کا بلب آف کرنے کے بعد میں بے سدھ ہو کر بستر پر لیٹ گیا۔ کولہے کی ہڈی میں درد تھا، عضلات میں کھچاؤ تھا، لیکن بیرونی جلد اب حساس تھی۔ سر پر سیدھا پنکھا گھوں گھوں کرتا گھوم رہا تھا۔ جسم پر تھکن اور ذہن پر غنودگی چھائی ہوئی تھی۔

"میں شعورے والی بات تو سمجھ ہی سکتا تھا،" میں نے سر پر گھومتے پنکھے کو دیکھتے ہوئے سوچا،

"بچگانہ سی بات کہ سکالی سیب پر قانونی طور پر مریکہ کا حق ہے، لیکن میں خاموش رہا۔ یہ تو کہہ سکتا تھا کہ اگر سکالی سیب سے مل بھی جائے تو بھی اس سے سب چھین لیا جائے گا، لیکن میں خاموش رہا۔ دنیا میں قانون کی حکمرانی ہے کہاں پر؟ موجودہ دنیا میں طاقتوروں کے ہاتھ اس قدر مضبوط ہو چکے ہیں کہ وہ قانون سے بالاتر ہو چکے ہیں۔ ماضی کے بادشاہوں کی طرح وہ قانون بھی خود بناتے ہیں اور خود ہی قانون سے بالاتر بھی ہو جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں اگر کچھ دیر کے لیے پاگل پن ہی میں سہی، شعورے نے سکالی سیب کو اپنی ملکیت تصور کر لیا تھا تو کیا ہوا؟ کیا ایک غریب اور محروم شخص سے اس کے خواب بھی چھین لیے جائیں؟ ہاں، یہ بات خوش آئند ہے کہ وہ اب کشف کے فریب میں کبھی نہیں آئے گا۔"

مجھے شعورے کی وہ گالی یاد آئی جو اس نے پیر مراد شاہ کو دی تھی۔ اس تمام قصے میں یہی ایک خوش آئند بات تھی کہ اس کے شعور پر پیر کی حکمرانی کا سحر ٹوٹ چکا تھا۔ اس کے وجود پر پیر کی حکومت کا تختہ الٹ چکا تھا۔ نا پختگی ہی سے سہی، اس نے یہ اظہار تو کر ہی دیا تھا کہ اب اس کا لاشعور بھی اس کا اپنا ہے۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ پردوں کے پیچھے روشنی بڑھ چکی تھی۔

"خود کو قانون سے ماورا سمجھنے والے اہلِ ہوس ہی صداقت اور حق کا راستہ نہیں روکتے، وہ سب بھی "مری سوچ کا شاہکار" ہیں۔ "ان کا سایہ دنیا بھر کے انسانی معاشروں پر ہے اور فتح کے نشے میں مدہوش لیڈر اور شخصی معاشرے میں تمام تر برتری کے ساتھ باعزت دکھ کر اربوں چھوٹے چھوٹے، خوف اور خود غرضی کے شکنجے میں جکڑے ہوئے لوگ بھی انسانیت کی راہ روکتے ہیں۔ شعور سے بچپن سے کروڑوں انسانوں کو محروم کس نے کیا؟ وہ کون سے اصول ہیں جو محرومی کی چنگاریاں ڈال کر انسانوں کے ہاتھ اور چہرے جھلساتے رہتے ہیں، ان کے جسموں کے ساتھ ان کی روحوں کو بھی کمزوروں پر جلاتے رہتے ہیں؟ وہ کون سے قوانین ہیں جنھوں نے اس دنیا میں طبقاتی رویوں کو مستحکم کیا ہوا ہے؟ انھیں کس نے فطرت کے شدید پہلو کے انتخاب سے تشکیل دیا اور فطرت کے لطیف پہلو کو فراموش کر دیا؟ یہ اصول، یہ قوانین فطرت کے عمل اور اصول و قوانین نہیں ہیں۔ خود کو مخدوم بن کر دوسروں کو خادم بنانا فطرت کا لطیف پہلو تو نہیں ہے۔ خود کو داتا بن کر دوسروں کو محتاج بنانا اصولِ فطرتِ لطیف تو نہیں ہے۔ خود کو آقا اور دوسروں کو غلام بنانا لطیف فطرت کا قانون تو ہو نہیں سکتا۔ کرۂ ارض پر قائم قوانین کی تشکیل فطرت کے مطابق تو نہیں ہے، نہ ہی یہ اصولِ فطرت کا عملی اکتساب ہیں۔ تو پھر مذاہب کی بنیاد پر دی گئی ہیں کہ ان کے اصول اور قوانین عین فطرت ہیں؟ یہ وہ خود فطرت شدیدہ کے مذاہب ہیں؟ جو طاقتور ہیں وہ خوف کو اپنا ہتھیار بنا کر کمزوروں کو صرف بے اماں کرتے ہیں بلکہ ان کا بدترین استحصال بھی کرتے ہیں۔ خود غرضی نے انسانی معاشروں میں خیر کی شمعوں کے سامنے مفادات کی دیوار کھڑی کر دی ہے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے جاری ہے اور ابھی تک انسانوں کو حقیقی اور سچا شعور حاصل نہیں ہو سکا۔ زمین پر انسانیت ہوس کی نذر ہو چکی ہے۔ اگر کوئی ان تاریکیوں کو مٹانے کی انفرادی کوشش کرے تو اسے پاگل اور دیوانہ قرار دے دیا جاتا ہے۔ اگر کچھ لوگ مل کر اجتماعی کوشش کریں تو ان کا وجود ہی مٹا دیا جاتا ہے۔ اس زمین پر، اس دنیا میں، انسانیت کو قوتِ شر سے کون نجات دلائے گا؟ کون قوتِ شر کے نمائندوں کی بہیمانہ سرگرمیوں سے انسانوں کو بچائے گا؟"

مادری اور ان کی میں سے خواب آلود ذہن پر بوجھ بن کر اتری... نہ جانے میں کب سو گئی۔

"یہ ابھی تک سو رہا ہے؟" بھائی کی آواز پر میری آنکھ کھل گئی۔ وہ کمرے کے دروازے میں کھڑے تھے۔ میری نظریں دیوار پر لگے کلاک کی سمت گئیں۔ سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ میں نے تکیے سے سر اٹھایا۔

"کب آئے؟" بھائی نے پوچھا۔

"صبح پانچ بجے۔" میں نے جواب دیا۔ "شکورے کے ساتھ ساری رات، باتیں ہوتی رہیں۔"

"وہ پاگل ہے،" بھائی نے کہا۔ "اس کے ساتھ تو پندرہ منٹ گزارنا مشکل ہوں گے، تم رات کیسے گزار آئے؟"

"نہیں بھائی،" میں نے کہا، "اس کے ساتھ تو وقت کا احساس ہی نہیں رہتا۔"

"ٹھیک ہے، تمھارا بچپن کا دوست ہے، لیکن اسے دورے پڑتے ہیں۔ ایسا آدمی خطرناک ہوتا ہے،" بھائی نے کہا۔

"شکورا ایسا نہیں ہے بھائی" میں نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اس کی ساری جارحیت تصوراتی ہے۔"

"ابھی تھوڑا مار دھاڑ کر گالیاں دیتا ہے،" بھائی نے مسکرا کہا۔

"آج تک اس نے ..." میں نے بستر سے نیچے ٹانگیں اتارتے ہوئے کہا، "کبھی جسمانی جارحیت نہیں کی۔ ہاں، اگر کوئی جسمانی جارحیت کرے تو اپنا دفاع ضرور کرتا ہے۔"

بھائی چلے گئے میں غسل خانے کی طرف چلا گیا۔

"اسے کچھ نہیں ہوگا" میں نے خود کو تسلی دی۔ "چٹان پر اس کے دل کی دھڑکن سے تو میں ڈر ہی گیا تھا۔"

میرے بدن میں اب بھی تھکن تھی۔ کولہے کی ہڈی کے نیچے دھیما دھیما سا درد بھی تھا۔ شکورے کے لیے میری بے چینی ناگزیر تھی۔

"کل یا پرسوں مجھے سٹاف ٹریننگ سکول جانا ہے،" میں نے سوچا۔ "جو کچھ کل رات ہوا ہے فطرت نے میری تربیت، بڑی تربیت تو کر دی ہے۔ سٹوڈیو میں شخصیات اور فنکاروں کو جانا،

Scanned with CamScanner

ریکارڈنگ کرنا، ٹیپ ایڈیٹنگ کرنا، او بی (آؤٹ ڈور براڈ کاسٹ، بیرونی نشریات) یہ تو ثانوی تربیت کے حصے ہیں۔ بچ وراصلی تربیت تو مجھ مل ہی چکی ہے۔" میں نے الماری سے کپڑے نکالے

"جنرل ضیا، الحق کا دور ہے،" میں نے آنے والے دنوں، مہینوں، برسوں کا تصور کرتے ہوئے سوچا۔ "نشریات پر غیر معمولی اور ناقابل برداشت پابندیاں تو ہوں گی، پھر بھی میں اس بات کی پوری کوشش کروں گا کہ قواعد و ضوابط میں رہتے ہوئے فرسودہ عقائد اور جاہلیت کے خلاف جدوجہد کرتا رہوں۔ میں ہار نہیں مانوں گا۔ فرد کی شکست کو تسلیم نہیں کروں گا۔ میں معاشرے میں موجود جبر و تشدد کے ماحول میں اپنے کردار سے یہ ثابت کر دوں گا کہ ایک تنہا انسان بھی فطرت کے لطیف اصولوں کے ساتھ جی سکتا ہے۔ میں قوت شر کا کوئی تقاضا پورا نہیں کروں گا۔ میں اپنے وجود سے یہ ثابت کر دوں گا کہ ہوسناکیوں سے آلودہ اس تاریک دنیا میں ایک فرد بھی خوف اور خود غرضی سے بلند ہو کر عزت نفس کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔"

شکورے کے لیے میری بے چینی تجسس میں بدل چکی تھی۔ میں شام ہونے تک بنگلے پر ہی رہا، پھر بازار کے احاطے میں پہنچا۔ پرائمری سکول کی دیوار کے پاس ہی مجھے شیر علی کا ہوٹل ایک ندیشے کی طرح نظر آیا۔ ہوٹل میں قہقہے گونج رہے تھے۔ احاطے میں پنڈی گھیب جانے والی بس کھڑی تھی۔ ہوٹل کے قریب پہنچنے پر مجھے بس کا ڈرائیور، کنڈکٹر اور چند مسافر اندر بیٹھے زور زور سے باتیں کرتے اور ہنستے نظر آئے۔

"اج مرادے دی خیر نہیں!" (آج مراد کی خیر نہیں!) بس کے کنڈکٹر نے کہا۔ "میں پنڈی گھیب وِنج کے اس نال بہوں بہوں ریکارڈ ناساں..." (میں پنڈی گھیب جا کر اس کا بہت بہت ریکارڈ لگاؤں گا۔)

میرا اندیشہ سوال بن چکا تھا۔ شیر علی نے پوچھے بغیر ہی اس سوال کا جواب دے دیا۔

"صاحب، آپ نے بھی کس پاگل سے یاری لگائی ہے!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ "پرسوں پنڈی گھیب جانے والی دوسری بس کے ڈرائیور مراد علی نے شکورے کے سامنے مارواڑی کر بھتوڑا مارنے کے انداز میں پیچھے سے شکورے کو گالی دی تھی۔ شکورے کے ساتھ اس کی گالی گلوچ ہوئی تھی۔ وہ جری بہت شرارتی ہے۔ آج دو دن بعد..." شیر علی زور سے ہنسا۔ "دو دن بعد شکورے نے

Scanned with CamScanner

"وہاں" شیر علی نے پرائمری سکول کی دیوار کی طرف منہ کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ "وہاں حادثے کے بعد شکورے نے مراد علی کو بڑی گالیاں دیں۔ مراد علی بندوق کی تلاش میں ہے اور شکورے نے دو دن بعد..." شیر علی اپنی ہنسی روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ "بڑی گالیاں دیں۔ بڑا تماشا ہوا یہ" شیر علی نے ہوٹل کے اندر بیٹھے لوگوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ اسی بات پر ہنس رہے تھے۔ دو دن بعد... گالیاں..." شیر علی ہنسے جا رہا تھا۔

"شکورا کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔ میرے سنجیدہ سوال پر شیر علی نے میری طرف غور سے دیکھا۔

"وہ جی... سکول کی دیوار کے ساتھ ساتھ... چیختے ہوئے گالیاں دیتے ہوئے ہسپتال تک گیا تھا۔ پھر دائیں ہاتھ مڑ کر پاور ہاؤس کی طرف گیا۔ ابھی ابھی میرے (حلیم) ایکسٹینشن سے پاور ہاؤس سے ... کر بتایا تھا کہ وہ کھوڑ گاؤں کی طرف چلا گیا ہے۔"

میں فوراً سمجھ گیا کہ شکورا دکو چھرکی کے پاس گیا ہوگا۔ واپس بھائی کے بنگلے کی طرف آتے ہوئے میری بے چینی اور تجسس، مایوسی اور اداسی میں تبدیل ہو رہے تھے۔

"یہ میں نے کیا کیا... حماقت ہوگئی مجھ سے... برباد کر دیا میں نے شکورے کو۔ اس نے دو دن سے باہر نکل کر کبھی پاگل پن کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔ آج وہ بھی ہو گیا!"

ندامت اور اندیشہ، مایوسی اور اداسی، عجیب کیفیت میرے ساتھ چل رہی تھیں۔ لیکن ایک خیال باعث سکون بھی تھا کہ نام کی اتفاقیہ یکسانیت نے شکورے کو ایک بڑی مصیبت سے، بڑے حادثے سے بچا لیا تھا۔ اگر مریدوں کو پتا چل جاتا کہ شکورا اس کے ڈرائیور مراد علی کو نہیں، پیر مراد شاہ کو گالیاں دے رہا تھا تو شاید وہ اسے جان سے مار دیتے۔

12

اگلی صبح میں جلدی تھا۔ سات بجے بھائی کے ساتھ ناشتے کی میز پر بیٹھا۔

"تمہاری ٹریننگ کب شروع ہو رہی ہے؟" بھائی نے پوچھا۔

"تین چار دنوں میں۔" میں نے جواب دیا۔ بھائی مجھے ملازمت کے گر سمجھانے لگے۔

Scanned with CamScanner

''اپنے سے بڑے افسروں کی ہر بات کو اہمیت دینا۔ اگر تم سے کوئی غلطی ہو جائے تو اسے چھپانے کی کوشش نہ کرنا فوراً مان لینا اور معذرت کر لینا۔ اپنے ساتھی پروڈیوسروں سے بہت زیادہ میل جول نہ رکھنا اور نہ ہی ان سے قطعی طور پر الگ رہنا۔ اگر ماتحت عملے کے کسی ملازم سے کوئی غلطی ہو جائے تو سب کے سامنے اسے ہرگز نہ ڈانٹنا، کچھ نہ کہنا۔ اسے اکیلے میں کمرے میں بلا کر بیشک اس کی ایسی تیسی کر دینا۔ جہاں بہت سے لوگ کام کرتے ہیں، وہاں گروہ بندیاں ہوا کرتی ہیں۔ کسی گروہ بندی میں شامل نہ ہونا۔'' پھر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اچانک شکور سے ملاقات کا ذکر چھڑ گیا۔

''تم ٹھیک کہتے ہو،'' بھائی نے کہا۔ ''اسے لوگوں نے پاگل بنا رکھا ہے۔ وہ تو مفت کی تفریح ہے۔''

''یہاں کے لوگوں کے پاس تفریح کے ذرائع بھی تو نہیں ہیں،'' میں نے کہا۔ ''ورکرز کلب میں ہفتے میں ایک فلم تو دکھائی جاتی ہے لیکن ورکرز کے علاوہ چوکیدار کسی کو اندر نہیں جانے دیتا۔ یہاں کے دیہات میں تفریح کا سامان صرف جھنڈ ہیں۔ اگر ان دیہات میں کوئی اوپن ایئر تھیٹر ہوتا تو دیہاتی ادھر متوجہ ہو جاتے۔ ان دیہاتوں میں فنکاروں کی کمی نہیں ہے۔ لڑکے اور لڑکیاں اچھے ڈانسر ہیں، سنگر ہیں۔ انھیں روزگار بھی مل جاتا۔''

بھائی نے میری طرف کنکھیوں سے دیکھا۔

''تم یہ کیوں بھول جاتے ہو کہ تم ایسے ملک میں رہ رہے ہو جہاں دیہاتیوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا مل جانا ہی غنیمت ہے۔ اوپن ایئر تھیٹر خوابوں کی دنیا سے باہر نکلو۔ یہاں اگلے پچاس برسوں میں بھی ایسا کچھ نہ ہوگا۔ یہ صرف آئیڈیلزم ہے۔''

میں خاموش ہو گیا۔ آٹھ بجے کے قریب میں بازار کے احاطے میں پہنچا۔ میری نظریں سیدھی شیر علی کے ہوٹل کی سمت گئیں۔ وہ ایک بڑے سے دیگچے میں بڑا سا چمچ پھیر رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر دور سے مسکرایا۔ میں اس کے پاس گیا۔

''کمال ہو گیا صاب،'' شیر علی نے کہا، ''ہمارے لیے تو آج کا سورج حیرت لے کر طلوع ہوا ہے۔ شکورا بالکل ٹھیک ہو گیا ہے۔ آج صبح وہ خوش خوش گاؤں سے آیا۔ گھاٹ پر غسل کیا۔ پھر مجھ سے ناشتے پر انڈا پراٹھا مانگا۔ اس بخیل نے تو سوکھی روٹی اور چائے کے علاوہ کبھی کوئی ناشتہ کیا ہی

Scanned with CamScanner

نہیں‘‘ شیر علی ہنسا۔’’آج تو کمال ہو گیا! انڈا پراٹھا اور چائے کے ساتھ ناشتہ کر کے وہ خوش خوش دکان پر گیا ہے اور اب دکان میں بیٹھا ڈبّے (عبداللہ) کی گائے کے لیے سنگلی بنا رہا ہے۔‘‘

میرا جی چاہا کہ شکورے کے پاس جاؤں، لیکن اس خیال سے کہ کہیں مجھے دیکھ کر اس کے ذہن پر صدمے کا ہتھوڑا پھر سے ضرب نہ لگائے، میں واپس بنگلے کی طرف چل دیا۔

’’ایسا کیسے ہو سکتا ہے!‘‘ میں نے سوچا۔’’جو کچھ شیر علی نے بتایا ہے، اگر وہ سچ بھی ہے تو بھی میں اس بات پر کیسے یقین کر لوں کہ شکورا اپنے دکھوں سے آزاد ہو گیا ہے؟ اتنا آسان تو نہ ہو گا شکورے کے لیے اپنی خواہشات اور محرومی سے نجات پا جانا۔ اگر اسے تلخ حقائق کا شعور حاصل ہو گیا ہے... اگر اس کے خوابیدہ ذہن کو شدید صدمے نے بیدار کر بھی دیا ہے تو بھی یہ آسان نہ ہو گا۔ اگر وہ اپنی محرومیوں کے ساتھ جینا چاہتا ہے تو اسے کون جینے دے گا؟ وہ بازار کے لوگوں اور دوسرے افراد کے لیے مفت کا تماشہ ہے، تفریح ہے۔ وہ اپنی اس تفریح سے کسی صورت بھی محروم ہونا نہیں چاہیں گے۔ کوئی نہ کوئی مراد علی جیسا شخص اسے چھیڑ دے گا اور وہ پھر بھڑک اٹھے گا۔‘‘

13

سہ پہر کے وقت میں پھر بازار کی طرف گیا۔ تمام راستہ گرمی کی تپش کا احساس دلاتا رہا۔ جولائی کی سہ پہر میں حدت کچھ زیادہ ہی محسوس ہوئی۔ اگرچہ جون کی دوپہروں کی طرح تارکول سڑکوں پر جگہ جگہ پگھلی ہوئی نہ تھی۔ پھر بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سڑکوں کے نیچے الاؤ سے جل رہے ہیں۔ پرائمری سکول تک پہنچتے پہنچتے میں پسینے سے بھیگ چکا تھا۔ میں پرائمری سکول کی دیوار کے پاس ہی تھا کہ مجھے دھیما سا شور سنائی دیا۔ میں تیز قدموں سے احاطے میں پہنچا۔ شیر علی کے ہوٹل کے عقب گلی میں شور مچا ہوا تھا۔

میں دوڑتے ہوئے عقبی گلی میں پہنچا۔ شکورے کی دکان کے آگے بھیڑ سی لگی ہوئی تھی۔ بازار کے دکاندار، ان کے گاہک، بسوں کے ڈرائیور، کنڈیکٹر، گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کا عملہ، مسافر، سبھی وہاں موجود تھے۔ وہ سب زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے، ہنس رہے تھے۔

شکورے پر معمول کا دورہ پڑ چکا تھا۔

Scanned with CamScanner

بے ہنگم شور میں، لوگوں کی بھیڑ میں راستہ بنانا مشکل تھا۔ میں دکان کی مخالف سمت میں، شیر علی کے ہوٹل کی عقبی دیوار سے پی پشت گھسیٹتا، ہجوم میں راستہ بناتا، شکورے کی دکان کے سامنے پہنچا۔ میرے سامنے ہجوم سا تھا۔

دکان کی دائیں سمت نثار خان کھڑا شکورے کو پشتو میں گالیاں دے رہا تھا۔

بھیڑ ایک بے سروپا عفریت کی طرح شور مچا رہی تھی، اور دور دور سے بازو ہلا رہی تھی۔ شکورا پوری قوت سے نہائی پر ہتھوڑا مارتے ہوئے گالیاں دے رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا، آنکھیں پوری کھلی ہوئی تھیں، پیشانی پر گہری شکنوں کے اوپر پسینے کے قطرے تھرتھرا رہے تھے۔ اس کا کرتا پسینے سے بھیگ کر اس کی چھاتی اور پیٹ سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے بدن کی ہڈیاں نمایاں تھیں۔ اس کے پورے بدن میں ارتعاش سا تھا۔ ہونٹ مسلسل اونچی آواز میں بول رہے تھے۔ ان کے چہرے خوشی سے تمتمائے ہوئے تھے، آنکھوں میں وحشت آمیز چمک تھی۔ شکورے کی ہر گالی ہتھوڑے کی ضرب پر ختم ہو رہی تھی۔ وہ اس قدر قوت سے خالی نہائی پر ہتھوڑا مار رہا تھا کہ دھمکوں کی سی آواز بلند ہو رہی تھی۔

بھیڑ میں شور مچاتے ہوئے دیہاتی انگلیوں سے پیشانیوں کا پسینہ پونچھتے، قطرے بنے مٹی میں گراتے، بازو گھما گھما کر شکورے کو بھڑکا رہے تھے۔

''ہا بھائی ہا ... اج نہ چھوڑیں — بس چھوڑ، منج بھن چھوڑ!'' (ہاں بھائی ہاں، آج سے نہ چھوڑنا، توڑ دے ... گردن توڑ دے!) ایک دکاندار چیخا۔ ہر سمت قہقہے بلند ہوئے۔ ایک اور دیہاتی اچھل کر آگے بڑھا۔

''شابا بھائی شابا ... سرے تے مار، سرے تے — سرتھ چھوڑ!'' (شاباش بھائی شاباش، سر پہ مار سر پہ! کچل دے!)

بے ہنگم شور کے مرغولے سے اٹھ رہے تھے۔ شور کسی گرد باد کی طرح گلی میں چکر کاٹ رہا تھا۔ شور میں سنسناہٹ سی تھی۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے شور میں ان دیکھی چنگاریاں سی اڑ رہی ہیں، غیر مرئی شعلے سے لپک رہے ہیں۔ شکورے کی گالیوں میں تین گالیوں کا اضافہ ہو چکا تھا، اور یہی اضافہ ہجوم میں قہقہوں اور کوکتے شور کا باعث بنا ہوا تھا۔

Scanned with CamScanner

ڈش میں شوربے کی بڑی بڑی آنکھیں، سرخ ڈوروں والی آنکھیں ابل کر باہر نکلتی محسوس ہو رہی تھیں۔

''ہال او ئے مراد یا نامرادا، ٹھنڈی میں۔'' (ہائے او مراد و نامرادا تیری میں)

''ہال نی چٹے سے ٹھنڈی میں۔'' (ہائے ری گوری میم، تیری میں)

''ہال او امریکی چک چوندروستانی میں۔۔'' (ہائے او امریکی چچوندرو، تمھاری میں۔۔)

Scanned with CamScanner

خالد طور

ہاں گھن[1]

جنوری کے ابتدائی ایام تھے۔ بستر پر لحاف میں دبکے ہوئے، اگر سوتے سوتے آنکھ کھل بھی جاتی تو بھی میں نیند کا بہانہ کیے چپ چاپ لیٹا رہتا تھا۔ کبھی والدہ، کبھی والد صاحب کی آواز آتی: "بیٹو... سکول جانا ہے... اٹھو... جلدی کرو..." میں کمر کیے پڑا رہتا۔ لحاف کی گرمی، بستر کی نرم و گداز سطح، تکیے پر دبا ہوا سر اور آہستہ آہستہ آتی جاتی سانس، سب کچھ ایک ایسے سکون میں بدل جاتا تھا کہ آنکھیں کھولنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔ پورے جسم پر ایک ایسی کیفیت چھا جاتی تھی جسے میں بیان نہیں کر سکتا۔ اسی بے نام کیفیت سے لپٹ کر میں نیم خوابیدہ حالت میں گزرے دنوں کے واقعات یاد کیا کرتا تھا۔ سکول کی باتیں، کھیل کی باتیں، ریڈیو پر سنے ہوئے گیت، سب مجھے سردی کی صبح میں نرم بستر پر چپ چاپ لیٹے رہنے پر اکسایا کرتے تھے۔ ہمارے گھر میں جب ... میں تب نیا نیا ایک ریڈیو تھا۔ کبھی کبھی منجھلے بھائی اس پر ریڈیو سیلون کے پروگرام سنا کرتے تھے اور خوبصورت فلموں کی موسیقی سے جڑے کتنے ہی خوبصورت گیت اور دلکش آوازیں مجھے کسی خواب آلود جزیرے میں لے جایا کرتے تھے۔

"اب اٹھ بھی جاؤ" امی کی آواز آتی تو میں چونک اٹھتا۔ "سکول نہیں جانا کیا؟" میرے خواب ٹوٹ جاتے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھنا ہی پڑتا تھا۔ پھر وہی سکول، کتابیں، تختی، ماسٹر جی کی

[1] شمالی پنجاب کی ریاستوں میں اور کھیچا میں "گھن" کا مطلب "لو" ہے۔ کوئی چیز دیتے ہوئے "ہاں گھن" بولا جاتا ہے اس کا مطلب "یہ لے" ہے۔ اگر کہا جائے کہ "گھن ونج" تو اس کا مطلب "لے جاؤ" ہوتا ہے۔

Scanned with CamScanner

سخت غصیلی آواز اور گالیاں... کھوڑ میں لڑکوں کے لیے ایک ہی پرائمری سکول تھا۔ یہ سکول کھوڑ میں، کمپنی کالونی میں، کھوڑ گاؤں کی سمت جانے والی کچی سڑک پر واقع تھا۔ سکول میں کل چھ کمرے تھے، کسی بیرک کی طرح سیدھے۔ سامنے برآمدہ تھا اور برآمدے کے سامنے کھلا میدان نما صحن۔

ٹک آئل کمپنی کے انگریز افسروں کے بچے راولپنڈی میں مورگاہ، ریفائنری کے انگلش سکول میں پڑھتے تھے، اور وہ کالونی کے بنگلوں میں اکیلے رہتے تھے۔ ہر ہفتے کو وہ راولپنڈی چلے جاتے تھے، بچوں سے ملنے۔ صرف ایک دو بوڑھے انگریز ہی کالونی میں چھٹی کا دن گزارتے تھے۔ وہ اکثر اتوار کو کھوڑ کے چھوٹے سے گرجا گھر میں بنچوں پر بیٹھے نظر آیا کرتے تھے۔

کمپنی کے مقامی افسروں اور کارکنوں کی لڑکیوں کو صبح صبح کمپنی کی ویگن پنڈی گھیب لے جایا کرتی تھی، جہاں وہ گورنمنٹ مڈل سکول فار گرلز میں پڑھتی تھیں۔ ویگن سہ پہر کو انھیں واپس کالونی میں لے آیا کرتی تھی۔ کھوڑ گاؤں کی لڑکیاں ہر قسم کی سہولت سے محروم تھیں، ان کے لیے پرائمری سکول بھی نہیں تھا، لیکن کھوڑ گاؤں کے لڑکے صبح صبح بستے اور تختیاں اٹھائے کمپنی کی کالونی میں قائم ڈی بی (ڈسٹرکٹ بورڈ) سکول میں جایا کرتے تھے۔

سکول میں ایک ہی ماسٹر تھے، ماسٹر محمد جان۔ وہ پہلی کلاس سے پانچویں تک سب لڑکوں کو سبھی مضامین پڑھاتے تھے، کبھی اِس کلاس میں، کبھی اُس کلاس میں۔ وہ دن بھر سکول میں پھرتے رہتے تھے۔ سردیوں میں سب کلاسیں سکول کے گراؤنڈ نما صحن میں بچھے ٹاٹوں (بوریوں) پر ہوا کرتی تھیں۔ دن بھر صحن میں شور سا مچا رہتا تھا۔ صحن میں کلاسوں کے لیے جگہیں مخصوص تھیں۔ ماسٹر محمد جان بہت ہی سخت گیر تھے۔ ان کی شکل و صورت بھی انتہائی کرخت تھی۔ چہرے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، غصیلی آنکھیں، مہندی رنگی مونچھیں اور چھوٹی سی داڑھی، لمبا قد، دبلا جسم؛ شلوار قمیض پر کھڑے شملے کی پگڑی باندھتے تھے۔ وہ کھوڑ کے قریب ہی ایک گاؤں سیپیاں کے رہنے والے تھے اور گھوڑی پر سکول آیا کرتے تھے۔ ان کی ایک عادت یہ بھی تھی کہ وہ چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہی گھوڑی پر سوار ہو جاتے تھے۔ انھیں دیکھ کر سکول کا ایک لمبا سا لڑکا غلام حسین گھنٹی بجا دیا کرتا تھا۔ ماسٹر محمد جان کے ہاتھ میں ہمیشہ بید کی چھڑی رہتی تھی، جو ہتھیلی پر پڑتی تو یوں لگتا تھا جیسے ہاتھ کو کسی نے گرم سلاخ سے داغ دیا ہو۔ ہتھیلی پر سرخ سی لکیر نمودار ہو جاتی تھی جو دن بھر درد اور جلن کا احساس دلاتی رہتی تھی۔

Scanned with CamScanner

ایک بار وہ میاں سے پیڈ میں میں بھی دانا جا چکا تھا۔

ہماری پانچویں کلاس میں تین چار لڑکے اپنے اپنے کردار کی وجہ سے بہت نمایاں تھے۔

ایک رشید تھا چھوٹے قد اور پہلوانوں جیسے بدن والا۔ جہلم کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا رشید بہت لڑاکا تھا، ہر وقت اپنی دھونس جمانے والا، ہر ایک سے جھگڑا کرنے کے لیے تیار۔ رشید کے برعکس انتھونی نہایت ہی صلح پسند اور خاموش رہنے والا لڑکا تھا۔ کالے رنگ کا، لمبی ناک والا۔ اس کا باپ انتھونی کمپنی کے کسی انگریز افسر کے خانسامے کا بیٹا تھا۔ وہ تقسیم ہند سے پہلے کھوڑ ہی میں پیدا ہوا تھا۔ مقامی زبان بہت روانی سے بولتا تھا۔ اس کا اینگلو انڈین باپ شاید جنوبی ہند کا رہنے والا تھا، جو شاید اپنی مادری زبان بھول چکا ہوگا۔ کلاس میں ایک محمد سرور تھا، کھوڑ کے قریب کسی گاؤں کا رہنے والا۔ اس کا باپ کالونی کے کلوب ہوٹل میں کام کرتا تھا۔ سرور بہت موٹا تازہ، لمبے قد کا تھا لیکن شکل ہی سے بہت بے وقوف نظر آتا تھا۔ ماسٹر محمد جان نے مزاحیہ انداز میں ایک بار اسے نوری فرشتہ کہہ کر پکارا تو یہی نام سکول کے ہر طالب علم کی زبان تک پہنچ گیا۔ پہلے پہل وہ اس نام سے بہت چڑتا تھا لیکن آہستہ آہستہ عادی ہو گیا۔ سارا اسکول اس کا اصلی نام بھول گیا۔ صبح حاضری لیتے ہوئے ماسٹر محمد جان، اسے نوری فرشتہ کہہ کر حاضری لگاتے تھے، اور وہ بھی نوری فرشتہ نام سنتے ہی فوراً 'حاضر جناب' کہا کرتا تھا۔ ایک اور بہت بولنے والا لڑکا فیض لاہوریا تھا، چھوٹے قد کا، موٹا اور چوڑے جبڑے والا۔ اس کے سفید چہرے پر آنکھیں اتنی گول گول تھیں کہ انھیں دیکھ کر مجھے تصویروں میں دیکھا ہوا الو یاد آتا تھا۔ فیض لاہوریے کا باپ کمپنی میں کلرک تھا۔ فیض لاہوریا مقامی زبان بھی مشکل ہی سے بولتا تھا۔ وہ بہت ہی تیز ہوا فلم زدہ لڑکا تھا۔ آدھی چھٹی یا چھٹی کے بعد وہ لڑکوں کی ٹولی بنا کر انھیں فلموں کی باتیں بتایا کرتا تھا۔ کھوڑ گاؤں کے لڑکوں نے فلم تو کیا دیکھی ہوتی، انھوں نے فلمی گانے بھی بہت کم سنے ہوئے تھے۔ فیض لاہوریا انھیں فلمی لڑکیوں کی باتیں اس طرح بتایا کرتا تھا جیسے وہ ان ہی کے درمیان پلا بڑھا ہو۔ وہ فلمی ہیروز کی بہادری کے ساتھ ساتھ ہیروئنوں کی جنسی کشش کو بھی خوب بیان کیا کرتا تھا۔ کبھی کبھی نہایت بے ہودہ باتیں کرتا تھا، بہت خوش، اور گاؤں کے سیدھے سادے لڑکوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی تھیں۔ وہ ہر لڑکے سے اسے لاہور لے جانے کا وعدہ کیا کرتا تھا۔ ہر لڑکے کو یوں دعوت دیا کرتا تھا جیسے لاہور میں اس کے باپ کی بہت بڑی حویلی ہو۔ ایک دن میں

Scanned with CamScanner

کے الیکٹریشن کے بیٹے سے کہنے لگا:

''تو میرے ساتھ چھٹیوں میں لاہور چل،'' فیض لاہوریے نے ہاتھ سے ایک سمت اشارہ کیا۔ ''وہاں میں تجھے سورن لتا کے پاس لے جاؤں گا۔ عیش کرنا۔''

ایک دن پلمبر کے لڑکے کا ہاتھ پکڑ کر بولا:

''تو میرے ساتھ لاہور چل، میں تجھے منور سلطانہ کے گھر لے جاؤں گا۔ کیا یاد کرے گا تو بھی۔''

مجھے تو وہ لاہوریے سے بھی آگے لے گیا۔ ایک دن میری طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگا:

''تجھے تو میں پہلے لاہور لے جاؤں گا۔'' اس کی گول گول آنکھیں گھومیں۔ ''پھر ہم بمبئی چلیں گے۔ اوئے یار، تو اتنا سوہنا ہے، تجھے دیکھ کر تو نرگس کی مت ماری جائے گی... بھول جائے گی راج کپور کو۔''

سب لڑکوں نے میری طرف یوں دیکھا جیسے انھیں جلن ہو رہی ہو۔ اس دن سکول سے واپس آ کر میں دیر تک امی کی سنگھار میز کے سامنے کھڑا ہو کر آئینے میں خود کو دیکھتا رہا۔ فیض لاہوریے نے کمپنی کی کالونی میں مختلف مقامات سے آئے ہوئے لڑکوں اور خصوصی طور پر کھوڑ گاؤں کے سیدھے سادے لڑکوں کے ذہنوں کو جنسی جذبات اور فحش خیالات سے بری طرح آلودہ کر دیا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ جلد ہی ختم ہو گیا۔

گرمیوں کی چھٹیوں سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ایک دن فیض لاہوریہ آدھی چھٹی کے وقت برآمدے میں بیٹھا، اپنی فلمی داستانوں میں مگن تھا۔ بہت سے لڑکے اس کے اردگرد چوکڑیاں لگائے بیٹھے تھے۔ اس نے کھوڑ گاؤں کے ایک لڑکے کو لاہور چلنے کی دعوت دی۔

''تو ضرور چلنا میرے ساتھ،'' فیض لاہوریے نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں تجھے نور جہاں سے ملواؤں گا۔ پکا وعدہ۔ اوئے وہی نور جہاں، جس دیا ٹوٹیا دنداں دیا کھوٹیو والی'' وہ لڑکا گھٹنوں کے بل ٹاٹ پر کھڑا ہو گیا۔ شاید اس نے گانا سن رکھا تھا۔ فیض لاہوریے نے اپنی سوٹی آواز میں گانا شروع کیا۔ فلمی دھن پر اس کی انگلیاں تختی پر تال دینے لگیں۔ ایک دو بول گا کر وہ کچھ اور لہرانا چاہتا تھا کہ ماسٹر محمد جان دروازے کے پیچھے سے برآمدے میں آ گئے۔ انھوں نے سب کچھ سن لیا

Scanned with CamScanner

تھے جو پتہ نہیں کہ ہوا ہے ساتھ ہو ... حصوں سے دیہاتی سکولوں میں تعلیم حاصل کی ہے انہیں خبر نہ جانے ہوں گے کہ یہ ہوا ہو گا اس کے بعد فیصل دو ہو گیا جیسے مر گیا۔ وہ دو تین دن خاموش ہو گیا۔ آدھی چھٹی کے وقت وہ سہما سہما سا چپ چاپ بیٹھا رہتا اور چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ماسٹر محمد جان کو گھوڑی پر سوار ہوتے دیکھ کر بستہ دری تختی اٹھا کر سکول سے بھاگ جایا کرتا تھا۔

ان دنوں سردی کچھ زیادہ ہی تھی۔ میں کپکپاتا ہوا سکول پہنچا، سویٹر، کوٹ، اونی ٹوپی، مفلر، دستانے، جرابیں یوں لگتا تھا اون کی کوئی پوشاک پہاڑوں کی طرف سے آنے والی ہواؤں ... سکتی تھی۔ دھوپ میں ٹاٹوں پر بیٹھ کر پڑھنا کسی دن اچھا لگتا تھا جس دن ہوا بند ہو۔ آدھی چھٹی کے وقت ارشاد اور نوری فرشتہ کسی بات پر الجھ پڑے۔ نوری فرشتے سے خوف ضرور تھا لیکن جسامت میں برابر تھے۔ دونوں گالی گلوچ پر اتر آئے۔ انھوں نے بیچ بچاؤ کیا اور آدھی چھٹی کا وقت ختم ہو گیا۔

چھٹی کی گھنٹی بجنے سے پہلے، ماسٹر محمد جان جیسے ہی گھوڑی پر سوار ہو کر سکول سے نکل گئے، نوری فرشتہ اٹھا اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا ... بلیک بورڈ پر چاک سے ایک گندی ... کی ... لکھ دی۔ ارشاد نے اسے اپنی توہین سمجھا۔ وہ اٹھ کر گالیاں دیتے ہوئے نوری فرشتے کی طرف بڑھا اور قریب تھا کہ اس سے ... نوری فرشتے نے بیگ پر ... کی طرح ... نوری فرشتہ حسب ... ساتھ بلیک بورڈ پر اور بلیک بورڈ کھسک کر پیچھے کی سمت صحن کے کچے فرش پر ... ارشاد کی کمر سے زیادہ چوٹ بلیک بورڈ پر گرنے سے لگی۔ وہ اٹھا اور سیدھا بستے کی طرف گیا۔ یوں لگا جیسے ڈر گیا ہو۔ ارشاد نے سینہ پھلا کر لڑکوں کی طرف دیکھا۔ پھر وہ نوری فرشتے کے سامنے آ گیا۔

"دے گاں!" اس نے چیخ کر کہا، "دے گاں [illegible] تیری میں [illegible] دے گاں!"

نوری فرشتہ کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے تیزی سے بستے کے نیچے سے [illegible] کی تختی نکال اور پوری طاقت سے ارشاد پر برسانا شروع کر دی۔

"ہاں ٹھک ... ہاں ٹھک... ہاں ٹھک" "لے یہ لے یہ لے" نوری فرشتہ [illegible] تھا۔ [illegible] نے ایک دو تختی کے وار ہاتھ پر روکے لیکن اس نے بڑی مشکل سے ارشاد کو بچایا ورنہ اس کا سر پھٹ جاتا۔

اگلے روز ایک ایسا واقعہ پیش آیا کہ سکول کے لڑکے تو کیا، خود ارشاد اور نوری فرشتہ گزشتہ دن کی لڑائی بھول گئے۔ کالونی کے چوکیدار عبداللہ کی جوان لڑکی بختاں کو کھوڑ کے تین اوباش نوجوانوں ملک محمد نواز، ملک محمد جہانگیر اور ملک محمد شریف نے رات کے وقت اس کے گھر سے اغوا کرنے کی کوشش کی، جو بختاں کی ماں کے شور مچانے اور اردگرد کے کوارٹروں کے بلب جل جانے پر ناکام ہو گئی۔ تینوں اندھیرے میں بھاگ گئے۔ عبداللہ اس وقت ڈیوٹی پر تھا۔

بختاں کو میں کئی بار دیکھ چکا تھا۔ عبداللہ چوکیدار کا کوارٹر کھوڑ جانے والی پکی سڑک پر ہمارے سکول کے قریب تھا۔ عبداللہ کے پاس ایک گائے بھی تھی، جسے چراتے ہوئے بختاں اکثر ہمارے بنگلے کے پاس سے گزرا کرتی تھی۔ گندمی رنگ، درمیانہ قد، نہ موٹی نہ پتلی، بختاں خوبصورت لڑکی تھی۔ اس کے بال سر پر سے رہتے تھے، اور گت (چوٹی) کمر سے بھی نیچے تک لٹکی رہتی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی رہتی تھی، جسے کبھی کبھی وہ گائے پر غصے سے برسانا شروع کر دیتی تھی۔ صبح سے دوپہر تک وہ گھر میں ماں کے ساتھ کام کرتی ہوئی، دوپہر سے شام تک وہ گائے چراتی تھی۔ میں نے کئی بار صبح صبح سکول جاتے ہوئے بختاں کو کوارٹر کی بیرونی دیوار پر اُپلے چپکاتے بھی دیکھا تھا اور میں اکثر سوچتا تھا کہ سردیوں میں اپلے چپکاتے ہوئے بختاں کے ہاتھ سن ہو جاتے ہوں گے۔

اس دن سکول میں ہر لڑکا بختاں کے اغوا کی کوشش پر ہی بات کر رہا تھا۔ آدھی چھٹی کے وقت لڑکوں کے شور کو اس خبر نے دگنا کر دیا کہ عبداللہ، اس کی بیوی اور بختاں، تینوں رپٹ لکھوانے تھانے گئے ہیں۔ چھٹی کے وقت پتا چلا کہ تھانیدار نے رپورٹ نہیں لکھی۔ تینوں اوباش نوجوانوں کا تعلق ملک خاندان سے ہے۔ تھانیدار ان کے خلاف پرچہ نہیں کاٹ سکا اور ان ملکوں نے بختاں کی ماں پر دلّی (دلالہ) ہونے کا الزام لگا دیا ہے اور پولیس ماں باپ کو چھوڑ کر بختاں کو تھانے لے گئی ہے۔

سہ پہر کو میں جب سکول سے گھر آیا تو کچھ ہی دیر بعد والد صاحب بھی دفتر سے آ گئے۔ مجھے چھپ کر باتیں سننے کی بری عادت نہیں تھی، لیکن اس روز میں نے والد صاحب اور والدہ صاحبہ کی باتیں سن لیں۔

''بہت بری بات ہوئی ہے۔'' والد صاحب کی آواز آئی۔ ''اس سے پہلے کالونی میں کبھی ایسا

Scanned with CamScanner

نہیں ہوا تھا۔ عبداللہ تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔" والد صاحب چودھری خاموش رہنے۔ "وہ بہت شریف آدمی ہے۔"

"شریف ہے تو اس کی بیوی بھی شریف ہوتی!" امی کی آواز آئی۔ "اثر و رسوخ والے امیر بدمعاشوں کا تو کام ہی یہی ہے کہ جب جرم کرتے ہیں تو الزام غریبوں پر لگا دیتے ہیں، طاقت اور پیسے کے زور پر صاف بچ جاتے ہیں۔"

"ایسی بات ہی لگتی ہے۔" والد صاحب کی آواز آئی۔ "ملک برادری اس علاقے کی سب سے طاقتور برادری ہے، اور یہ تھانیدار بھی تو ملک ہی ہے۔"

"بیچاری بختاں!" امی کی آواز میں اداسی تھی۔ "خدا جانے کیا حال کریں گے بیچاری کا۔"

میں وہاں سے اٹھ کر باہر لان میں جا بیٹھا۔ سرمائی سہ پہر کی دھوپ میں تمازت تو تھی لیکن ہوا کا ہر جھونکا خنکی کا تھپیڑا محسوس ہوتا تھا۔

"کیا کریں گے بختاں کے ساتھ؟" میں نے سوچا۔ "بہت ماریں گے اسے۔"

پل بھر کے لیے بختاں کا چہرہ میری آنکھوں کے سامنے آیا اور میں بہت غمزدہ ہو گیا۔ ہوا کے جھونکوں میں تیزی آ رہی تھی۔ شام سے پہلے سردی کا احساس بڑھ گیا اور میں گھر کے اندر چلا گیا جہاں آتشدان میں پتھر کے کوئلوں کو سلگایا جا رہا تھا۔ پتھر کے کوئلے ایک بار جل اٹھیں تو صبح تک ان میں حرارت باقی رہتی ہے، سارا گھر گرم ہو جاتا ہے۔ اب تو پتھر کے کوئلوں کے آتشدان خواب و خیال ہو چکے ہیں۔ رات آتے آتے باہر ہوا کی سنسناہٹ بھی مدھم ہو گئی۔

ہمارے بنگلے کے ساتھ بائیں جانب والا بنگلہ شنو کمار جی کا تھا۔ وہ کمپنی میں کام کرتے تھے اور تقسیم ہند سے پہلے بھی کھوڑی میں رہتے تھے۔ ان کے بیوی بچے کہاں تھے، معلوم نہیں۔ تقسیم سے پہلے وہ یقیناً بہت قابل تعظیم ہوں گے لیکن اب مقامی لوگ انھیں ہندو ہونے کی وجہ سے مذاق کا نشانہ بناتے رہتے تھے۔ کالونی میں ان کا نام سکھ وزر رکھ دیا گیا تھا۔ شاید اسی نفرت کی وجہ سے وہ جلد ہی کہیں چلے گئے — بھارت، انگلینڈ یا آسٹریلیا، مجھے یہ بھی معلوم نہیں۔ ہمارے بنگلے کے دائیں جانب ولی اللہ خان صاحب کا بنگلہ تھا۔ ولی اللہ خان صاحب کے بنگلے سے بیس قدم آگے حد تک ٹوٹا ہوا جنگلا تھا، جس کے آگے گاڑیوں کی باڑ تھی۔ یہ جنگلا اور باڑ ہمارے بنگلوں کو بستی سے جدا

کرتی تھی جس میں بختاں موجود تھی۔

ان دنوں نہ ٹی وی تھا نہ کمپیوٹر۔ شام سات بجے کھانا کھا کر رات ساڑھے آٹھ بجے تک پڑھائی ہوتی تھی اور پھر سارے گھر کے بلب بجھ جایا کرتے تھے۔ مجھلے بھائی ان دنوں کھوڑ میں اپرنٹس شپ کر رہے تھے۔ وہ رات نو بجے تک دھیمی آواز میں ریڈیو سنتے تو تھے، لیکن صرف ہفتے کی رات کو۔

اس رات کو ساڑھے آٹھ بجے سب بستروں میں دبک گئے۔ مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ بختاں کا خیال ہر چیز پر چھایا ہوا تھا۔ بار بار یہی خیال آ رہا تھا کہ تھانے میں بختاں کو مارا جا رہا ہے۔ پھر یہ خیال آیا کہ مار پڑنے پر وہ چیخے گی تو سب اٹھ کر اسے بچا لیں گے۔ پھر ایک خیال نے دیوی کو گھبرا کر دیا کہ انھوں نے بختاں کے منہ میں کپڑا ٹھونس رکھا ہوگا تاکہ چیخ نہ سکے۔ میں اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر بستر پر بیٹھا رہا۔ اس یقین پر کہ سب سو گئے ہیں، میں نے پلنگ کے قریب کرسی پر رکھا ہوا سویٹر پہنا، سر پر اونی ٹوپی پہنی، گرم جرابیں پہنیں، بستر کے قریب پڑے ربڑ کے سلیپر پہنے اور آہستہ آہستہ غسل خانے کی سمت گیا۔ غسل خانے سے پہلے وارڈروب کو آہستہ سے کھولا اور گرم کوٹ نکال کر پہنا۔ گلے میں مفلر ڈالا، احتیاط سے وارڈروب کو بند کیا اور غسل خانے میں آ گیا۔ غسل خانے کا ایک دروازہ پچھلے دالان کے سامنے برآمدے میں بھی کھلتا تھا۔ میں نہایت احتیاط سے شور کیے بغیر برآمدے میں آیا اور پھر ایک دو بار پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے دالان عبور کیا۔ باہر سرونٹ کوارٹرز کی طرف کھلنے والے چھوٹے گیٹ کو کھول کر میں گھر سے باہر آ گیا۔ سب سے پہلا احساس ہوا میں موجود سردی کا تھا۔ میں نے گردن پر مفلر لپیٹا، سر کی اونی ٹوپی کو پیشانی پر ابروؤں تک کھینچا۔ ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ڈالتے ہوئے مجھے دستانے بھول آنے کی غلطی کا احساس ہوا۔ گھر سے باہر نکل کر ڈر بھی لگا، کیونکہ والد صاحب نے رات کے وقت گھر سے باہر نکلنے پر سخت قسم کی پابندی لگائی ہوئی تھی۔ یہ علاقہ خطرناک قسم کے کوبرا سانپوں کا علاقہ ہے جو ہر سال کتنی ہی جانیں لے لیتے ہیں۔ والد صاحب کا حکم تھا کہ سردیوں میں بھی باہر نہ نکلا جائے، کیونکہ سرد ترین راتوں میں بھی سیاہ رنگ کوبرے کی ایک انتہائی زہریلی قسم بلوں سے باہر نکل آتی ہے۔ مجھے بختاں کے خیال نے پریشان کیا ہوا تھا۔ میں ولی اللہ خان صاحب کے بنگلے کے پاس سے گزرتے ہوئے جنگلے تک آیا اور پھر آگے بڑھتے ہوئے

ٹارچ کی روشنی بند نہ کی۔ باڑ کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے جب میں اس جگہ پہنچا جہاں تھانے کا عملہ تھا تو میں ٹھٹک گیا۔ تھانے کے دروازے پر تھانیدار کی جیپ کھڑی تھی اور برآمدے کے علاوہ بھی تھانے کے بلب جل رہے تھے۔ چند قدم آگے باڑ کے ساتھ والے کمرے سے آوازیں آرہی تھیں جو قریب جانے پر صاف سنائی دینے لگیں۔

''کنجری ہے تو!'' میں تھانیدار کی آواز پہچانتا تھا۔ ''پیشہ کرتی ہے!'' اس نے گرجدار لیکن دبی دبی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی بختاں کے رونے کی آواز آئی۔ میرے بدن میں جھرجھری سی سوار ہوئی۔

''مجھے قرآن پر ہاتھ رکھوا لے۔'' روتے ہوئے بختاں کی آواز بھی دبی دبی سی تھی۔ ''میں قسم کھاتی ہوں میں نے کوئی برا کام نہیں کیا۔''

''بک بک نہ کر!'' تھانیدار اور بختاں مقامی زبان اور لہجے میں بول رہے تھے۔ ''میرے علاقے میں یہ گندگی، اور مجھے پتا ہی نہیں — کب سے کر رہی ہو پیشہ؟'' ہوا کے ایک تند جھونکے سے پیپل کے پتے زور سے کھڑکھڑائے۔ مجھے جھرجھری سی آئی۔

''میں نے کچھ نہیں کیا۔'' بختاں رو رہی تھی۔ ''ملک نواز، جہانگیر اور شریف بہت دنوں سے میرے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ گھاس چرانے جاتی ہوں تو بولیاں مارتے ہیں۔ کل رات ہمارے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ماں سمجھی ابا آیا ہے۔ دروازہ کھولا تو زبردستی اندر گھس آئے۔ ماں نے شور مچایا۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر شریف نے اٹھانے کی کوشش کی۔ میں مڑی اس کے بال کھینچے۔ باقی دونوں نے مجھے اور ماں کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ ۔ پھر ساتھ والے گھر کی بتیاں جل جانے پر تینوں باہر اندھیرے میں بھاگ گئے۔ میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر تھانیدار کی غصیلی آواز ابھری۔

''بکواس نہ کر!'' وہ دہاڑا۔ ''جھوٹ بولتی ہے تو۔ تین گاہکوں کو دیکھ کر تیری دلّی ماں نے زیادہ پیسے مانگے تھے۔ نہ ملنے پر شور مچا دیا تھا۔''

''میری ماں کو دلّی نہ کہہ۔'' بختاں نے چیخ کر کہا۔ ''سارے گاؤں والے جانتے ہیں، ہم شریف لوگ ہیں۔ آپ چاہے جس سے، ہمارے پڑوسیوں سے پوچھ لے۔ ایسی باتیں اچھی نہیں

Scanned with CamScanner

رہتی ہیں تھانیدار ''

''ہا ہا'' یوں لگا جیسے تھانیدار نے زور سے اپنا بوٹ کمرے کے فرش پر مارا ہو۔ ''سب بتا چل جائے گا!'' تھانیدار کے لہجے سے میرے بدن میں سنسنی کی لہر اٹھی۔ ''بہت دیکھی ہیں تیری جیسی رنڈیاں... سب اگلوالوں گا۔''

بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ ہوا میں سردی کا احساس اس قدر بڑھ چکا تھا کہ میرے پورے بدن پر کپکپی سی طاری ہو چکی تھی۔

''دلاور خان،'' تھانیدار نے بلند آواز میں تھانے کے سب سے بوڑھے سپاہی کو بلایا۔ دلاور خان ریٹائرمنٹ کے قریب تھا۔ میں نے کئی بار شام کے وقت، اسے تھانے کے باہر لان میں کرسی بچھائے ہوئے، کرسی پر لیٹنے کے انداز میں اونگھتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس پر ہر وقت تھکن سی چھائی رہتی تھی۔ اس کی ڈیوٹی بھی رات ہی کی ہوا کرتی تھی۔ دلاور خان کے بال سفید ہو چکے تھے، چہرے پر جھریاں تھیں، دبلا پتلا، منہ میں اگلے دو دانت غائب۔ دلاور خان کے جسم پر وردی ایسی ڈھیلی نظر آیا کرتی تھی جیسے اس نے کسی موٹے سپاہی کی وردی پہن لی ہو۔

''جی ملک صاحب،'' دلاور خان کی آواز میں بھی تھکن تھی۔ آواز کے ساتھ اس کے بوٹوں کی آواز بھی نزدیک آتی محسوس ہوئی۔

''وہ جو پرسوں چور پکڑا تھا،'' تھانیدار کی آواز آئی۔ ''کچھ منوایا محمد حسین نے یا نہیں؟'' محمد حسین تھانے کا بہت ہی خوفناک قسم کا سپاہی تھا، بھاری بھرکم بدن والا، بہت چوڑے جبڑے اور بڑی بڑی سیاہ مونچھوں والا۔ ''کچھ مانا کہ نہیں؟''

''سب بتا دیا ہے سب کچھ اس نے ملک جی،'' دلاور خاں کی آواز آئی۔ ''چوریاں بھی مان لی ہیں۔''

''ہوں!'' تھانیدار نے لفظ ہوں کو کچھ لمبا کھینچا۔ ''جا دیکھ، کیا کر رہا ہے،'' تھانیدار نے قدرے دھیمے لہجے میں کہا۔ ''کوٹھڑی کا تالا اچھی طرح چیک کر لینا۔''

''اچھا ملک صاحب،'' دلاور خان کے بوٹوں کی آواز آہستہ آہستہ دور جاتی ہوئی سنائی دی۔ ہوا کے ایک جھونکے نے جیسے میرے پورے چہرے پر برف مل دی۔ میرے دانت بجے۔ یوں

Scanned with CamScanner

محسوس ہو رہا تھا جیسے میری ناک اور کان میرے جسم پر ہیں ہی نہیں۔ میں نے ہاتھوں سے ناک کو ٹٹولا، دونوں ہونٹوں پر کھینچا۔ گاروڈیہ کے بیر پتے چہرے سے مس کر رہے تھے۔ گہرے ہرے پتوں کی مہک نتھنوں میں محسوس ہوئی۔ ویسی ہی خوشبو جیسی پتا مسلنے پر بہت تیز ہو جایا کرتی ہے اور مجھے بھی اچھی لگتی ہے۔

"بڑی سوہنی ہے تو۔" لہجے کے ساتھ تھانیدار کی آواز بھی بدل گئی۔

"رب کے لیے مجھ پر رحم کر۔" بختاں نے روتے ہوئے کہا۔ "میں غریب اور شریف ماں باپ کی بیٹی ہوں۔"

"غریب اور شریف؟" تھانیدار کی آواز پھر کرخت ہو گئی۔ "بڑی دولت اکٹھی کر لی ہوگی تیری ماں نے!"

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" بختاں نے روتے ہوئے پھر کہا۔ "میری ماں بے قصور ہے۔ تو قرآن لے آ، میں ہاتھ رکھ کر قسم کھاتی ہوں۔ ہم شریف لوگ ہیں۔ ہم نے کبھی اس قسم کی کوئی بات نہیں کی۔ میں خدا کی قسم کھا کر کہتی ہوں۔ میں بے قصور ہوں۔"

"بکواس بند کر۔" تھانیدار کی گرجدار آواز پھر ابھری۔ "تو رنڈی ہے، تیری ماں دلّی ہے۔"

"ہم پر رحم کر۔ میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔ ہم پر رحم کر۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔"

بختاں کی آواز میں نہ جانے کیا تھا کہ میرا جسم زور سے کانپا۔ یہ کپکپاہٹ سردی سے پیدا ہونے والی کپکپاہٹ سے کہیں زیادہ اور مختلف تھی۔

"کتنے عاشق ہیں تیرے؟" تھانیدار کی آواز پھر بدل گئی۔ "بیس تیس تو ہوں گے۔ کتنی دیر سے کر رہی ہے دھندا؟ کتنے روپے لیتی ہے ایک بار کے؟"

"شرم نہیں آتی تجھے؟" بختاں چیخ اٹھی۔ "تیری کوئی بیٹی نہیں ہے؟ کوئی بہن نہیں ہے؟ کیا پوچھ رہا ہے مجھ سے؟ میں نے خدا کی قسم کھائی ہے۔ میں بے قصور ہوں۔ قرآن پر ہاتھ رکھ کر قسم کھانے کے لیے تیار ہوں۔ لے آ قرآن — یہ کیا پوچھ رہا ہے؟" چند لمحے خاموشی سی رہی۔ وقفے وقفے سے بختاں کی سسکیاں ابھریں۔

"بڑی قسمیں سنی ہیں میں نے تیرے جیسی بدکار عورتوں کی۔" تھانیدار کی آواز ابھری۔

"بول، کتنے روپے لگتی ہے؟ بیس، پچیس — یا اس سے بھی زیادہ؟ بول کتنے روپے لگتی ہے ایک باری کے؟ — تیس تو میری جیب میں بھی ہیں۔"

مجھے اس سلسلے میں کچھ زیادہ معلوم نہیں تھا، لیکن فیض لاہوریے نے ایک بار بتایا تھا کہ شہر میں ایک ہیرا منڈی ہے، جہاں رنڈیاں روپے لے کر گاہکوں کو خوش کرتی ہیں۔

"بہت گاہک ہوں گے تیرے۔" تھانیدار یوں بول رہا تھا جیسے دانت پیس رہا ہو۔ "بس ہوں گے ... چل ایک اور سہی ... بول، کتنے روپے؟"

کچھ دیر کے لیے پھر خاموشی سی چھا گئی۔ تب بہتی ہوا کا کوئی تیز جھونکا کارڈیوں کی باڑ سے گزرتا تو سنسناہٹ سی ابھرتی تھی۔

"میرا باپ کالونی کا چوکیدار ہے۔" پہلی بار بختاں کی بہت معصوم آواز آئی۔ "ارے تھانیدار، یہ کالونی کا ... یہ جو پرسوں چور تھانے میں آیا ہے، جو تیری کوٹھڑی میں بند ہے، اسے تیرے سپاہیوں نے نہیں، میرے باپ نے پکڑا ہے۔" بختاں کی معصوم آواز بلند ہو گئی۔

"کل رات تین ڈاکو میرے باپ کے گھر اس کی عزت لوٹنے آئے۔ تیرے سپاہی کہاں تھے؟ تو تو رات سے یہاں تھا، کہاں تھے تیرے سپاہی؟ میرا باپ تو ڈیوٹی پر تھا۔ آج صبح وہ وہاں کے ساتھ تیرے تھانے میں رپٹ لکھوانے کیوں آیا تھا — راکھی بجھ کے ... ڈگرو ویلے[2] تو مجھے پکڑ کر تھانے لے آیا۔ میں تجھے وڈا ابھرا[3] سمجھ کے فریاد کر رہی ہوں اور تو ... میری قیمت لگا رہا ہے۔ میں تیری چھوٹی بہن جیسی ہوں اور تو میری عزت لوٹنا چاہتا ہے۔" ہر جملے کے ساتھ بختاں کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ آخری جملہ تقریباً چیخ بن گیا۔ "عزت لینا چاہتا ہے میری ... عزت لینا چاہتا ہے تو ..." بختاں چیخ رہی تھی۔ "ہاں گھس۔ ہاں گھس۔ ہاں گھس ... "(یہ لے۔ یہ لے۔ یہ لے)" اس کے ساتھ ہی کپڑا پھٹنے کی آواز آئی۔ میرا بدن جھٹکے سے پیچھے ہٹ ...

"ہاں گھس ... تو لوں چا گھس۔" "(یہ لے ... تو لے ...)"

اس کے ساتھ ہی بختاں نے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد ہی تھانیدار برآمدے میں نظر آیا۔ برآمدے کے بلب کے نیچے آتے ہی وردی میں ملبوس چالیس پینتالیس برس

---

2 ڈگرو ویلے: سہ پہر کے وقت۔ 3 وڈا ابھرا: بڑا بھائی۔

سے باہر نکلے۔ تھانیدار کا چہرہ نظر آیا، جس پر بدحواسی طاری تھی۔

”دلاور خان!“ اس نے زور سے کہا۔

”جی ملک صاحب!“ دور سے بوڑھے سپاہی کی آواز سنائی دی اور کچھ ہی دیر بعد وہ بھی برآمدے میں نظر آیا۔ تھانیدار نے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دلاور خان سے کچھ کہا، اتنا آہستہ کہ مجھے ایک لفظ بھی سنائی نہ دیا۔ پھر وہ تیزی سے جیپ کی سمت گیا، جیپ سٹارٹ کی۔ میں کارڈینیا کی باڑ کے پیچھے تقریباً بیٹھ گیا۔ جیپ کی ہیڈ لائٹس جلیں اور وہ تھانے کے بیرونی گیٹ سے بائیں جانب تیزی سے نکل گئی۔ دلاور خان بختاں والے کمرے میں گیا اور کچھ دیر بعد بختاں برآمدے میں نظر آئی۔ دلاور خان اس کے پیچھے برآمدے میں آیا۔ میں باڑ کی ٹہنیوں اور پتوں میں سے بھی بختاں کو اچھی طرح دیکھ رہا تھا۔ اس نے وہی چادر اوڑھ رکھی تھی۔ سر بھی چادر سے ڈھانپا ہوا تھا اور سامنے چھاتی پر ایک ہاتھ سے چادر یوں پکڑی ہوئی تھی، جیسے چادر کے سرکنے سے ڈر رہی ہو۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی اور آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔

”چل... گھر چل۔“ دلاور خان نے کہا۔

”رہنے دے بابا!“ بختاں نے کہا۔ ”چلی جاؤں گی۔“

”پگلی ہو گئی ہے کیا؟“ دلاور بولا۔ ”راستے میں کتے ہوں گے اور سڑک پر کالا ناگ بھی آ سکتا ہے۔ وہ سردیوں میں بھی نکلتے ہیں۔“

بوڑھا سپاہی اور بختاں تھانے کے بیرونی گیٹ کی طرف چلے گئے، اور ان کے گیٹ سے نکلتے ہی میں آہستہ آہستہ باڑ کے ساتھ چلتا ہوا بنگلے کے پاس پہنچا۔ پھر ولی محمد خان صاحب کے بنگلے کے پاس سے ہوتا ہوا اپنے بنگلے کے عقب میں آیا۔ ہوا میں تیزی سی تھی۔ سردی سے میرے دانت بج رہے تھے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے کندھے اوپر کی سمت اٹھے ہوئے ہیں۔ ہاتھ بھی سن ہو چکے تھے۔ بنگلے کا چھوٹا سا عقبی گیٹ کھول کر پھر بند کرنا بھی مشکل محسوس ہوا۔ میں لان سے ہو کر برآمدے میں آیا، پھر غسل خانے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر اندر داخل ہوا۔ غسل خانے میں آتے ہی سردی کم ہونے کا احساس ہوا۔ احتیاط سے میں نے غسل خانے کا دروازہ بند کرتے ہوئے اندر سے چٹخنی لگائی۔ کانپتے بدن کے ساتھ میں نے ڈریسنگ روم کے سامنے آ کر مفلر اور بوٹ اتارے، آہستہ

سے انھیں لٹکایا، وارڈ روب بند کرتے ہوئے میں نے کٹکٹاتے دانتوں پر قابو پانے کی شعوری کوشش تو کی لیکن ناکام .. کمرے میں آ کر میں نے دانت زور سے دبائے، بستر تک پہنچا، اونی ٹوپی اتاری، سویٹر اتارا، جرابیں اتاریں اور لحاف میں دبک گیا۔ دانت اب بھی وقفے وقفے سے کٹکٹانے لگتے تھے۔ کچھ دیر بعد بدن کی کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔

"کیا بختاں گھر پہنچ گئی ہوگی؟" میں نے سوچا۔ "نہیں، ابھی راستے میں ہوگی۔" ایک اندیشے نے سر اٹھایا۔ "کہیں تھانیدار اسے ملکوں کے پاس نہ لے گیا ہو۔" پھر ایک خیال نے اندیشے کو ختم کر دیا۔ "لے جانا ہوتا تو جیپ میں لے کر جاتا ورنہ پھر ..." مجھے بوڑھا دلاور خان جیسے تصور میں سامنے کھڑا نظر آیا۔ "دلاور خان نے بھی کہا تھا کہ چل گھر چل بختاں گھر ہی گئی ہوگی۔"

بستر جیسے جیسے گرم ہو رہا تھا، مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

"بختاں گھر والوں کو سب کچھ بتا دے گی،" میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے سوچا۔ "ماں سے تو کچھ نہیں چھپائے گی۔" پھر سب خیالات، سب احساسات کو نیند نے لپیٹ لیا۔

صبح جب میں سکول پہنچا تو شور مچا ہوا تھا۔ کھوڑ گاؤں کے لڑکے ہاتھ ہلا ہلا کر، چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ تھانیدار سویرے سویرے سپاہی محمد حسین کے ساتھ کھوڑ گاؤں پہنچا، جیپ گاؤں کے باہر کھڑی کی اور اس نے ملک محمد نواز، ملک محمد جہانگیر اور ملک محمد شریف کو گرفتار کر لیا ہے۔

"ہتھکڑیاں لگا کے لے گیا ہے حرام توپوں[4] کو،" ایک لڑکے نے کہا۔

"کسی کی نہیں سنی،" دوسرا بولا۔

"تھانے لے گیا ہے،" تیسرے نے بتایا۔

"وہ ملکوں کے بیٹے ہیں،" ایک تنگ ماتھے والے گہرے سانولے لڑکے نے کہا، "دیکھ لینا، شام تک چھوٹ جائیں گے۔"

"مت چھوٹے" توپ گالی دینے والے لڑکے نے کہا۔ "اب نہیں چھوڑے گا، بہت غصے میں تھا۔"

---

[4] حرام توپ، شمالی پنجاب کے فوجی گھرانوں کی مخصوص گالی۔

ارشاد دونوں بازو ہلاتا ہوا سب کے سامنے آیا۔

"چھوٹ نہ جائیں گے کہیں بھی—" اس نے گندی گالی دی۔ "یہاں ہی سے گزریں گے۔" اس نے سکول کے سامنے کھوڑ گاؤں جانے والی کچی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ "تم سب میرے ساتھ رہنا۔" اس نے نوری فرشتے کی طرف دیکھا۔ "تو بھی— مار مار کے ان کی ہڈیاں توڑ دیں گے۔"

انھوٹی گھبرا کر سامنے آیا۔

"نہیں نہیں" وہ تیزی سے بولا۔ "کوئی ضرورت نہیں۔ کل تو کہہ رہے تھے کہ حوالدار کی پکڑ سے کوئی مجرم نہیں بچ سکتا... کوئی ضرورت نہیں... تمھیں بدمعاشوں سے لڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" انھوٹی نے لفظ بدمعاشوں پر زور دے کر کہا اور بہت دنوں سے خاموش رہنے والے فیقی لاہوریے میں بھی جان سی پڑ گئی۔

"سب کچھ اگلوا لے گا حوالدار۔" فیقی لاہوریے کی آواز سن کر سب لڑکوں کے چہرے اسی کی طرف مڑ گئے۔ "بڑے طریقے ہوتے ہیں پولیس والوں کے پاس۔ ہزار واٹ کا بلب جلا کر آنکھوں کے سامنے رکھتے ہیں۔ سونے نہیں دیتے۔ الٹا لٹکا کر ہنٹر سے کھال اتار دیتے ہیں اور پھر برف کے بلاک پر لٹاتے ہیں... لٹکا..." فیقی لاہوریے نے خوفزدہ سی آواز میں آخری جملہ سرگوشی کے انداز میں کہا اور کچھ لڑکے سہم گئے۔

"پر یہ ہو کیسے؟" نوری فرشتہ بازو ہلاتے ہوئے بولا۔ "کس کے حکم پر ہوا ہے یہ سب کچھ؟"

نوری فرشتے کا یہ سوال سن کر سب اسے حیرت سے دیکھنے لگے۔ انھیں یقین نہیں ہو رہا تھا کہ نوری فرشتہ اس قدر عقلمندی کا سوال کر سکتا ہے۔ وہ یوں نوری فرشتے کو دیکھ رہے تھے جیسے پہلی بار انھیں نوری فرشتے کی اہمیت کا احساس ہوا ہو۔ کسی کو کوئی جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ پھر کھوڑ گاؤں کے ایک دبے پتلے لڑکے نے نوری فرشتے کے سامنے آ کر اس کی آنکھوں میں سیدھا دیکھا۔

"کوئی بڑی ہستی ہی ہوگی۔" اس نے مقامی زبان والے لہجے کی لوچ کے ساتھ کہا۔ "سوچ سے بھی بڑی۔"

خالد طور

انتظارِ خواب

1

ایرک رابنسن دل کا مریض تھا۔ اس پر مستزاد بے خوابی کا عارضہ تھا جس میں وہ گزشتہ پندرہ بیس برسوں سے مبتلا تھا۔ کوئی رات ایسی نہ تھی کہ وہ صبح چار بجے سے پہلے سو جاتا ہو۔ وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ دراز قد، گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر اس کی ناک پتلی تھی۔ اسے کبھی اس حقیقت پر یقین نہیں ہوا کرتا تھا کہ وہ دل کا مریض ہے۔

"میں تو دبلا پتلا ہوں،" وہ اکثر سوچا کرتا تھا، "غذا بھی سادہ کھاتا ہوں، ڈاکٹر لوگ نہ جانے کیوں مجھے دل کا مریض کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے، مجھے دل کی جگہ پر درد ہوتا ہے۔ یہ درد گیسوں کی وجہ سے بھی تو ہو سکتا ہے۔ ضروری تو نہیں کہ انجائنا ہی کا ہو۔ سینے اور بازو کے پٹھوں کا بھی ہو سکتا ہے۔"

وہ بے یقینی پر ہمیشہ قائم تھا اور شاید یہی وجہ تھی کہ ڈسکہ[1] کے پرائمری سکول میں ریاضی کے ٹیچر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ تک وہ بھلا چنگا رہا۔ اس کے بال سفید ہو چکے تھے لیکن اب بھی گھنے تھے۔ اس کی بھنویں، اس کی آنکھوں پر بہت گھنی تھیں۔ اس کی بیوی اس کی ہم عمر تھی۔ دبلی پتلی، درمیانے قد کی، سانولی، گول چہرے اور چھوٹی چھوٹی آنکھوں والی سوزن اکثر اپنے بالوں کو، سفید بالوں کو، اپنے دوپٹے سے باندھے رکھتی تھی۔ وہ آدھے سر کے درد میں پچھلے دس برسوں سے مبتلا تھی۔ سیدھی سادی، شوہر سے بہت محبت کرنے والی سوزن اکثر ایرک کی بیماری سے متعلق پریشان رہتی تھی۔

---

[1] ڈسکہ سیالکوٹ جانے والی سڑک پر عیسائیوں کی اکثریت والی بستی ہے۔

Scanned with CamScanner

"سوزن!" ایرک نے اپنی ریٹائرمنٹ کے دن بیوی سے کہا۔ "ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں۔ دیکھو میں نے اپنی سروس مکمل کر لی ہے۔"

ایرک کا ایک ہی بیٹا تھا، پیٹر ایرک۔ وہ سیالکوٹ سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور کے وائی ایم سی اے انسٹیٹیوٹ میں الیکٹریشن کا ڈپلومہ حاصل کرنے کے لیے زیر تعلیم تھا۔ پیٹر اپنے چچا سیموئیل رابنسن کے پاس لاہور میں سرکاری ملازموں کے لیے بنائے گئے چوبرجی کوارٹرز میں رہتا تھا۔ سیموئیل پڑھا لکھا نہیں تھا لیکن بے حد ہوشیار شخص تھا۔ وہ برسوں پہلے خاکروب کی حیثیت سے لاہور میونسپل کارپوریشن میں ملازم ہوا تھا۔ پھر اس نے کارپوریشن کے پبلک ریلیشنز افسر تک رسائی حاصل کی۔ پی آر او کی سفارش پر وہ لاہور کے میئر کے گھر کی صفائی کرنے لگا، اور پھر میئر کی بیوی کی سفارش پر کارپوریشن کے تمام خاکروبوں کے انچارج کا اسسٹنٹ بن گیا۔ وہ اس قدر چاپلوس تھا کہ اس کے ماتحت کام کرنے والے تمام خاکروب اس کی میٹھی میٹھی باتوں کی وجہ سے اس کے گرویدہ ہو گئے۔ وہ اس کی بات پر کبھی 'نا' نہیں کہتے تھے۔ رفتہ رفتہ وہ ان کا لیڈر بن گیا۔ میئر کی سفارش پر اسے چوبرجی کوارٹرز میں دو کمروں کا کوارٹر بھی مل گیا۔ اس نے کوارٹر کے صحن میں ایک اور کمرہ بنوا لیا جس کی اجازت نہیں تھی، اور کمال یہ کہ سارے اخراجات بھی کارپوریشن سے وصول کیے۔ پیٹر اسی کمرے میں رہتا تھا۔ سیموئیل کی ایک بیٹی اور ایک بیٹا تھا۔ سانولی، معمولی خدوخال، مگر سمارٹ سی اس کی بڑی بیٹی تھی جس نے میٹرک کے بعد نرسنگ کا کورس مکمل کیا اور لاہور کے ایک مشن ہسپتال میں تعینات ہو گئی۔

سیموئیل بھی اپنے بھائی ایرک کی طرح گہرے سانولے رنگ کا تھا۔ اس کے چہرے کے نقوش بڑے بھائی سے ملتے جلتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ قد کا قدرے چھوٹا اور موٹا تھا۔ اس کے سر کے بال اڑ چکے تھے لیکن سر کی دونوں جانب سفید بالوں کو رنگنا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ لاہور کی ایک ہاؤسنگ اسکیم میں پانچ مرلے کا پلاٹ لے کر وہ اس پر مکان بنوا رہا تھا۔ اس کی ریٹائرمنٹ میں تین سال باقی تھے۔ سیموئیل کی بیوی ربل چھوٹے قد کی موٹی عورت تھی، سیموئیل ہی کی طرح گہری سانولی۔ وہ بھی سیموئیل کی طرح اپنے سفید بال رنگتی رہتی تھی۔

ایرک رابنسن نے زندگی میں بہت سی غلطیاں کی تھیں لیکن ڈسکہ میں پہلا آبائی گھر بیچ کر

لاہور آ جانا اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی محسوس ہوا کرتی تھی۔ ناسک میں اس کا گھر کھلے سرسبز کھیتوں کے سامنے تھا۔ لاہور کی بستی کرشن نگر میں سیموئیل نے اسے اڑھائی مرلے کا دو کمروں والا مکان خرید دیا۔ سوزن آبائی گھر فروخت کرنے پر تیار نہیں تھی لیکن ایرک کو اس کے بھائی نے زبردست ترغیب دی۔

''بڑا ذرخیز ہے میرا،'' سیموئیل نے ایرک سے کہا۔ ''میئر میری ہر بات مانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میرے ایک اشارے پر کارپوریشن کے ورکرز کام چھوڑ سکتے ہیں اور لاہور شہر میں گندگی ہی گندگی پھیل جائے گی۔ میں ڈپٹو ملتے ہی پیٹر کو واپڈا میں ملازمت لے دوں گا۔ پیٹر کی نوکری پکی سمجھ۔ بیٹے کے ساتھ رہے گا تو تیری دیکھ بھال بھی اچھی طرح ہوتی رہے گی۔''

''مجھے کچھ نہیں ہوا،'' ایرک نے کہا۔ اسے اپنی دل کی بیماری کا یقین ہی نہیں تھا لیکن جب اس کے بیٹے نے بھی چچا ہی کا ساتھ دیا تو وہ مان گیا۔ سیموئیل آبائی گھر بیچ کر اپنا حصہ لینا چاہتا تھا۔ پھر وہ اپنی معمولی خدوخال والی بیٹی کے لیے پیٹر کا رشتہ بھی چاہتا تھا۔ پیٹر اگر خوبصورت نہیں تو بدصورت بھی نہیں تھا۔ موٹی سانولی مارگریٹ بھی پیٹر کو چاہتی تھی اور سیموئیل یہ بات اچھی طرح جانتا تھا۔

لاہور کے علاقے کرشن نگر میں جو مکان سیموئیل نے بھائی کے لیے خریدا تھا وہ بڑا اچھی جگہ پر تھا۔ سامنے بچوں کے لیے پارک بنا ہوا تھا لیکن پارک میں نہ کوئی درخت تھا نہ پودا، یہاں تک کہ گھاس بھی نہیں تھی۔ محلے کے لڑکوں نے پارک کو گراؤنڈ میں تبدیل کر دیا تھا۔ وسط میں کرکٹ کھیلنے کے لیے پچ بنائی گئی۔ مکان میں آگے پیچھے دو کمرے تھے۔ پچھلا کمرہ ایک چھوٹے سے برآمدے میں کھلتا تھا اور برآمدے کے آگے چھوٹا سا صحن بھی تھا۔ برآمدے کے ساتھ باورچی خانہ تھا اور صحن میں غسل خانہ اور بیت الخلا۔ صحن میں دائیں جانب چھت پر جانے والی سیڑھیاں تھیں۔

''ذرا استحکام ہو جائیں'' سیموئیل نے ایرک سے کہا، ''بیٹے کی ملازمت شروع ہو جائے تو اوپر ایک یونٹ بنوا لینا۔ ایک کمرہ، ملحقہ باتھ اور باورچی خانہ۔''

ایرک بھائی کی ہر بات مانتا تھا۔ وہ مستقبل کے تصور میں اپنے چھوٹے سے خاندان کو دیکھنے لگا جس میں وہ، سوزن، پیٹر اور اس کی بیوی اور پوتے پوتیاں شامل تھیں۔ ایرک نے سوزن کی معمولی سی مزاحمت کے بعد گھر بیچا تھا۔ جس دن وہ ٹرک پر سامان لادے سوزن کے ساتھ نئے گھر میں آیا تو

Scanned with CamScanner

بہت خوش تھا لیکن شام سے پہلے پہلے پڑوس سے ایک عورت کی بلند آواز سنائی دی۔

'' اوہ نویں آئے چوہڑے آ گئے نیں، رب خیر کرے '' (پڑوس میں چوہڑے آ گئے ہیں، رب خیر کرے۔)

ایرک پر مایوسی چھا گئی۔ وہ ڈسکہ میں ایک باعزت شخص تھا۔ قصور کے بڑے چرچ کے کوائر (choir) میں اس کی موجودگی لازمی سمجھی جاتی تھی۔ سکول میں ہر کوئی اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ محلے کے لوگ کسی بھی معاملے میں اس کی رائے کو سب سے زیادہ اہمیت دیا کرتے تھے۔ وہ بیوی سے بدحال ہو گیا۔ سوزن نے اسے سمجھایا کہ نئی جگہ ہے، نئی باتیں تو ہوں گی۔

'' تو دیکھنا ایرک،'' سوزن نے کہا، '' یہی لوگ تیری عزت کریں گے۔''

ایرک کے اس نئے مکان میں صرف ایک ہی چھت کا پنکھا تھا، سامنے والے کمرے میں۔ ایرک پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ مسلسل چھت کے پنکھے کو دیکھ رہا تھا جہاں پنکھے کے قریب ہی چھت پر ایک چھپکلی چپکی ہوئی تھی۔ سوزن کی پیشگوئی درست ثابت ہوئی۔ ایرک کی شرافت دیکھ کر اور بطور واپڈا میں لائن مین کی نوکری مل جانے کے بعد محلے کے لوگ اس کی عزت کرنے لگے۔ سوزن نے بھی ڈیوٹی اسی علاقے میں لگوا لی تھی۔ ایرک بہت کم گھر سے نکلتا تھا۔ کھانے پینے کا سامان لانا، جمعہ اتوار کو مال روڈ کے کیتھیڈرل جا کر عبادت کرنا، سوزن کے مجبور کرنے پر سرکاری ہسپتال کے ڈاکٹر سے ملنا، بس یہی اس کی زندگی تھی۔ محلے میں سب اسے خدا ترس کہنے لگے تھے اور رمضان کے مہینے کے بعد جب عید آئی تو پہلے ہی دن علاقے بھر کے پڑوسیوں نے سویوں کی تھالیاں بھجوا دیں۔ اس کے باوجود ایرک کو ڈسکہ چھوڑنے کا غم تھا، اور یہ غم اسے اپنے ذہن کی چھت پر چھپکلی کی طرح چپکا محسوس ہوا کرتا تھا۔ اسے ڈسکہ میں پرانا صحن بہت یاد آیا کرتا تھا۔ وہ اپنے صحن کی ایک ایک اینٹ سے بہت محبت کیا کرتا تھا۔ یہ محبت اب بھی اس کے دل میں تھی۔ صحن کی بیرونی دیوار کے ساتھ ہی کھیتوں کا سلسلہ شروع ہوتا تھا۔ انہی سرسبز کھیتوں کے سامنے اس کا آبائی مکان بھی تھا۔

ایرک کو کھیتوں سے آتی ہوئی ہوا میں دھان کی خوشبو بہت اچھی لگتی تھی۔ ملک بھر میں سب سے بہترین چاول اسی علاقے میں پیدا ہوتے ہیں۔ ایرک ہر صبح سیر کو جاتا تو اسے کھیتوں کے کنارے ٹھہر کر دھان کی خوشبو سے حاصل ہونے والے فرحت انگیز احساس میں کھو جایا کرتا تھا۔ وہ اس

خوشبو زندگی کی خوشبو کہا کرتا تھا۔ ایرک بہترین گویا بھی تھا۔ بچوں کو پہاڑے یاد کراتے ہوئے وہ خود بھی گانے لگتا تھا: "ایک دونی دونی، دو دونی چار، تین دونی چھ، چار دونی آٹھ..." وہ اکثر اپنا ہارمونیم سکول میں لا کر بچوں کو گیت اور نظمیں سنایا کرتا تھا۔ اس کی طبیعت میں غیر معمولی برداشت بھی تھی۔ بچے اسے بہت چاہتے تھے۔ ریاضی جیسے خشک مضمون کو وہ اس انداز میں پڑھایا کرتا تھا کہ اس کی کلاس میں حاضری سو فیصد رہتی تھی۔ اگر کوئی بچہ بیمار ہو جاتا تھا تو وہ اسے ملنے اس کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔ اب اس کے پاس یادوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سوزن نے اس کا ہارمونیم پڑچھتی[2] پر رکھ دیا تھا، جس پر مٹی کی تہہ جم چکی تھی۔

2

اتوار کے روز کتھیڈرل میں عبادت کے بعد سیموئیل نے ایرک کا ہاتھ پکڑا۔

"پیٹر کی نوکری لگ گئی ہے،" سیموئیل نے کہا۔ "کیا سوچا ہے تو نے؟ اس کا گھر بسائے گا کہ نہیں؟" ایرک فوراً سمجھ گیا۔ اس نے سیدھا بھائی کی آنکھوں میں دیکھا۔

"اگر تیرا اشارہ مارگریٹ کی طرف ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، اور سوزن کو بھی نہ ہوگا۔ مارگریٹ ہماری اپنی بچی ہے۔"

سیموئیل کا چہرہ خوشی کے تاثرات سے بھر گیا اور وہ اسی شام مٹھائی کا ڈبہ لے کر ایرک کے گھر پہنچ گیا۔

سردیوں میں ایرک خشک کھانسی کے مرض میں مبتلا ہو گیا۔

"تو جو مجھے ابھی تک گولیاں کھلاتی رہتی ہے،" ایرک نے کھانستے ہوئے سوزن سے کہا، "انھوں نے میری چھاتی خشک کر دی ہے۔" وہ اداس سا تھا۔ "یہ شہر کا دھواں، گھٹا گھٹا سا ماحول۔ میری جان چلی جائے گی۔ کاش میں ڈنسک نہ چھوڑتا۔ بہت بڑی غلطی ہوگئی مجھ سے۔"

"بڑھاپے میں سبھی کو کوئی نہ کوئی بیماری لگ ہی جاتی ہے،" سوزن نے کہا۔ "مجھے دیکھ، دس برسوں سے سر درد سے مر رہی ہوں۔ تو نے جو بھی کیا ہے ٹھیک ہی کیا ہے۔"

---

[2] کمرے کی اندرونی چھت کے نیچے پتھری چھت جس پر صندوق، لحاف اور دیگر سامان رکھا جاتا ہے۔

سوزن کسی کی پروا کیے بنا کوئی بات نہ کہتی تھی جس سے صدمہ پہنچے۔ وہ ہمیشہ ایرک کو تسلیاں دیتی رہتی تھی، لیکن ایرک کو اس کے لہجے میں بناوٹ کا احساس ہو جایا کرتا تھا۔

"کیوں جھوٹ بولتی ہے،" وہ سوزن سے کہا کرتا تھا۔ "میں جانتا ہوں، تو یہاں خوش نہیں ہے۔"

کرسمس پر بیمونیل نے ایرک، سوزن اور پیٹر کو تحفے دیے۔

ایرک بہت کم شراب پیتا تھا۔ ایسٹر اور کرسمس کے علاوہ وہ کبھی کبھار ہی وسکی کا ایک پیگ پیا کرتا تھا۔ اس رات ایرک نے وسکی کے تین پیگ پیے اور وہ بھی سوڈا ملائے بغیر۔ وہ بار بار کھانس رہا تھا۔

"جانی، یاد ہے تجھے،" ایرک نے بیمونیل سے کہا، "ماں کرسمس پر کیا کیا کرتی تھی؟"

"میں بتاتی ہوں،" سونی رانی نے فوراً کہا، "دیسی گھی میں دیسی مرغا روسٹ کیا کرتی تھی۔"

"تجھے ابھی تک یاد ہے؟" سوزن نے کہا۔

"یاد کیسے نہیں باجی،" رانی نے ہنستے ہوئے کہا، "مارگریٹ نے آج دیسی گھی میں دیسی مرغا روسٹ کیا ہے۔"

"او تیری خیر ہو،" ایرک خوشی سے بولا، "جی خوش کر دیا۔"

ڈنر کے بعد پیٹر اور مارگریٹ گھومنے پھرنے چلے گئے۔ ایرک، بیمونیل، سوزن اور رانی نے ان کی شادی مارچ کے مہینے میں طے کر دی۔

اپنی معمولی سی پنشن کے باوجود ایرک نے پیٹر کی شادی دھوم دھام سے کرنے کا فیصلہ کیا۔ محکمہ تعلیم کی طرف سے اسے گریجویٹی کے ایک لاکھ روپے ملے تھے جو اس نے قومی بچت اسکیم میں رکھوا دیے تھے۔ وہاں سے اسے ہر ماہ نو سو روپے مل جایا کرتے تھے۔ اس نے سوزن کی پریشانی کے باوجود اس میں سے پچاس ہزار روپے نکلوا لیے۔ مارچ میں پیٹر کی شادی مارگریٹ سے ہوگئی۔ ایرک نے سارا گھر جھنڈیوں اور برقی قمقموں سے سجایا۔ سوزن نے پچھلے والے کمرے میں جھنڈیاں لگائیں، پلنگ پر نئی چادر بچھائی، تکیے لگائے اور گلاب کی پتیاں چادر پر بکھیر دیں۔ وہ بہت خوش تھی، لیکن بیمونیل نے پہلے ہی سے ملتان روڈ کے ایک ہوٹل میں پیٹر اور مارگریٹ کے لیے ایک کمرہ بک کرا رکھا تھا۔

Scanned with CamScanner

پیٹر اپنی سفید جوڑے میں ملبوس دلہن کے ساتھ چرچ سے سیدھا ہوٹل میں چلا گیا۔

سوزن رونے لگی لیکن ایرک نے اسے سمجھایا۔

"آج ان کی پہلی رات ہے سوزن۔ یہاں دو ہی کمرے ہیں۔ میں جانتا ہوں، تو نے بڑے چاؤ سے ان کے لیے کمرہ سجایا ہے، لیکن شاید وہ یہاں اتنے خوش نہ ہوتے جتنا وہ ہوٹل میں ہوں گے۔"

سیدھی سادی سوزن نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔ اگلی صبح پیٹر اور مارگریٹ آئے تو سوزن نے مارگریٹ کو گلے لگایا، ماتھا چوما۔ بہت پیار سے ان کا ناشتہ تیار کیا اور لنچ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئی۔ کھانے کے بعد پیٹر نے کہا:

"ماں ہم آج شام ہی ہنی مون پر ہل اسٹیشن جا رہے ہیں۔ چاچا جی نے ہمارے لیے مری میں کمرہ بک کر دیا ہے، تین دنوں کے لیے۔"

چوتھے روز وہ دونوں واپس لاہور پہنچ گئے۔

مارگریٹ بہت خوش تھی۔ رات کو وہ پنکھے والے کمرے میں پیٹر کے ساتھ اور سوزن، ایرک کے ساتھ صحن میں سوئی۔ ایرک کو رہ رہ کر کھانسی آ رہی تھی۔ اگلی صبح جب ایرک اٹھا تو پیٹر نے اس کے سامنے بیٹھ کر کہا:

"بابا، میں جلدی ہی ٹیبل فین یا پیڈسٹل فین خرید دوں گا۔" اس نے سوزن کی طرف دیکھا۔

"یہ وعدہ تو تو پچھلے چھ ماہ سے کر رہا ہے پیٹر،" سوزن نے کہا۔

"کیا کروں ماں،" پیٹر نے کہا۔ "شادی اور سیر سپاٹے میں میری اور مارگریٹ کی ساری بچت ختم ہو گئی ہے۔ پر تو فکر نہ کر، جلد ہی انتظام کر دوں گا۔ پھر تو اور بابا چھت پر سو جایا کرنا۔"

"رہنے دے،" ایرک نے کہا، "دو پنکھوں سے بجلی کا بل بڑھ جائے گا۔"

"نہیں بڑھے گا بابا!" پیٹر نے کہا، "میں کس لیے ہوں۔ بیس پچیس روپے سے زیادہ بل آئے تو مجھے کہنا۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" ایرک نے کہا اور سوزن اٹھ کر باورچی خانے میں جانے کے لیے برآمدے میں چلی گئی۔

Scanned with CamScanner

"ہو کیوں نہیں سکتا؟" پیٹر نے کہا۔ "دن میں ہوں اس علاقے کا۔ میٹر وِنمبر کر دوں گا۔ نہ میٹر تیز چلے گا نہ بل آئے گا۔"

"کیا؟" ایرک نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "چوری کروں گا میں؟"

"او ہو!" پیٹر نے کہا۔ "سبھی کرتے ہیں۔ میں نے چاچے کا میٹر بھی وہاں سے دن میں سے ہیر کر نمبر کرا دیا ہے۔ ریکنڈیشنر بھی چلے گا تو بھی بل سو روپے ہی آئے گا۔"

"تو یہ کام کرتا ہے؟" ایرک نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

"اس میں حرج ہی کیا ہے؟" پیٹر نے کہا۔ "سبھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ تنخواہ میں کہاں گزر ہوتا ہے!"

ایرک کی آنکھیں پھٹی پھٹی سی تھیں۔

"تو چوری کرتا ہے؟" ایرک نے کہا۔ "کیا نہیں جانتا کہ چور اور چوری کرانے والے برابر ہوتے ہیں؟ کیا تو نے بائبل میں نہیں پڑھا کہ چور آٹھویں حکم کا توڑنے والا ہوتا ہے؟ اور تو یہ نہیں جانتا کہ خداوند ہم سے انصاف، راستی اور صداقت چاہتا ہے؟ ۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ میں مر کر جب خداوند کے سامنے جاؤں تو میرے چہرے پر چور ہونے کی کالک ملی ہو؟"

پیٹر، جس نے کبھی بائبل کھول کر بھی نہ دیکھی تھی، بپھر گیا۔

"کیا ساری ایمانداری ہمارے لیے ہی رہ گئی ہے؟" اس کی آواز بلند ہو گئی۔ "مسلمان جو جی چاہے کریں اور ہم بائبل کو سینے سے لگائے ان کا منہ دیکھتے رہیں؟ اسی محلے میں کئی گھروں کے میٹر نمبر ڈ ہیں۔ اور ... رہی حکومت تو اس نے کون سے ہمارے گھر دانے ڈال رکھے ہیں۔ ہم"

سوزن برآمدے سے کمرے میں آئی اور پیٹر خاموش ہو گیا۔

"ہم ایسا کچھ نہیں کریں گے،" سوزن نے کہا۔ اس نے بیٹے کی سب باتیں سن لی تھیں۔ پیٹر غصے سے اٹھا اور بڑبڑاتا باہر چلا گیا۔ مارگریٹ سویرے سویرے اسپتال چلی جاتی تھی۔ رات کی شفٹ کے دنوں میں وہ دوپہر دو بجے تک سوئی رہتی تھی۔ سارا کام کاج بوڑھی سوزن ہی کو کرنا پڑتا تھا۔ مارگریٹ دن کی شفٹ کے دنوں میں رات کے وقت بہت بیزار رہتی تھی۔

"ایسے کب تک چلے گا ڈیر؟" ایک رات اس نے پیٹر کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے

کہا۔ ''تایا جی کی جھڑکیوں سے میں تنگ آ گئی ہوں۔''

پیٹر کو یوں لگا جیسے مارگریٹ نے اس کے دل کی بات کہہ دی ہو۔ وہ اپنی حسیاتی زندگی کے لمحوں کو بار بار برباد ہوتے دیکھ کر نالاں رہتا تھا۔

''تم فکر نہ کرو۔'' اس نے کہا ''بہت جلدی میں کرائے کے مکان کا انتظام کر لوں گا۔ کام کاج والی بھی رکھ لیں گے۔''

مارگریٹ شاید اسی جملے کی ہی منتظر تھی۔ اگلے ہی دن اس نے باپ سے بات کی اور چند روز کے بعد ہی سرکاری کوارٹرز میں سے ایک خالی ہونے والا کوارٹر پیٹر کے نام ہو گیا۔ پیٹر اور مارگریٹ کوارٹر میں شفٹ ہو گئے۔ ایرک اور سوزن انھیں جاتا دیکھتے رہے۔ ان کی زبان سے ایک لفظ بھی نہ نکلا۔

پیسے کمانے کی ہوس میں پیٹر بہت بدعنوان لائن میں بن چکا تھا۔ وہ جس گھر کا میٹر فٹ کرتا وہاں سے ایک سو پچیس روپے ماہانہ لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے ایک اور سلسلہ شروع کر دیا۔ اس کے علاقے میں کئی محلے تھے۔ ان محلوں کے لڑکے اکثر گرمیوں میں رات کو پارکوں اور گراؤنڈوں میں فلڈ لائٹس لگوا کر کرکٹ میچ کھیلا کرتے تھے۔ پیٹر ایک سو روپے لے کر انھیں اجازت دے دیا کرتا تھا۔ وہ خود ہی لڑکوں کو فلڈ لائٹس لگا دیا کرتا تھا۔

جون کی ایک تپتی دوپہر میں ایرک کے محلے والے لڑکے پیٹر سے ملے۔ وہ رات کو ایرک کے گھر کے سامنے پارک میں کرکٹ کھیلنا چاہتے تھے۔ پیٹر نے سو روپے لے کر انھیں فلڈ لائٹس لگانے کے لیے کنڈیاں تاروں پر ڈال دیں اور سوئچ لگاتے ہوئے کہا کہ میچ رات گیارہ بجے کے بعد شروع کریں۔

ایرک کی طبیعت کئی دنوں سے ناساز تھی۔ اسے وقفے وقفے سے سینے میں دل کے قریب درد محسوس ہوتا تھا جو اٹھ کر لہریں بناتا ہوا بائیں کندھے سے ہو کر بازو کی سمت جاتا تھا۔ سوزن دوا لائی تو اس نے اپنے ہاتھ سے سوزن کا ہاتھ پرے کر دیا۔

''رہنے دو سوزن۔'' ایرک نے کہا۔ ''بس کرو... دوائی بے اثر ہو چکی ہے۔''

اس نے پہلی بار لاشعوری طور پر اپنی بیماری کو تسلیم کر لیا۔ وہ دونوں پارک کے سامنے والے

Scanned with CamScanner

کمرے میں تھے۔ ایرک پلنگ پر اور سوزن بان کی چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ بان کی ایک چارپائی صحن میں تھی۔ رنگین پایوں والی یہ چارپائیاں سوزن نے بڑے شوق سے دس سال پہلے خریدی تھیں۔ سوزن نے پارک کی طرف کھلنے والی کھڑکی ہوا کے لیے کھول رکھی تھی۔ اس نے پیلے پرانے دوپٹے کی کتروں سے پردے بنا کر کھڑکی پر لٹکا رکھے تھے۔ گرمی بہت زیادہ تھی۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ سورج اوپر سے لو نیچے پھینک رہا ہو۔

ایرک کو ڈسکہ یاد آ رہا تھا۔ ڈسکہ میں وہ مچھر دانیاں لگا کر چھت پر سویا کرتے تھے۔ دن چاہے جتنا بھی گرم ہوتا، رات ٹھنڈی ہو جایا کرتی تھی۔ ایرک کو دھان کے کھیتوں سے آنے والی خنک ہوا یاد آ گئی۔ ایرک بے خوابی کی کیفیت میں بھی ٹھنڈی خوشبودار ہوا سے بہت سکون محسوس کیا کرتا تھا۔

"سوزن!" اس نے کہا، "میں بچپن، لڑکپن اور جوانی کے خواب بھول چکا ہوں۔ مجھے اب یہ بھی یاد نہیں کہ خواب کیسا ہوتا ہے۔"

سوزن نے مڑ کر اسے دیکھا۔ "تو سوئے گا تو خواب دیکھے گا۔" سوزن نے کہا۔ "نیند کے بغیر خواب کیسے آ سکتا ہے؟"

"تو تو ایسے کہہ رہی ہے،" ایرک ہنسا، "جیسے نیند میرے اختیار میں ہو۔"

رات کے ساڑھے گیارہ بجے فلڈ لائٹس آن ہو گئیں تو کمرہ دن کی طرح روشن ہو گیا۔ باہر گراؤنڈ میں ٹاس ہو رہا تھا۔ سوزن گھبرا گئی۔ دوپٹے سے بنا ہوا پردہ روشنی روکنے میں ناکام تھا۔ باہر فیلڈنگ کے لیے لڑکوں نے پوزیشنیں سنبھالنی شروع کر دی تھیں۔ شور سا مچا ہوا تھا۔ سوزن رہ نہ سکی، دروازہ کھول کر باہر نکلی۔

"لائٹ کا منہ دوسری طرف کرو،" اس نے قریب کھڑے دو لڑکوں سے کہا۔ "کھڑکی سے پرے ہٹاؤ۔ سارا کمرہ دن بنا دیا ہے۔"

ایک گورے چٹے چوڑے منہ والے لڑکے نے، جو پوزیشن سنبھالنے دوسری سمت جا رہا تھا، مڑ کر سوزن کو دیکھا۔

"تو نے کھڑکی میں بیٹھ کر منتری کر لی ہے مائی؟" اس نے بدتمیزی سے کہا، "بند کر دے۔"

سوزن واپس کمرے میں آ گئی۔ پچھلے کمرے کی سمت گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں

موٹا سا کھیس تھا۔ سوزن نے کھیس کھڑکی کے اوپر لگی کیلوں پر لٹکا دیا۔ روشنی تو کم ہو گئی لیکن، ہر لڑکوں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔

''چھکا۔'' ''بیرونی دروازے پر گیند آ کے لگی۔

''تیرا بیڑا غرق ہو۔'' سوزن نے بے اختیار کہا۔

وہ باہر جانے لگی تو ایرک نے اسے روکا۔

''وہ تیری کوئی بات نہیں سنیں گے۔'' ایرک نے آہستہ سے کہا۔ ''رہنے دے۔''

اس سے پہلے کہ سوزن کوئی جواب دیتی، گیند پھر ''کر'' دروازے سے لگی۔ دھماکا سا ہوا، ایرک کے بدن کو جھٹکا سا لگا۔ سوزن غصے میں باہر نکلی۔

''شرم نہیں آتی تم لوگوں کو؟'' وہ بلند آواز میں بولی۔ ''اندر پیٹر کا باپ بیمار ہے، کیا سونے بھی نہ دو گے؟''

ایک دو لڑکوں نے مڑ کر دیکھا۔ قریب فیلڈنگ کرنے والا لڑکا سوزن کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ ''بیمار ہے تو ہم کیا کریں؟'' اس نے کہا۔ ''میچ نہ کھیلیں؟ اسے چھت پہ لے جا۔ باقی سب لوگ بھی تو چھتوں پر سوئے ہوئے ہیں۔''

''وہ سیڑھیاں نہیں چڑھ سکتا۔'' سوزن نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''تو ہم کیا کریں؟ ہسپتال لے جا۔'' لڑکے نے درشتی سے کہا۔ ''میچ تو ہم کھیلیں گے۔ سو روپے لیے ہیں تیرے بیٹے نے فلڈ لائٹس لگانے کے۔''

سوزن بے اختیار دو قدم پیچھے ہٹی اور دوبارہ کی ہو کر کمرے میں آ گئی۔ اس نے ایرک سے کچھ نہ کہا۔ باہر صحن میں گئی اور پھر واپس کمرے میں آئی۔ اس نے کمرے میں بچھی چارپائی اٹھائی۔

''میں نیچے سو جاؤں گی۔'' سوزن نے کہا۔

''کیا کرنے لگی ہے؟'' ایرک نے کہا، لیکن سوزن نے جواب دیے بغیر باہر کا دروازہ کھولا اور چارپائی عمودی انداز میں دروازے کے سامنے کھڑی کر دی۔ چند لڑکے یہ دیکھ کر ہنسے۔ کچھ دیر بعد گیند آ کر چارپائی کے بان پر لگی۔ دھب کی آواز آئی۔ سوزن نے دروازے کی طرف دیکھا۔

''کیوں جان کھپاتی ہے؟'' ایرک نے کہا۔ ''وہ نہیں مانیں گے۔''

Scanned with CamScanner

وقت گزر رہا تھا۔ گیند کئی بار ان کی چارپائی پر آکر گری لیکن اماں کی آواز بند ہو گئی تھی لڑکے بہت زیادہ شور مچا رہے تھے۔ یہ شور ایرک اور سوزن کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ پڑوسی اور دوسرے جن کے گھر پارک کے سامنے تھے، چھتوں پر پیڈسٹل فین لگائے سو رہے تھے۔ اونچی منڈیروں کی وجہ سے روشنی بھی انہیں پریشان نہیں کر رہی تھی۔ اگر کچھ جاگ بھی رہے تھے تو خاموش تھے کیونکہ ان کے اپنے لڑکے بھی میچ کھیل رہے تھے۔

اچانک ایک کھلاڑی نے چھکا لگانے کے لیے گیند ہوا میں اچھالی۔ ایک لڑکا کیچ کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گیند کو دیکھتے ہوئے دوڑا۔ گیند سیدھی چارپائی کی طرف آئی۔ لڑکا دوڑتے ہوئے چارپائی سے ٹکرا گیا اور کیچ چھوٹ گیا۔

"وے ایہہ کسکی مائی اج سانوں جتن نئیں دے گی" (او یہ عیسائی بڑھیا آج ہمیں جیتنے نہیں دے گی) وہ غصے سے چلایا۔ پھر اس نے طیش میں چارپائی اٹھائی اور پوری قوت سے زمین پر پٹخی۔ کڑاک کی آواز کے ساتھ چارپائی کا تیسرا پایہ ٹوٹ گیا۔ سوزن گھبرا کر باہر نکلی۔ کچھ دیر چارپائی کو دیکھتی رہی۔ پھر اس نے چارپائی اٹھائی۔ ٹوٹا ہوا تیسرا پایہ، جو ادوائن میں الجھا ہوا تھا، اوپر اٹھ کر پھر گر گیا۔ سوزن چارپائی کو کمرے میں لا کر برآمدے میں لے گئی۔ تین پایوں والی چارپائی سے چوتھے پائے کی جانب جھک گیا۔ سوزن پھر باہر گئی اور ٹوٹا ہوا پایہ لے کر اندر آئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ سیدھی برآمدے میں گئی، ٹوٹا ہوا پایہ چارپائی پر رکھا جو کھسک کر ٹوٹے ہوئے پائے کی طرف ڈھلک گیا۔ سوزن نے صحن میں جا کر اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوا بند تھی۔ وہ برآمدے کے ساتھ والے کمرے میں آئی، ایک گدا اٹھایا اور صحن میں بچھی چارپائی پر پھیلا دیا۔ پھر دو تکیے لے کر آئی۔ تکیوں کو اوپر نیچے رکھنے کے بعد وہ کمرے میں گئی جہاں ایرک بیٹھا چھت کو دیکھ رہا تھا۔

"چل باہر صحن میں سوتے ہیں،" اس نے ایرک سے کہا۔ "کچھ تو ٹھنڈک ہوگی۔"

سوزن نے پنکھا بند کر دیا۔ ہاتھ پکڑ کر ایرک کو اٹھایا اور باہر صحن میں لے جانے کے لیے بازو کا سہارا دیا۔ ایرک کو اپنے بدن میں نقاہت کا احساس کئی دنوں سے تھا۔ صحن سے ایک فٹ اونچے برآمدے سے اترتے ہوئے وہ لڑکھڑایا۔ سوزن اسے سنبھال کر صحن میں لے گئی اور بستر پر لٹا دیا۔

"تو کہاں سوئے گی؟" ایرک نے کہا۔ "چارپائی تو لڑکوں نے توڑ دی ہے۔"

"نیچے سو جاؤں گی۔" سوزن اپنے بیٹے کی گدا لے آئی اور فرش پر صحن کی سرخ اینٹوں کے فرش پر بچھا دیا۔ وہ تکیے پر سر رکھے ہی والی تھی کہ گیند پھر آ کر دروازے پر لگی، دھماکا سا ہوا۔ سوزن پھر اٹھی۔ کمرے میں جا کر اس نے پہلے کھڑکی بند کی، پھر دوسرے کمرے میں آ کر پہلے کمرے میں کھلنے والا دروازہ بند کیا، پھر برآمدے اور کمرے کے درمیان کھلنے والا دروازہ بھی بند کر دیا۔

"سو جا۔" سوزن نے ایرک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کب تک ایک ہی بات کہتی رہے گی۔" ایرک کی نحیف سی ہنسی میں کرب تھا۔

"پانی پیے گا؟" سوزن نے صحن میں رکھے مٹی کے گھڑے کی طرف دیکھا۔

"نہیں،" ایرک نے کہا۔ "پیاس نہیں ہے مجھے۔"

ایرک اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ گرم رات میں، ہوا کے ایک جھونکے کے بغیر بھی، اس کے بدن پر پسینہ نہیں تھا۔ سوزن بار بار اپنے دوپٹے سے چہرہ پونچھ رہی تھی۔ دروازوں سے شور اندر آ رہا تھا لیکن مدھم۔ بیرونی دروازے پر گیند اب بھی آ کر لگتی تھی لیکن اس کی آواز میں پہلی سی شدت نہ تھی۔ کچھ دیر بعد سوزن کی گہری سانسوں کی آواز سن کر ایرک نے سر گھما کر اسے دیکھا۔ سوزن پر غنودگی طاری تھی۔ ایرک کے ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

صبح چار بجے، جب بیٹنگ کرنے والے لڑکے جیتنے کے لیے اپنا پورا زور لگا رہے تھے اور ان کا شور پہلے سے کہیں زیادہ تھا، ایرک نے سوزن کی طرف دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ ایرک کو ڈسکہ میں اپنا سکول یاد آیا۔ سکول کے گراؤنڈ میں ہارمونیم پر اپنی سریلی آواز میں گائے ہوئے گیت یاد آئے، چھوٹی چھوٹی نظمیں یاد آئیں۔ اس نے آسمان کی سمت دیکھا۔ صبح کا تارا عمارت کے پیچھے کہیں روپوش تھا۔ ایرک کے احساس میں کہیں پر بھی کوئی چمک نہ تھی۔ اسے ڈسکہ میں اپنے آبائی گھر کی چھت یاد آئی۔ کھیتوں سے آتے ہوئے خنک ہوا کے جھونکے یاد آئے جن میں دھان کی خوشبو رچی ہوا کرتی تھی۔

"جاگ شلدی آ..."

ایرک نے پنجابی زبان کے صوفی شاعر مادھو لال حسین کی کافی کے بول اپنی کمزور سی آواز

Scanned with CamScanner

میں گنگنانے شروع کر دیے۔

"جاگ نہ لدھی آ[3]

کن جندڑے میریے

ہتھو وہانی رات"

(شعور کی بیداری تو تجھے مل نہ پائی... اے میری زندگی سن... پھر بھی مجھے سسکیوں کے ساتھ ہی سہی، تیری اس تاریک رات کو گزارنا تو ہوگا۔)

ایرک بار بار کافی کے بول دہرا رہا تھا، یہاں تک کہ اس کی آواز اکھڑ گئی۔ وہ زور سے کھانسا۔ سوزن نے کروٹ لی۔ ایرک کو دل کے قریب درد کی ٹیس محسوس ہوئی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے چند قطرے نمودار ہوئے۔ پھر اس کا سانس پھول گیا۔ وہ ایک بار پھر زور سے کھانسا۔ سوزن کی آنکھیں کھل گئیں۔ ایرک زور زور سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے پورے بدن میں تشنج سا ابھرا، گھٹنے اوپر کو اٹھ گئے، کندھے گدّے پر دب گئے۔ سوزن اسے ہانپتا دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھی، مٹی کے گھڑے کی طرف دوڑی۔ مٹی ہی کے پیالے میں پانی بھر کے وہ اتنی تیزی سے اٹھی کہ پیالے کا آدھا پانی چھلک گیا۔ ایرک کے دل کی دھڑکن اس قدر تیز تھی کہ قریب آنے پر سوزن کو دھک دھک کی آواز سنائی دی۔

"ایرک... ایرک..." وہ چیخی۔

ایرک کی آنکھیں پوری کھلی تھیں۔ وہ خوفزدہ نگاہوں سے سوزن کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بھیانک خوف تھا۔ اس نے تکیے سے سر اٹھانے کی کوشش کی۔ اس کا بایاں ہاتھ دل کے قریب زور سے دبا ہوا تھا اور دایاں ہاتھ سوزن کی طرف اٹھا ہوا تھا۔ سوزن نے پانی والا پیالہ دائیں ہاتھ میں پکڑ کر بائیں بازو کو ایرک کی گردن کے پیچھے لے جانے کی کوشش کی لیکن ایرک تھوڑا سا اٹھ کر پھر چیخ کر بستر پر گرا، اس کا سر تکیے پر دب گیا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے نرخرے سے خرخر کی آواز

[3] پنجابی زبان میں لفظ جاگ کے دو مفہوم ہیں۔ ایک اثر پذیری اور دوم جاگرتی یعنی شعور کی بیداری۔ پہلا مفہوم حسی ہے۔ جیسے عورتیں رات کے وقت دودھ میں تھوڑا سا دہی ڈال کر صبح دہی بلوتی ہیں۔ دوسرا مفہوم معنویت رکھتا ہے اور اس کا تعلق داخلیت سے ہے۔

Scanned with CamScanner

ابھری جیسے بلغم اس کے حلق میں پھنس گئی ہو، اور دوسرے ہی لمحے اس کا سر ایک سمت ڈھلک گیا۔

سوزن کے ہاتھ سے پیالہ گر گیا۔

وہ کچھ لمحے اسے بے حس و حرکت دیکھتی رہی۔ پھر اس نے دائیں ہاتھ سے ایرک کے نتھنوں پر سانس کا اندازہ لگایا، پھر سینے پر ہاتھ رکھا، پھر نبض دیکھی۔ ایرک کی نبض اس کے دل کی دھڑکن اور سانسوں کی طرح ختم ہو چکی تھی۔

سوزن پر سکتہ طاری تھا۔

ساڑھے پانچ بجے سوزن کے رونے کی آواز سن کر ہمسائی نے چھت سے نیچے جھانکا اور پھر تیز قدموں سے سیڑھیاں اتر کر، گھر کا بیرونی دروازہ کھول کر سوزن کے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ سوزن کی آنکھیں دھندلائی ہوئی تھیں۔ اس نے دروازہ کھولا۔ باہر جیتنے والی ٹیم کے لڑکے بھنگڑا ڈال رہے تھے۔ ہمسائی نے ایرک کے مر جانے کی خبر پر چند رسمی تعزیتی جملے کہے اور پھر ہمدردی کے طور پر ایرک کے بیٹے پیٹر کا فون نمبر مانگا۔ سوزن کچھ دیر اسے دیکھتی رہی، پھر اس نے سیموئیل کا نمبر دے دیا۔ ہمسائے سے دو مردوں نے آ کر ایرک کی چارپائی اٹھائی اور کمرے میں لا کر ایرک کو کندھے اور پیروں سے پکڑ کر پلنگ پر لٹا دیا۔ چارپائی دوبارہ صحن میں چلی گئی۔ ہمسائی کچھ دیر بیٹھنے کے بعد چلی گئی۔ جاتے جاتے وہ پنکھا چلا گئی۔

سات بجے کے قریب، جب سوزن دوپٹے سے سر باندھے، پلنگ کی پائنتی کمرے کے فرش پر بیٹھی تھی، زور سے بیرونی دروازہ کھلا۔ پیٹر بدحواسی کے عالم میں کمرے میں آیا۔ اس کے پیچھے سیموئیل، رانی اور مارگریٹ بھی تھی۔

''کیا ہوا... کیا ہوا بابا کو؟'' پیٹر نے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ سیموئیل، رانی اور مارگریٹ نے بھی تقلید کی۔

''مجھے فون کیوں نہیں کیا... ماں؟''

پیٹر پلنگ کی طرف قدم اٹھانے ہی لگا تھا کہ سوزن نے دایاں ہاتھ بڑھا کر اسے روک دیا۔

''رک جا!'' سوزن نے قہر آلود نگاہوں سے پیٹر کو دیکھا۔ ''یہ کسی لائن مین کے باپ کی میت

نہیں ہے۔ یہ تو ایک غریب، بیمار، بوڑھے سکول ماسٹر کی لاش ہے جس نے برسوں تک خواب کا انتظار کیا ہے… اسے اب تو سونے دے۔"

❀ ❀

Scanned with CamScanner

۶۸

قیمت

۲۶۰ روپے

آج کی کتابیں

۳۱۶ مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ،

صدر، کراچی ۷۴۴۰۰

Scanned with CamScanner